

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ
سینس ڈائجسٹ
ماہنامہ

مارچ 2024

قیمت 200 روپے

ملانی
معراج رسول





مدیر اعلیٰ
عذرار رسول

مدیرہ
یمنی احمد
نائب مدیر
اظہر حسین

مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789



ایک صاحب دانش کے
دانش مندوں کے ہوشیاری



ماضی کا آئینہ - اختیار اور اختیار
تاریخ کے سبب اور عبرت آئینہ و آفتاب



ایسے حربہ و فنون پر تہمتیں کرنا نازل ہونے والے
ایک سرایہ انتقام و جوان کی تیرا گیری داستان



تھانے کی حدود میں محسوس ہونے کی
خاطر داری کا عبرت اثر ماحیرا



سپنس کی مجلس مشاورت و مشاورت کی مجلس
شیریں باہیں گئے گھوڑے اور چنگوس مشورے



چہرے پر مصیبت کا نقاب ڈالنے والی
ایک بد فطرت حسینہ کی کارفرمایاں



چند شکرائے ہوئے بد قسمت
لوگوں کی خوش امید کی کا قصہ



زندگی کے اشتعال میں موت کی سولی پر
لے گئے لوگوں کا حیرت انگیز سفر



گمشدہ جہت کے مدفن پر رونے والے
ایک عاشق کا خطرناک منصوبہ



ایسے ہی وطن کی بنیادوں کو کھوکھلا
کرنے والوں کا عبرت اثر انجام



دل و دماغ کی پاکیزگی کے لیے اللہ
کے ولی کے واقعات اور سوانح



دنیا بھر اور اہل ہرے لطیفہ و حکایت
مسکراہٹیں اور قہقہے سب پھوپھ کیلے



بھائی چچا ننگ لگانے والے
چپ رگلاڑیوں کا ناٹائی انداز



آپ کے ہاتھوں میں ایک شمع ننگ ننگ
آپ کی ہمت آپ کے وقت ہم آہنگ



دلداروں کی بد شہرت پر مبنی
ایک دوشیزہ کا انتقام



دل کے ہر کام میں اگر راستے اور شے ملے
والے عاشق کی بے گل زندگی کی داستان



معاشرتی ماسوڑوں اور زہلوں کی خون ریز سازشوں اور
زہر خرم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلور داستان



بے سمت جستجو میں کو ملنے
والے راہنما کی دل جوئی کا قصہ

پبلشر و پرائنٹر: نیشنل رسول، مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور، 63 فیڈ آلیکس بیننس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹڈیڈیم کراچی

جلد 53، شماره 03 مارچ 2024ء، ذریعہ سالانہ 3000 روپیہ، قیمت فی پرچہ پاکستان 200 روپیہ
خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200، فون: 35895313 (021)، E-mail: jdpdgroup@hotmail.com

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

0524568440	سیالکوٹ 03016215229	کراچی 03002680248
03460397119	میرپور AK 03456892591	لاہور 03004009578
057210003	ایک نئی 03216203640	لکھنؤ 03006301461
03004854922	دیپالپور 03337472654	حیدرآباد 03213060477
03002373988	لیہ 03325465062	سرگودھا 03447475344
03083360600	قصبہ ڈنگہ 03446804050	شیار 03005930230
03008758799	عارف والا 03006946782	گوندہ 03337805247
03023844266	لورالائی 03469616224	فیصل آباد 03006698022
03016299433	کوٹہ ارب علی خان 03347193958	راولپنڈی 03005583938
03338303131	جلاپور پیر والا 03136844650	نواب شاہ 03003223414
03321905703	ہری پور 03346712400	صادق آباد 03007452600
03348761952	چکوال 03336481953	رحیم یار خان 03055872626
03346383400	دہوا 03336320766	بہاولپور 0622730455
0307-6479946	حافظ آباد 03329776400	گوبرنوالہ 03316667828
0301-5497007	واہ کینٹ 03004719056	جہلم 03235777931
0992335847	ایبٹ آباد 03317400678	سیالکوٹ 03008711949
03454678832	پٹوکی 03349738040	جھنگ 0477626420
0333-5021421	مانسہرہ 03348761952	بکھر 03337979701
03004992290	کوٹ رادھا کشن 0301-7681279	منڈی بہاؤ الدین 0331-7619788
0300-6575020	قصور 0333-8604306	ڈسکہ 0300-9463975
0315-6565459	ٹوبہ ٹیک سنگھ 03006969881	حجرہ شاہ منیم 03006969881

جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز

03006969881

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

نشیان کے تین سوال

الثانیہ
جون المیہ

ایک لو جو ان ہے نشیان۔ اسے آپ میں سے ہزاروں لوگ جانتے ہوں گے۔ وہ میرا ہمزاد ہے۔ نشیان لفظ اور معنی میں عجیب ہے اور لفظ اور معنی میں مرتب ہے۔ میں نے اس لو جو ان کو کبھی نہیں دیکھا۔

"خوش نہیں دیکھا؟ جون المیہ! تم نے کیا کہا؟ یہ کہو کہ میں نے اسے ہیڈ لٹس کی یا غلاب روکی کی حالت میں دیکھا۔"

"ہاں، مجھے یہی کہنا چاہیے تھا۔ آج کل سبھی میرے پاس آتے ہوئے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو پوچھا کرتا ہوں کہ جیسے میں اپنے آپ میں آگیا ہوں۔ جناب نشیان ایک خدا داد کمر میں رہتے ہیں ہزاروں ہفتی سے قدرے دور شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کے پاروں طرف کھنڈر ہیں۔ جناب نشیان کو اسے اس "سحرانی گل" کا گرد و چش بہت پسند ہے۔

کھنڈر ہیں۔ جناب نشیان کو اسے اس "سحرانی گل" کا گرد و چش بہت پسند ہے۔ میرے اور نشیان کے درمیان سو، انجیدہ ریش اور دانش مند بزرگ چچا تارخ پانی ہے کہ یہ کھنڈر یونانیوں کے زمانے کی یادگار ہیں۔ میرے اور نشیان کے درمیان سو، انجیدہ ریش اور دانش مند بزرگ چچا ریشتر پلس نے حافظہ میں محفوظ رکھنے کے لیے اکو فرمایا ہے۔ "فرزند و استوکر ماروہ سنی کے مغرب میں مغیلاں کے بیڑوں کے خاتمے پر بہتروں کا سات ہاتھ کا شلت اور کم نور ساجا بھار ہے، وہ دیکھ کر یونانی کی قبر ہے۔"

چچا دیتراکس نے ہمیں اور ہمیں بہت سی باتیں بتائی ہیں جو ہم نے لکھی ہیں۔ گویا معلومات اور کات کا ایک میں بھاخرینہ ہے جو ہم دونوں کو عطا فرمایا گیا ہے۔ ماروہ سنی کے چچا ہے بریر کا بیان ہے کہ چچا کز شطونان کے زمانے میں اکانوے برس کے ہو چکے تھے۔ خدا چچا کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم اور ان کی عاقبت اور شفقت دائم رکھے۔

"تذکرہ اور ہاتھ نشیان کا اس کے یہ دم چھٹا کہاں سے آئے؟" میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔

"دم چھٹا، یعنی چچا دیتراکس کا تذکرہ اور جون المیہ یہ کیا ہے ہودی ہے۔ چچا دیتراکس کا تذکرہ نشیان کے تذکرے کا دم چھٹا ہے! شرم نہیں آئی تمہیں یہ کہتے ہوئے؟ ہمارے میں جاتو اور تمہارا یونانی خدا وخال اور اٹھے ہوئے بالوں والا نشیان۔"

چلو چھوڑو صاف کرو۔ ہمیں کراڑوں سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ چچا کی کیا بات ہے۔ وہ تو سراپا دانش ہیں۔ تو اب نشیان کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس آکر کھڑے ہوتے تو ہم دونوں ایک ہی لمبے پر سوتے ہیں، ایک ہی رکالی میں کھاتے ہیں اور ایک ہی ٹورے میں پیٹے ہیں۔ ہم دونوں کو ایک ہی ساتھ کمرے لگتے ہیں اور پھر شہر والوں سے تھک کر ایک ہی ساتھ کھاتے ہیں۔

اس وقت میں اور نشیان ایک ہی دراشام بھگت رہے ہیں۔ نشیان نے آج کچھ شعر کہے ہیں جن میں سے نین کا مضمون یہ ہے۔

"میرے دل میں شام کا آواز گھبراہٹ ہے۔ پر نہ جانے دجاشیں آج کیا گھبراہٹ؟"

"رات ہم آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ وہ صرف عرض سخن ہی کی مجلس تھی۔ آخر میں یہ بات گھبراہٹ کی گئی کہ چچا کی پٹلی ہی کہا جا چکا ہے۔"

"سب کے راتے جانا جاتے۔ آخر سب کا ایک ہی راستہ گھبراہٹ۔"

میرے ہمزاد نشیان نے نین باتیں کیا ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شام کی اذیت میں جلا ہے، پر نہیں جانتا کہ دوسرے بھی اس کی اس اذیت میں اس کے ساتھ ہیں یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہی ہے کہ جو بات بھی کی جا رہی ہے، وہ پہلے ہی کی جا چکی ہے۔ میری بات جوں نے کہا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم زندگی بھر اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں پر ہمیں زندگی کے آخری لمحے میں اس چالی کا تجربہ ہوتا ہے کہ ہم سب جو الگ الگ ستوں میں چلے جا رہے تھے، آخر کار ہمیں ایک ہی سمت کا رخ کرنا تھا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ آخر میں سبھی میں آنے والی یہ بات اگر شروع ہی میں میں جان لی جائے تو پھر مجھے میں اور اس شخص میں جو میری ہر بات کو غلط جانتا ہے، جھٹکا جھٹکا بانی رہے گا۔ ہم کس بات کے حق میں دلیل دیں گے اور کس بات کے خلاف دلیل دیں گے اور ہاں، اگر ہم سوچنے کی طرح سوچیں تو ہمارے حریف کی دلیل کی طرح بھی ہماری دلیل سے کم مضبوط نہیں ہے اور ہماری دلیل بھی کی طرح ہمارے حریف کی دلیل سے کم مضبوط نہیں۔ اسے عزیز بات ہے کہ سارے جھٹکے عقیدوں، مسلکوں اور مشربوں کے سارے جھٹکے عقیدوں کے باہمی جھٹکے ہیں جو زید اور بکر پیش کرتے ہیں۔ زید بکر کے عقیدوں کو غلط گردانتا ہے اور بکر زید کے عقیدوں کو غلط گردانتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کا عقیدہ دوطرفہ طور پر غلط ہے یا پھر یہ ہے کہ زید کا عقیدہ بھی درست ہے اور بکر کا بھی۔ میرے دوستو! تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ آخر میں میری یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ میں عقیدوں، مسلکوں اور مشربوں کے جھٹکے کو ایک غلط اور غلط گردانتا ہوں۔ زید ہو یا بکر، ان میں سے کوئی بھی عقل و ہوش کی حالت میں یہ کہے کہہ سکتا ہے کہ حقیقت اور صداقت کا سارا سامرا یہی کی جیب میں ہے۔ اگر تم دونوں انکی کوئی بات کہتے ہو تو میں تمہیں "عقیدوں" کی عبارت یاد دلاؤں گا جو ایک مردہ میں نہ عقیدوں کے وقت پڑی جاتی ہے۔

"اے فلاں ابن فلاں! سن اور سمجھ، جب تیرے پاس دو مقرب فرشتے آئیں....."

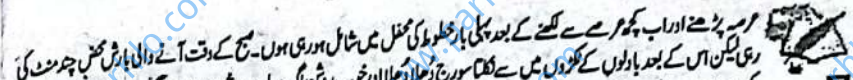
اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہیں تمہارے خدا، تمہارے رسول، تمہارے سچ، تمہارے بھگوان اور تمہارے اوتاروں کی قسم ایتنا ذکر کیا تم زندگی بھر سننے کی طرح سننے اور سمجھنے کی طرح سمجھتے ہو؟ کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے زندگی بھر سننے کی طرح سنا اور سمجھنے کی طرح سمجھا۔ پس اے دوستو! آج مجھے تم سے یہی کہنا تھا اور اپنے ہمزاد نشیان کی یاد دلائی تھی۔ یہ میرے مصلحت نہیں ہے اور میرے کہ خود نشیان مصلحتوں کی ایک مصلحت ہے۔ وہ آئندہ مقام بیان و بلاغ میں قیام کرے گا اور سننے والوں کے مشکوٰۃ دانش سے ہمراہے گا۔

فقہ و پند، شعر، کلامی سے تہرہ کر رہی ہیں۔ "فردوسی کا شمار حسب معمول جلدی لیا گیا۔ پائل پر کسی گاؤں کی حینہ مسکرائی ہوئی براہمن نظر آئے۔ پند کیا۔ فہرست پر سرسری نگاہ ڈالی اور بدھ جوں اسیا کا طوطا گنگرے بھر پور انتائی "سہرا سے سرودھک" بڑھا۔ انہوں نے بیچ فرمایا کہ کسی قدر تھے۔ ہمارے خیر خواہوں کی قدر بے قیاس ہیں، ہم کہیں انسانوں کی اس دنیا میں ہمیشہ علم اور عقل کی اہمیت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ غلطوکی کا محفل میں اس سعادت مہدا لیا بارودی کے جسے میں آئی۔ یتیمان کا شادانہ تہرہ اور کسی کا حق دار تھا۔ اما تہرہ پسند کرنے کا شکر ہے۔ دیگر احباب میں سید علی شافق، سہتا شاہ، ملک وحید، انجم فاروق سہلی کی شرکت بھر پوری۔ جیلانی علی تہرہ ہیش کی طرح خوب رہا۔ دار فہماں کی تحریر "جنگجوئے صف اور دہا کا تیسرا اور آخری حصہ بھی خوب رہا۔ تیور کے بعد خانہ جنگی کی شادانہ اور اسی خان کی باہمی کوششوں سے تیوری سلطنت ہندوستان سے عراق اور دہا پانی گریجی ہر سرحد کو تیور کے مہم حکومت کے برابر نہ پانچا۔ شاہہ جنگجوئے صف فکرن (تیور) دینا کا آخری تھا قیام اور اس کے بعد کوئی اور اس کے زور پر اسکی طاقت حاصل نہ کر پائی۔ فوجی شیر کی "آزادی" کو مقرر تھی۔ شیع اسنادی کی خودداری کو کوشل میڈیا پر تہرہوں سے جس پائی اور ہر مچ چور ہے پر چھوٹا اور اکثر کنگن بابا پر کاچدراج کا موبائل۔ عیون بخاری کی تحریر "خطرہ کا روندہ" "پند آئی۔ چار دوست خزانے کی تلاش میں سرحد کی لڑائی میں کئی اور دو جنگی ہندوؤں سے بچ کر گئے۔ کچھ انسان ہار دہوں سے بچنے کے ارادہ رکھے۔ جنگ کا کیا ہے کہ انسان اگر انسان نہ رہے تو بڑا خطرہ ناک روندہ کوئی نہیں۔ مرزا امجد بیگ کی "فکثیہ" بھی خوب رہی۔ عراق نے منصوبہ کے تحت گل زمان کو چوری کے کس میں پس پند آیا اور جب کی لڑائی منت اور جرح کے باعث سازش کا پردہ فاش ہوا اور اصل ملزم کو قانون نے اپنے جتھے میں لے لیا۔ صاحبہ دانش کی "مہلک میل" "اھو کی پوشیدہ راز" اچھی تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب علی کی "جنگ باز" اچھی جا رہی ہے۔ عاقر شاہین کی "قنب زن" کچھ خاص نہیں کی۔ عاقر شمس خیر "کاز" اچھی گلی فینیا مہلکری کی "سیران سیدنا ہمک" میں ایک عظیم اور مقدس بزرگ کے بے حسرت فرد و اوقات پر پڑنے کوئے۔ اسے تکی تحریر "دکن" بھی خوب رہی۔ کہانی کے آخر میں کالو کے حالات جان کر انکس ہوا۔ شاہد سلطانہ اختر کی "وہی راسے ویں مری طے" کا آخری دست رہا۔ حسن اور کوئی غلطی کا احساس بہت دیر میں ہوا اور شامہ مراد سے دوبارہ رشتہ جوڑنا چاہا لیکن بے سود کہیں کبھی ایک لڑکی غلطی پورے پھر اراغز ہوتی ہے۔ زبردست تحریر تھی۔ محفل شہر و سخن میں تمام اشعار خوب رہے۔ کٹر لوں کا انتخاب بھی اچھا رہا۔"

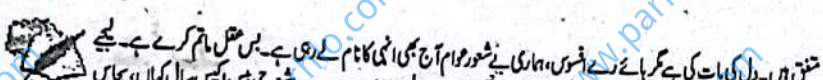
جانبین علی کی ممان سے آمد۔ "معزز قارئین! آجیں، دو اربا انداز میں سسٹن کے تازہ شمارے پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ حسبِ معمول ہر نمبر پر دو انداز میں سویت ڈسکر کا احترام کیا گیا ہے۔ سرورق حسبِ روایت ہے شاعرانہ..... اور بہت ہے، ڈاکٹر انداز و رفتی تحقیق و صرف پورا شمارہ ہے خاص اہم۔ "آپ کے خطوط"، "سلسلہ"، "لذتِ کلمہ" کے نمبر جس میں تمام تہرہ نگار، عرفان، اہدام، جس کے برے اور کے کلامات کی طرح کلمہ میں شامل ہیں یعنی روی بھائی کی آمد پر خوشی ہوئی اور ہر بار ہونی چاہیے، وہیں ان کی سرورق پر کھینچ کر کمال کی تھی

[illegible]

﴿معیوق بخاری کی پہلی خوشوار آمد سادھو پنجاب ہے۔﴾ ”ہلکی ہلکی بارش کے خوبصورت موسم میں خطا کئے کے لیے کاغذ قلم اٹھایا ہے۔ طویل



سید محمد الدین اشفاق، راج پور رہے۔ پہلے آرہے ہیں۔ ”اچھے پسندیدہ درسا لے کر پورا پڑھ چکے ہیں۔ کرسی صدارت پر بیٹھے عبدالباقی رومی انصاری صاحب بہت اچھے لگے۔ احساس کے ساتھ احساس شامل ہونے سے بڑی دلکش اور خوب صورت انہایت ملی سے میں اب جڑے رہے درسا لے اور ہمارے ساتھ رہو دنیا شعر صاحب آپ نے اہل وطن کے لیے جو دعا کی ہے اللہ کرے وہ جلد قبول ہو۔ آمین۔ سیتا شاہ کو بروقت درسا ملے گا میری انتہائی تمیز و تکریم کی بات نہیں، معاصرین و معری ہیں یہی اچھا ہے۔ جب تک اعلیٰ کاغذی نصابی سرگرمیوں میں شریک ہونے کو پسند کرنا بہت پسند آیا۔ درست کہا آپ نے جب تک اعلیٰ کاغذی نصابی یا تفریحی کرنا ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اعتماد، برداشت، حوصلہ، جسمانی صحت اور پوری کا کاغذی نصابی سرگرمیوں کے فوائد ہیں۔ سب کو جانوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے ملک و دنیا اور انکم راج قادی ساعلی سے بھی نصف ملاقات ہوئی۔ داد ساعلی صاحب انشاء اللہ آپ نے قرآن کی آیت کے دو پہلے درس دے دیا ہے۔ کمال آئی ہے۔ مجھے مختصر سے تھوڑے میں ابی دھاک بٹھادی۔ اللہ آپ کو صحت دے تاکہ ہم آپ کا طویل تبرہ پڑھیں۔ آمین۔ اب آتے ہیں کہاؤں کی جانب۔ سب سے پہلے ماہیہ سلطانہ آخر کی ”وہی راتے دہی سرے“ کا آخری حصہ پڑھا۔ حسن آرا کے ساتھ دہی ہوا جن کی وہ حقہ تھی۔ اچھی کہا ملی ہے۔ راسخ صاحب کو مبارکباد کہ غویہ شیر کی ”آواز قل“ سبق دینی تحریر ہے۔ بابر کی خطلی سے ایک خود درخت کو کھار ڈالا۔ ہمیں نوش ملی یا کے استعمال میں ذرا احتیاط کرنا چاہیے۔ جو بات دو کے درمیان ہو، اسے پوری دنیا کے سامنے رکھنا ہرگز دانش مندی نہیں ہے۔ تحریر پڑھ کر شاید کوئی کوئی کو سبق ملے۔ بیوقوف بخاری کی ”خطراتک درندہ“ پڑھی۔ نئے جنگل میں چار درختوں کا سر پٹا کرنا یا درختوں کے بھر پور دعا کہا ملی میں راسخ نے بڑے اچھے انداز میں بتایا ہے کہ اگر انسان اپنی اخلاقی اقتدار ختم کر دے تو اس سے بڑا اور خطرناک درندہ کوئی نہیں ملے۔ وہ جو جنگلی جانوروں، جانوروں اور درندوں، شکاریوں سے بچنے کے لئے اپنے ہی جسم کے ہاتھوں سے نذوق کے طور ”انسان“ کی وحشت و لاج کا شکار ہو گئے۔ ان کے موضوع پر لکھی گئی یہ کہا ملی بہت اچھی گئی، غور کرنا چاہیے ہمیں اپنے آپ پر کہ ہم ایسے نہیں کہ حیوانوں کی حیوانیت بھی کم پڑ جائے۔ حاضر شاہین کی ”نقشب زن“ میں ایک کم ظرف دوست کا انجام پڑھا۔ بڑوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ باقی تمام کہا ملی میں قابل تحریف ہیں۔ ساتھیوں کے لیے دعا گو۔“



قادی نے لفظ لفظ تائین کرکے منسوب قادی کیا ہے۔

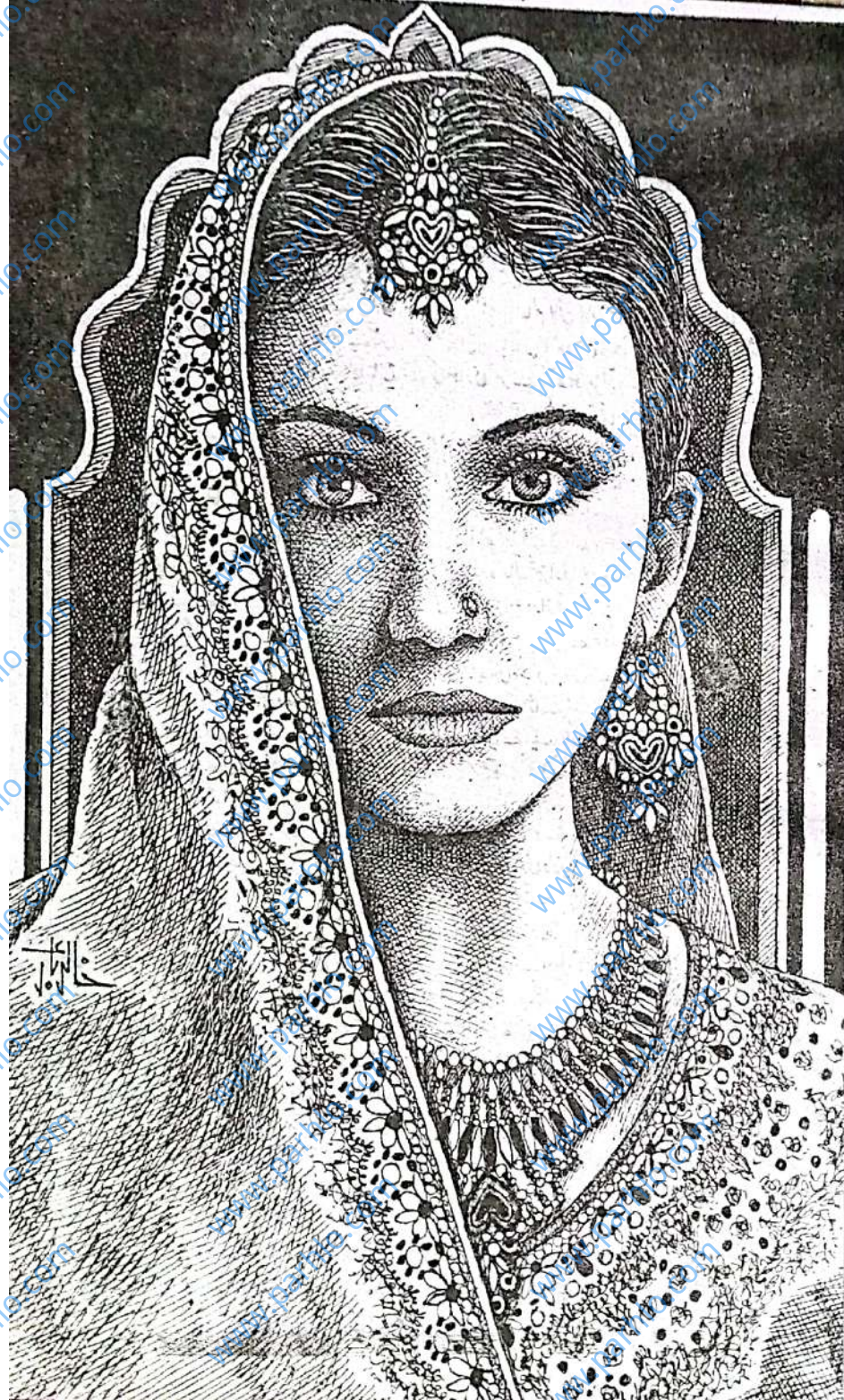
سید شاہ کا خطہ ہزارہی خان ہے۔ "مکی دلوں کی نگہ تار اور شمع کی سردی کے بعد سردی اور سسٹن کی ایک ساتھ آمد نے موزوں خوشگوار کر دیا۔ بائیں ٹھلنے نے بھی شاہی ہمدانی طرح کافی دلوں بعد سردی کی وجہ کا احساس پایا تھا۔ اسی لیے طمانیت بھری کمرہ ٹھلے ہوئے تھی۔ حسب سابق سب سے پہلے جون الیاء کے انتہائی سے مستفید ہوئے اور پھر خطوط کی شکل کی طرف بڑھے جہاں عبدالباقی اردنی الصادری دلچپ و شاعر تیسرے کے ساتھ کسی حدت سنبھالے ہوئے تھے، مہارک بار۔ مکی حالات کے بارے میں کہا کہ اللہ کرے کہ وطن عزیز کو ایک بے لوث اور مخلص قیادت ملے۔ سیدی الدین الشافعی، درویشہ اشعر اور ملک وید کا تیسرا بھی زبردست رہا۔ جینڈی ملے بیشک کی طرح بھڑکنا تیسرے کے ساتھ انٹری دی۔ وی اے فیضی نصابی سرگرمیاں مطالعہ ہوا مکمل، انتہائی ضروری ہیں۔ وقت چھڑا کر رہا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو بڑھانے اور اظہار، دلوں کا موعظ ملتا ہے۔ انجم فاروق، مکی کی اہل قریہ کا کائنات رہے گا۔ تیسرا اچھا تھا۔ اب ذکر کہانیوں کا۔ "آرزوئی" تحریر خوشہ شیر، ایچے موزوں پر لکھی تھی۔ فنیق کے کیے گئے محسوسات کو کنٹرول کر اور اس کی محاشی بحالی کو دوسروں کے سامنے لانے میں یقیناً ہمارا کوئی غلط مقصد نہ تھا مگر شیعہ جو خدا اور انسان اپنے حالات کا بھرم ٹوٹا ہوا داشت نہ کر پایا۔ جیون بخاری کی تحریر "خطرات ناک اردن" دلچپ تحریر تھی۔ ہم جتنی کے شوشین جا اردو دست جنگی جا لوں کا شکار بننے سے توجہ گئے مگر انسانی دروغوں نے ان کا شکار کر لیا۔ سب سے کچھ خوفناک ہونے سے دروغ نہیں بچتا جا، ارادہ خطرناک ہو جا ہے پھر انسان سے بڑا کوئی دروغہ نہیں۔ طاہر شاہین کی تحریر "غیب زنا" بھی شائد آخری تھی۔ ماحول کی گھبراہٹ پر بیان کا پیش میں آ اور درویش دینا تھا مگر زمان جو اردو کر چکا تھا اس سے دو قافلے بنے جا رہا تھا اور پھر جیون تیس سے نہ صرف وہ ایک جرم کرنے سے بچ گیا بلکہ اس کے بھرم کا پتہ کسی اور کے اظہار کٹ گیا۔ اے آر راجپوت کی "دوستان" بہت اچھی تحریر تھی۔ ناند نے اپنی مہنت کی تسکین کے لیے غلط اقدام چاہا لیکن کالوکی اس اوقات نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا جو وہ خود برداشت کر رہا تھا۔ کچھ نئے کو اپنے ماں باپ اور گھر سے دور کیے جانے کا تم کا کالو سے بہتر کو جاننا تھا۔ "شردور" زبردست رہی۔ مہلک مکمل، پوشیدہ و ناز اور تحجب کا دلچپ و شاعر اور اخبار نویس۔ محفل سخن میں تمام انتخاب ہی لا جواب تھے تاہم شیعہ احمد اور درویشہ کے انتخاب بازی لے گئے۔ بانی رسالہ انجمنی زیر مطالعہ ہے۔ دعا ہے کہ خطوط کی شکل میں سے اور پرانے لکھنے والے حریز شامل ہوتے رہیں، آمین۔ سسٹن کرشنہ ماہ (جنوری) پر دست لکھی تو کیا تھا اور پڑھ گیا کیا تھا مگر تیسرے لکھنے کیسے ہوئی تزلزلہ زام نے ایسے سے تیسرے لکھنے نہیں دیا۔ مختصر میں بات سنبھالنا پڑی۔ بیشک کی طرح اس بار بھی شاعر لا جواب تھا۔ سسٹن اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو۔

خانہ طلسمات

اے آر اچریت

آنے والا وقت ہمیشہ کسی طلسم کے مانند ہوتا ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا کہ انسانوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا لیکن... گزرا وقت اپنے حالات اور واقعات کے حوالے سے گزشتہ عہد کے نقش کو دائم کر دیتا ہے... یہ داستان بھی ایک ایسے ہی دور کو واضح کرتی ہے جس میں سلطنت کے رموز اور بادشاہت کے کرداروں کے بھید کچھ الگ ہی داستان بنا رہے ہوتے ہیں۔ محبت کے جذبے کو تسلیم نہ کرنے والی شہزادی کو جب کسی کے خاموش عشق کی انتہا کا علم ہوا تو دل میں پیدا ہونے والی خلش نے اس سے جینے کی خواہش ہی چھین لی... اور ضمیر پر کسی کی محبت کا قرض لے کر جینا اسے بھی گوارا نہ تھا لہذا بہت وقار اور خاموشی کے ساتھ اس نے اپنے چاہنے والے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر اگے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ تو کیا مگر... انتہائی مختلف اور منفرد انداز میں۔

ماشی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



میں زیادہ۔

”وہ تو ظاہر ہے۔ خریٹش نے اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار کر حکومت حاصل کی ہے۔“ کنگھان شاید کچھ آگے بھی کہتا مگر شوریٰ آواز نے ان تینوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب نوجوان ساحر محمد اوس بن وازل نے انہیں مخاطب کیا اور بولا۔

”معزز عالم کوش اور معزز سپہ سالار کنگھان! ان تینوں اور باجوں کا شور اس بات کی علامت ہے کہ بادشاہ کی سواری قصر سے برآمد ہوا جا رہی ہے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے خریٹش بن کنگھان کی سواری برآمد ہوئی۔ دستور کے مطابق کوش نے آگے بڑھ کر نفرہ لگا دیا۔ سپہ سالار فریخ کنگھان نے سلامی دی اور محافظ دے کر اس سواری کو اپنے جلوس میں لے لیا۔

آٹھ گھنٹوں کی اس سواری میں بادشاہ خریٹش کے ساتھ پندرہ سالہ شہزادی حور یا بخت خریٹش بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ مضبوط اور دراز زدقہ، روشن آنکھوں اور ذہین چہرے والی یہ شہزادی دور ہی سے مردانہ دلیری کی مالک نظر آتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے زیورات کا استعمال بہت کم کیا تھا۔ اس کے شانے کشادہ تھے اور بٹنے کے انداز میں دلیری کے بجائے ایک وقار اور مہکتی نظر آتی تھی۔

خریشک ہر نظر اس پر مرکوز تھی۔ اس سواری کے عقب میں دوسری شاہی سواری تھی جس میں بادشاہ کی بیٹی ولایت بنت کوریش تھی۔ بوٹے سے نازک بدن اور خوبصورت چہرے والی شہزادی ولایت عجوبہ روزگار تھی۔ اس کا جھلملاتا لباس اور قیمتی زیورات اس کے بے پناہ حسن میں چار چاند لگا رہے تھے۔ جو دیکتا، دیکتا ہی رہ جاتا اور اس سواری کے ساتھ ساتھ آنے والی تیسری سواری میں بادشاہ کا بیٹیا ابراہم بن اتریب تھا۔

شاہی خاندان کے یہ چار افراد تھے اور ہزاروں کا جلوس تھا جو کنگھان میدان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لوگ ٹولیوں میں بٹ کر باتیں کر رہے تھے اور نئے بادشاہ کے ساتھ ابھرتے سورج کی عبادت کے لیے میدان میں جمع ہو رہے تھے جہاں بادشاہ کو پہلی بار خطاب بھی کرنا تھا۔

☆☆☆
حضرت یوسف علیہ السلام سے پہلے قبیلہ عکرائوں کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ان کی حکومت کا زمانہ بھی بہت طویل گزرا ہے۔ سب سے پہلے انہی لوگوں نے اپنی حکومت اور

خانہ طلمسات

کنوت کے لیے مصر اور اطراف مصر کو پسند کیا تھا۔ قبطیوں کے بارے میں مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ حام بن لوج کی اولاد ہیں۔ یہ قبیلہ بن حام بن کوش سے منسوب کیے جاتے ہیں اور انہوں نے مصر کو مستقل آباد کیا تھا۔ یہاں پر عورتوں ان کی حکومت رہی۔

سب سے پہلے یہاں بنصر بن حام مردار قنچ ہوا جس نے مرتے وقت مرداری اپنے بیٹے مصر بن بنصر کے حوالے کی۔ مصر بن بنصر نے اس علاقے کو یمن، عربی اور اہلیہ و فریہ تک پھیلا یا جس کے باعث یہ تمام علاقے اس کے نام کی نسبت سے ”مصر“ کہلائے۔

مصر بن بنصر نے بڑی طویل عمر پائی اور ہر لمحہ حکومت کی وسعت میں صرف کیا۔ اس کے بعد اس کا فرزند قبط بن مصر بادشاہ بنا، پھر ارشون بن مصر، پھر حاشم۔ یوں کیے بعد دیگرے سب اپنے اپنے طور پر اسے وسعت دیتے رہے۔ اس دوران یہاں کی عکرائی عورتوں کے حصے میں بھی آئی۔ عورتوں کے دور حکومت میں علاقہ بادشاہ سدوم نے حملہ کر کے ان کی حکومت ختم کی۔ اسی زمانے میں شداو بن مدانے مصر کے علاقے پر فوج کشی کی اور قبضہ کر لیا جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے قبطیوں کو بہت بڑی طاقت استعمال کرنا پڑی تھی۔ اس وقت ہر جگہ ان حکومت کو استحکام دے کر نئے علاقے اور شہر آباد کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شہر اتریب، شہر یمن، یمن شمس اور چند دوسرے علاقے آباد ہوئے تو سحر و طلسمات میں عبور رکھنے والوں نے جگہ جگہ جادو کھربانے پھر وقت کے ساتھ ساتھ سلطنت کو ترقی دینے کا مقصد بدل گیا۔

یہ سب کچھ ناموری اور عظمت حاصل کرنے کی خاطر کیا جانے لگا پھر عیش کے لیے عشرت کدے بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ عقیدوں میں بھی فرق آنے لگا۔ جب ساروں کی پرستش کرنے والا بادشاہ کنگھان بن حربیا برسر اقتدار آیا تو عیش و عشرت کے ہوا پر مقصد ختم ہو گیا۔ اس کی غفلت کے سبب تمام اختیارات پر اس کا بھائی ابن حربیا قابض ہو گیا۔ یہ بات اس کے سخت گیر اور عیش پسند بیٹے خریٹش کو پسند نہ آئی تو اس نے ایک دن اپنے باپ کنگھان بن حربیا کو جو نئے میں مد ہوش تھا، قتل کر ڈالا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت اس کام میں اس کا چالاک بیٹیا ابراہم بھی شریک تھا جو اس سے زیادہ اقتدار کا خواہاں، حسن پرست، یکا شرابی اور عیش کوش تھا۔ شہزادی ولایت اسے بھائی جی مگر اس وقت اس کا حال اک بیٹیا ابراہم سے بھی شریک تھا جو اس سے زیادہ اقتدار کا خواہاں، حسن پرست، یکا شرابی اور عیش کوش تھا۔ شہزادی ولایت اسے بھائی جی مگر

اس وقت اس کا حال اک بیٹیا ابراہم سے بھی شریک تھا جو اس سے زیادہ اقتدار کا خواہاں، حسن پرست، یکا شرابی اور عیش کوش تھا۔ شہزادی ولایت اسے بھائی جی مگر

خوشید سحر پسند ہو چکا تھا۔ اس کی زیریں کریم بلبل عمارات اور مقدس طلسم خانے کی بلندی پر غار ہو کر بڑا دل خریب بستر پیش کر رہی تھیں مگر اس وقت لوگ اس کی خوبصورتی سے بے خبر تھے بادشاہ کے دیدار کی دھن میں پلے جا رہے تھے۔

اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو نئے بادشاہ کی تاج پوشی کو ایک تہوار کی طرح مناد رہے تھے مگر اسی جھگڑے میں کچھ سنجیدہ قسم کے لوگ بھی شامل تھے جو بادشاہت کے کئی دور دیکھ چکے تھے اور پرانے بادشاہ کنگھان بن حربیا کو بھولے نہیں تھے جسے موت کے گھاٹ اتار کر نئے بادشاہ نے خود تاج پہنا تھا۔

یہ دوسرے مردار کوش اور کنگھان تھے اور تیسرا فرد کوش کا شاگرد نوجوان ساحر محمد اوس بن وازل ان سے متفق تھا اور خاموشی سے ان کی گفتگوں رہا تھا۔ یوڑھے کوش نے زیر لب کہا۔ ”حکومت ایک اکھاڑا بین گنی ہے۔ نیا پہلوان پرانے پہلوان کو ہچکاڑ کر اپنی فتح کا اعلان کر دیتا ہے اور ہم اس کی برتری کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ آخر یہ کھیل کب تک کھیلا جاتا رہے گا؟“

”ہزاروں لاکھوں افراد اس زندگی سے مطمئن ہیں اور ہم دو کیا کر سکتے ہیں۔ بس، جو کھیل دکھایا جائے، دیکھتے رہو۔“ کنگھان نے جواب میں کہا۔

”ہوں۔“ کوش نے ایک ہکاری بھری اور نیچی آواز میں بولا۔ ”معاملہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم ایک تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور جب ہم ہی کچھ نہیں کر سکتے تو ان ہزاروں سے گلہ کیا؟“

”آپ نے درست فرمایا معزز کوش!“ کنگھان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رقص کر گئی۔ ”آپ ان لاکھوں انسانوں کے مذہبی پیشوا ہیں اور میں فوج کا ایک بڑا عہدیدار۔ ہم بادشاہ کا حکم ماننے کے لیے مجبور ہیں تو بے جا چارے بے بس عوام جن کی اکثریت علم اور قوت کے منعمون سے بھی نا آشنا ہے، کیا کر سکتے ہیں۔ پچھلے کتنے انقلاب میں نے خاموشی سے دیکھے اور آپ نے ٹیکوں بد اعتدالیوں سے نظریں چرا لیں۔ اس کا بھی مطلب ہے کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

”ہوں۔“ کوش نے اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”جو کچھ اب تک ہوتا رہا وہ ناقابل برداشت تھا مگر نیا بادشاہ خریٹش بن کنگھان سب سے زیادہ سفاک اور بے رحم ثابت ہوگا اور اس کا بیٹیا جو ابھی سے اقتدار کا طلبگار ہے، وہ اس سے

اپنی قوت کا صحیح استعمال کرو اور خود کو صالح مت کرو ورنہ وقت تمہیں بھی معاف نہیں کرے گا۔“

معزز کوش کی تقریر مختصر مگر جامع اور صداقت سے بھرپور تھی۔ اس کا ہر لفظ سنا سننے کے دل میں اتر گیا تھا۔ لہذا دیر تک تالیوں کا ہم جج ابرہہ تارہا پھر بادشاہ غریب نے تقریر کے لیے اٹھنا چاہا تو شور کا انداز بدل گیا۔

اس کے چاہنے والے اٹھ اٹھ کر نعرے لگانے لگے۔ چند لمبے لمبے نعرے کی نذر ہوئے۔ جب غریب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا تو خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھنے لگے یہاں تک کہ سکوت چھا گیا۔ تب اس نے کہا۔

”عظیم حام بن فوج کے فرزند! جو کچھ معزز کوش نے فرمایا، تم سب نے سنا۔ مقدس دیوتا کی قسم! اس سے بڑی فصاحت کوئی انسان کی انسان کو نہیں کر سکتا۔ ہم دیوتاؤں کے شکر گزار ہیں کہ ان کی عنایت سے کوش جیسا عظیم اور معزز انسان ہم میں موجود ہے۔ ان کے ہندو نصائح کے بعد ہمارے پاس تیار رہے لیے کوئی فصاحت نہیں ہے۔ جو اس کے کرتم ان کے علم سے فیض حاصل کرو۔ ہم اپنی طرف سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں نہ حکومت کا شوق ہے نہ ہم اقتدار کے بھوکے ہیں۔ ہم صرف دروازے حاکموں کی غفلت دیکھ رہے تھے۔ صرف تم لوگوں کی بھلائی کے لیے سخت دتاج سنبھالنے پر مجبور ہوئے۔ اب ہم تمہیں یہ بتانے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ ہم نہ عیش کو برداشت کریں گے نہ وقت کا زیاں چاہیں گے بلکہ ہم مسلسل اپنے علاقے کو وسعت دیں گے اور فوج کو مضبوط بنائیں گے۔ اس کام میں تم بھی ہمارا ساتھ دو اور نتیجتی کے ساتھ ایک دوسرے کی بھلائی کی کوشش کرو۔“

یہ تقریر سن کر مجھے میں نعرہ ہائے تحسین کا شور بلند ہوا۔ ان کے ڈھونڈنے بھی بادشاہ کی اس بات کو قبول کیا۔ غریب بن حریبانے اطمینان سے ان سب کو دیکھا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے بولا۔

”اب میں چند خدمات مناسب افراد کے سپرد کرتا چاہتا ہوں۔ جو لوگ جس عہدے پر فائز ہیں، وہ بدستور بحال رہیں گے۔ ان کے علاوہ میں نوجوان معدائوں بن دازل کو طلسم خانے کا داروغہ مقرر کرتا ہوں اور ان کے سحر اور علم نجوم سے فوج کرتا ہوں کہ وہ مقدس طلسم خانے میں رہ کر اہل مکر و مستطیل میں پیش آنے والے شر و فساد سے بچانے کی تدابیر کریں کیونکہ وہ ایسا سحر جانتے ہیں جن سے بے جان مجسموں اور تصویروں میں جان ڈال کر مستقبل کے

بارے میں وہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔“

اس عنایت پر نوجوان چادوگر معدائوں کھڑا ہوا اور جھک کر بادشاہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

”عالی قدر بادشاہ! غلام اپنا فرض پوری ذمہ داری سے ادا کرنے اور وفادار رہنے کا عہد کرتا ہے۔“

سب نے دیکھا، بڑی بڑی ذہانت سے پر آنکھوں والا یہ جوان پیشانی پر سیاہ رومال باندھے، کانوں میں سونے کی بالیاں پہنے دور ہی سے علم سحر کا باہر نظر آ رہا تھا۔ اس کا قد دروازے چہرہ خوبصورت اور لب و لہجے نے پختگی اور اعتبار عیاں تھا۔

اس وقت بڑے بڑے معرجمی نوجوان ساحر کے داروغہ بن جانے کو اپنی توہین محسوس کر رہے تھے مگر سب جانتے تھے کہ معدائوں نے اپنا ہر لمحہ عظیم کوش کی محبت میں دھکر علم حاصل کیا ہے اور ایسا ستر ایجاد کر چکا ہے جو بے جان مجسموں میں جان ڈال دیتا ہے لہذا وہ اس عزت کا مستحق تھا۔ معدائوں شکر یہ ادا کر کے بیٹھا تو بادشاہ نے کہا۔

”اب ہم نوجوان اطمینان بن ولید کو بیرونی علاقوں میں پیغام بری کا ذمہ دار بناتے ہیں۔ پہلے یہ خدمت معزز ولید بن داریم انجام دیتے تھے اور جس خوبصورتی سے برسوں انہوں نے یہ فرض ادا کیا، ہم سب اس کے معترف ہیں مگر اب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کی کی اب اطمینان بن ولید ہی پوری کر سکتا ہے۔“

اس اعلان کے ساتھ ہی مجھے نے دیکھا کہ دروازے بالوں والا ایک نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں سمندروں جیسی گہرائی و گیرائی پائی جاتی تھی اور چہرے پر چٹانوں جیسی سختی تھی۔ اس نوجوان نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ اسے مارا کبا دے رہے تھے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ بادشاہ غریب نے ایک اور اعلان کیا۔

”اب ہم اپنے برادر زادے ابراس بن اتریب کے بارے میں وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی ولیری کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم انہیں شاہی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کرتے ہیں۔“

اس وقت مجھے میں ہے اکثریت نے کنعان کی طرف دیکھا جڑو جگ کا اٹلی اٹھ اور برسوں سے اس خدمت پر مامور تھا۔ آج بادشاہ نے اسے معزول تو نہیں کیا تھا مگر نوجوان ابراس کو شاہی فوج کا افسر اعلیٰ بنا کر اس پر فوجیت ضرور دے دی تھی لیکن لوگوں کی توقع کے برخلاف کنعان کے رخ پر نہ تو حیرت مٹی اور نہ ہی ناپسندیدگی۔

وہ بڑے سکون سے اپنی نشست پر بیٹھا ہوا بادشاہ کے احکامات سن رہا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے چند لوگوں کو ان کی بہترین کارکردگی پر ترقی اور انعامات سے نوازا اور کچھ کو بھی ہدایات دیں۔ اس کے معزول ہونے پر بعد جمع جس جوش و خروش سے منع ہوا تھا، اسی طرح آج کی تقریب پر اظہار خیال کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

اس شب ابراس بن اتریب کی خاص نشست گاہ میں اس کا مصاحب اطمینان بن ولید بادشاہ کی عنایت کو سراہتے ہوئے جو گفتگو تھا۔ اس نے بیچ عام میں تو بس بادشاہ کا شکریہ ادا کیا تھا مگر اس وقت باقاعدہ وفاداری کا عہد کرتے ہوئے ابراس بن اتریب سے کہہ رہا تھا۔

”شہزادہ عالی! میں عرصے سے آپ کا مصاحب ہوں اور اب یہ عظیم عہدہ ملنے کے بعد عہد کرتا ہوں کہ تاحیات وفاداری سے منہ نہیں موڑوں گا۔“

ان الفاظ پر ابراس مگر ادا پھر مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”آج معدائوں ہمارے ساتھ نہیں آیا جبکہ عموماً وہ ہمارے ساتھ رہتا تھا۔“

ایمین نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

ضرورت سے تاکہ خود فکر اور مطالعہ کر کے پھر بھی اسے آپ کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا اور۔۔۔۔۔“

ابراہم نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔ ”نخواہ میں معدائوں جیسے علم دوست اور صاحب عمل دوست کو چھوڑنا ہی کیوں نہ پڑے مگر ہم اپنی محنتوں کو نکالیں چھوڑ سکتے۔“

اس پہلے پر ایمین ہنس دیا اور بولا۔ ”اور ایمین بن ولید آپ سے وفاداری کا عہد کر چکا ہے۔ وہ ہر محفل اور ہر حالت میں حضور کا ساتھ دے گا۔“ ابراس یہ بات سن کر ہنس دیا اور وفاداری کے انداز میں بولا۔

”مگر وفادار رہنے کا عہد کرتے ہو تو پھر کچھ کر کے دکھاؤ۔ تم نے کہا تھا کہ کنعان کی فوج کا سپہ سالار جیرون دور دراز کے مال کی خبر رکھتا ہے۔“

”شہزادے! ایمین نے ادب سے کہا۔ ”غلام کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ اس عہدے کا کچھ تو فائدہ حاصل کرنا چاہیے اور اس کا بڑا فائدہ یہی ہوگا کہ دور دراز کے علاقوں کا ہی نہیں، دور دور کے ملکوں کا مال بھی آپ کو ملے گا۔ آپ مطمئن رہیے۔ جیرون اس کام کا ماہر ہے۔“

ادھر ایک مصاحب شہزادے سے عہد و قاپانہ رہا تھا اور دور بہت دور دوسرا مصاحب طلسم خانے کی وجوہ روزگار عمارت میں بیٹھ کر ہزاروں مجسموں اور صورتوں کی موجودگی کے باوجود ایک صورت کے تصور میں تھا۔

یہ تھا معدائوں بن دازل جو چشم تصور سے شہزادی جو ریا کو دیکھتے ہوئے کچھ عجیب بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ مردانہ عزم و ہمت کی مالک خوبصورت شہزادی ایک لمحے، ایک ساعت میں اس کی سب کچھ ہوئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ عشق بھی ہوا تو کس سے جس سے اظہار بھی ممکن نہیں۔ کہاں اس طلسم خانے کا داروغہ اور کہاں ایک شہزادی، بادشاہ کی انوکھی بیٹی، تخت دتاج کی مالک جو ریا بخت غریب جو محبت کے جذبے پر یقین ہی نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

اس ماحول میں دوستیاں ایسی بھی تھیں جو وقت کے گھیرے
مڑھ لیتیں۔ لیور این خوش نوا کے تھے سنا اور انکس خوشی عطا
کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ سب ہم عمر، ہم ذوق شہزادیاں جو چٹاڑا نہیں کم اور
دوست زیادہ تھیں۔ شہزادی حور یا اور شہزادی ولایتیہ..... ایک
کھری اور صاف گو دل اور جرأت مند لڑکی۔ دوسری شاعرانہ
مزاج اور دھیمے لہجے میں بولنے والی بھی دوست تھی۔
غرضیکہ دونوں شہزادیاں مختلف فطرت رکھنے والی تھیں
بھی آپس میں بہترین دوست تھیں۔ دونوں عموماً سرخیز
سے لطف اندوز ہونے جن میں آجاتی تھیں لیکن آج صرف
ولایتیہ ہی چہل قدمی میں مصروف نظر آ رہی تھی۔
وہ جن کے دوسرے گوشے کی طرف بڑھی اور پلٹ
آئی۔ یہ انداز انتظار کی غمازی کر رہا تھا۔ اسے انتظار تھا
شہزادی حور یا کا مروت گزرتا رہا اور وہ نہ آئی۔

اس وقت ولایتیہ کا مختصر لباس اور درمیانہ قد مع
لباس میں بڑا عجب نظر لگ رہا تھا۔ دروازہ کھولتے پر پہلے
ہوئے تھے، معج کی تازگی سن کی رعنائیوں میں اضافہ کر رہی
تھی۔ وہ حور یا کے نہ آنے کی جلاہٹ سے بچنے کے لیے
کچھ شکستکاری بولی بھل رہی تھی۔

اب معج کی روشنی پھیلنے لگی تھی اور شاہی محل کی عمارت
صاف نظر آنے لگیں۔ اس محل کے ساتھ ہی دوسرا محل شہزادہ
ابراہیم بن اتریب کا تھا۔ ان دونوں کے بھی جن یوں لے
تھے کہ درمیان باڑہ ہٹا کر محل کے مکن دوسری طرف جاسکتے
تھے۔ اکثر رات کو وہ اسی طرح شہزادہ ابراہیم سے ملنے
جاتی تھی لیکن معج چونکہ شہزادی حور یا کے ساتھ ہوتی اس لیے
وہ ابراہیم کے محل میں مقیم نہیں سے نہ جاتی تھی۔ ویسے بھی
ابراہیم دیر تک سونے کا عادی تھا لہذا معج کے وقت ملاقات
ممکن نہ تھی۔

اس وقت وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس
کے سرخ پردہ مدم مسکراہٹ اور ابراہیم کے محل کی جانب
دیکھ کر کچھ سوچنا ان جذبات کی غمازی کر رہے تھے جو اس
کے دل میں شہزادے کے لیے تھے۔ انہی جذبات سے
مطلوب وہ ٹپٹے ٹپٹے روش کے اس کنارے پر پہنچی جہر
شہزادے کے محل کے چن کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ موڑ پر
پہنچ کر وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوئی۔ اسے کسی کی موجودگی کے
احساس نے چونکا دیا۔ اچانک ہی شہزادہ ابراہیم اس کے
سامنے آ گیا اور اسے دیکھتے ہی ہلکھلا کر ہنس پڑا۔
”کیسی رہی؟“

”کیا کہ آپ ہمیں ڈرانا چاہتے تھے؟“ شہزادی
ولایتیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”نہیں۔“ ابراہیم بر جستہ بولا۔ ”ہم ایسی کسٹافی تو
نہیں کر سکتے۔ بس ذرا شہزادی کی ہمت آزار ہے تھے۔“
”تو اس آزار میں آپ نے ہمیں کیا پایا؟“
ولایتیہ نے جلدی سے پوچھا۔
”جو ہم چاہتے ہیں، آپ وہی ثابت ہوئیں۔“
شہزادہ ابراہیم بولا۔ ”یعنی کہ ٹھوڑا دوڑانے اور کھوار
چلانے والی شہزادی کسی کی نرم و نازک لڑکی کی طرح ہم بھی
جائے اور ہم اسے یوں چٹالیں۔“ کہتے کہتے ابراہیم نے
اس کے مختصر سے دجھو کو انہوں میں کس لیا اور دھوٹ گئی۔
چند لمے اسی بے خودی کی نذر ہو گئے پھر ولایتیہ اس کی گرفت
سے نکلے ہوئے بولی۔
”آج اتنی معج کیسے بیدار ہو گئے؟“
”آج ہمیں الہام ہوا تھا کہ آفتاب پر کوئی بادل نہیں
نہ لہذا ہم طلوع آفتاب کا ماحول دیکھنے نکل آئے۔“
شہزادی ولایتیہ جھنجھکی مٹی اور بولی۔ ”واقعی آپ
گفتار کے بھی غمازی ہیں مگر یہ بتائیے کہ آفتاب پر بادل سے
کیا مراد ہے؟“
”آپ اغماض نہ رہتے۔“ ابراہیم بولا۔ ”جب بھی
آپ جن میں آتی ہیں، شہزادی حور یا آپ کے ساتھ ہوتی
ہیں۔ ایسے میں ہم بے تکلفانہ نہیں مل سکتے۔“
”کیوں؟“ ولایتیہ نے کہا۔ ”وہ کوئی معرکہ نہیں۔
ہماری ہم عمر ہیں اور پھر علم و دانش اور برجستہ گوئی میں بھی ہم
سے بڑھ کر ہیں۔ ان میں اور ہم میں ایک ہی تو فرق ہے کہ
وہ بادشاہ کی دختر تاج و تخت کی وارث ہیں لیکن وہ تو بعد کی
بات ہے اس وقت تو.....“
مگر ولایتیہ کی بات مکمل نہ ہو پائی کیونکہ اس وقت
شہزادہ ابراہیم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نہ جانے اشتعال سے یا
حسد سے۔ چند لمے وہ خود کو سنبھالتا رہا پھر بولا۔
”شہزادی ولایتیہ! کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم ملکہ بنو
اور میں تاج و تخت کا حق دار؟“
”اس کے بغیر ہم مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔“
ولایتیہ نے کہا۔ ”میرے لیے ملکہ بننے سے زیادہ خوشی کی
بات یہ ہے کہ آپ میرے ہیں۔“
”ادھو۔“ ابراہیم اس کی بات سن کر جھنجھلا گیا اور
بولا۔ ”تم محبت کی اس قدر دیوانی کیوں ہو آؤ؟ اس کے
علاوہ بھی تو زندگی میں بہت کچھ ہے۔ کیا تمہارے خیال میں

خانہ طلسمات

تاج و تخت کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟“
”میں تو اسے کچھ سمجھتی ہی نہیں، ندان امور میں حصہ لینا
چاہتی ہوں۔“ ولایتیہ نے مصوبیت سے جواب دیا۔ تب ہی
شہزادہ ابراہیم کے سرخ برنگ گاری آگئی۔ اسی لمحے میں بولا۔
”شہزادی ولایتیہ! میں تاج و تخت حاصل کروں گا اور
تم ملکہ بنو گی لہذا خود کو ابھی سے اس انداز میں ڈھالنا شروع
کر دو۔“
”مگر تخت کی وارث تو.....“
”تخت کی وارث حور یا بنت خریش ہے۔ اتنا ہی حق
دار ابراہیم بن اتریب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرا
باپ میرے بچپن میں ہی مر گیا اور شہزادی حور یا بنت خریش
کا باپ زندہ ہے اور بادشاہ ہے۔“ ابراہیم نے فیصلہ کن
انداز میں کہا تو ولایتیہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
اس کے دل کی بات اسے آج معلوم ہوئی تھی۔ چند
لمے وہ تجب سے دیکھتی رہی۔ غالباً ابراہیم بھی اس بدلتی ہوئی
سوچ کو بھانپ گیا اور جلدی سے بات بتاتے ہوئے بولا۔
”ولایتیہ! اپنا حق حاصل کرنے کا اختیار ہمیں بھی
ہے۔ تم ہمیں صرف گفتار کا غمازی سمجھتی ہو، اس کے علاوہ بھی
کچھ جانتی ہو؟“
ولایتیہ نے اطمینان سے اسے دیکھا۔ اپنے سینے میں
پیدا ہونے والے بے شمار شگفتہ کدو پایا اور بولی۔
”تمام لوگ یہی کہتے ہیں کہ آپ پیش پسند اور جلیبی
شہزادے ہیں۔“
”پیش و عشرت تو سب ہی حکمران کرتے ہیں۔“
شہزادے نے اسے ایک بار پھر ہانپوں میں کس لیا اور بولا
رہا۔ ”مختلین وقت گزارنے کے لیے ہی تو جاتے ہیں۔ جس
دن ولایتیہ اور مصر کی حکومت ہمیں مل جائے گی، ہم سب کچھ
چھوڑ دیں گے۔“
پھر دیر تک وہ گم رہے۔ معج کی روشنی پھیلنے لگی تو انہیں
ہوش آیا تب ہی ولایتیہ بولی۔
”اب ہمیں جانے دیجیے۔ کنیزیں ہمیں تلاش کرتی
ہوئی ادھر آئیں تو کیا کہیں گی۔“
”کہیں گی کہ مستقبل کے شاہ اور ملکہ محبت کر رہے
ہیں۔“ ابراہیم نے مذاق کیا تو ولایتیہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔
اس کا ذہن شہزادی حور یا بنت خریش کے تصور سے پاک تھا
اور اس دوپہر شہزادی حور یا بنت خریش کی محبت میں پڑنے کر
تھوڑی دیر کے لیے بالکل ہی اس خیال کو فراموش کر بیٹھی۔
جب ہی شہزادی حور یا نے کہا۔

”آج ہم بہت دیر سے بیدار ہوئے اور صبح کی سیر
میں تمہارا ساتھ نہ دے سکے۔“
”ہوں..... ہم دیر تک جن میں آپ کا انتظار کرتے
رہے۔“ ولایتیہ نے کہا۔ ”پھر شہزادہ ابراہیم آ گئے۔“
”ادھو۔“ حور یا مذاق کے انداز میں ہنس دی۔ ”پھر
اجھای ہوا کہ ہم تمہارے ساتھ نہ تھے۔ سنا ہے دو محبت
کرنے والے کسی تیسرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔“
اس لمحے ولایتیہ کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ حور یا نے اسے
تجب سے دیکھا اور سوچا۔ محبت پر ایمان لے آنے والی
لڑکیاں کس قدر سادہ لوح ہوتی ہیں۔
ولایتیہ نے دھڑکے سے کہا۔
”آپ محبت پر یقین نہیں رکھتیں جب ہی تو ایسا
سوچتی ہیں ورنہ یقین مانے محبت کرنے والے بہت بڑے
دل کے مالک ہوتے ہیں۔“
یہ سنتے ہی حور یا شرارت پر اتر آئی اور بولی۔
”ولایتیہ! کیا تم بہت بڑے دل کی مالک ہو؟“
”بھی آزار دہیں۔“ ولایتیہ نے برجستہ کہا۔
”ہم تو تمہیں جانتے ہیں مگر تم سے کوئی اگر شہزادہ
ابراہیم کو مانگے تو تم شگفتہ کا مظاہرہ کرو گی؟“
ولایتیہ چونک گئی پھر دھڑکے سے بولی۔ ”یہ تو ہم نے
سوچا بھی نہیں تھا۔“
حور یا قہقہہ مار کر ہنسی اور بولی۔ ”اپنی سب سے بڑی
دولت کو دینے کے بارے میں بھی سوچا بھی نہیں جاتا اور
بڑے دل کی مالک بن رہی ہو۔ اچھا ذرا سوچ کر دیکھو کہ
شہزادہ ابراہیم کی اور کدو سے کتنی ہو؟“
”آپ محبت کیجئے تو جان جائیں گی کہ غور سے جس مرد
سے محبت کرتی ہے، اسے کسی اور کے پر نہیں کر سکتی۔“
”ہم محبت کے قائل ہی نہیں۔“ شہزادی حور یا
مسکرا دی۔ ”اور یاد رکھنا، محبت کا دوسرا نام غرض ہے۔
انسان کو جب بھی محبوب سے زیادہ فائدہ مند اور بہتر کسی نظر
آ جاتی ہے تو محبت کے دھوکے کھانے والا یہ انسان اپنی سوچ
کا مرکز بدلنے میں ذرا بھی دیر نہیں کرتا۔“
ولایتیہ نے یہ بات بہت غور سے سنی اور جیسے فیصلہ کن
انداز میں بولی۔
”میں تو دنیا کی تمام چیزیں دے کر بھی شہزادہ ابراہیم
کو کسی اور کے خواہنے نہ کروں۔“ یہ کہتے کہتے اس کی حالت
کیا ہوئی، اس کا اندازہ کرنے میں حور یا کو مطمئن دیر نہ لگی۔
اس نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔

دووں شہزادیوں کو شاہی محافظ اور خدمت گارہی ظلم خانے کی عمارت کی طرف لے جا رہے تھے جس کے دروازے پر سیاہ لباس میں لمبے چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کا ہار پہنے ہوئے جوان ساحر معداؤس کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ استقبال کے لیے چند قدم آگے بڑھا اور سر کو قدرے جھکا کر بولا۔

”غلام معزز شہزادیوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔“

اس کے جواب میں شہزادی حور یا اور شہزادی دلچیت نے خوشی کا اظہار کیا اور بولیں۔

”ہم عظیم منتر کے موجد اور مصر کے مایہ ناز ساحر کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔“

اس وقت معداؤس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے نظر اٹھا کر شہزادی حور یا کو دیکھا۔ اس کے حسین چہرے پر جرات اور دلیری کی چھاپ نظر آرہی تھی۔ شہزادی ہوتے ہوئے بھی اس نے معمولی سا زیور استعمال کیا تھا۔ معداؤس نے سوچا یہ ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک ہے۔ جب ہی نہ جانے پاس ادب یا رعب حسن سے اس نے نظریں جھکا لیں۔ اسی وقت شہزادی دلچیت نے اسے دیکھا اور بولی۔

”معزز معداؤس! اس غائب گھر کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں گے؟“

”کیا عزت اب شہزادیوں نے پہلی بار ظلم خانے کو عزت بخشی ہے؟“ معداؤس نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ شہزادی حور یا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں۔“

”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ حضور اس سرخانے میں تشریف لائیں۔“ معداؤس نے کہا۔ ”تشریف لائیں۔ غلام آپ کو ایک ایک چیز دکھائے گا۔“

شہزادی نے دیکھا کہ اس سے چند قدم ہٹ کر چلنے والے ساحر کا چہرہ سیاہ لباس میں بہت دلربا اور جاذب نظر لگ رہا تھا۔ اگرچہ ساحروں کے مخصوص سیاہ لباس کے علاوہ کالوں میں بالیاں اور گلے میں کھوپڑیوں کا ہار پہنے ہوئے تھا مگر مصر میں کوئی جادوگر اتنا خوبصورت نہ تھا جتنا کہ معداؤس۔

شہزادی حور یا نے اس دن بھی اسے تعریفی انداز میں دیکھا تھا اور آج بھی وہ یہی بات محسوس کر رہی تھی۔ اسی وقت معداؤس نے ادب سے کہا۔

”عزت مآب شہزادی! یہ بلند عمارت جو باہر سے ایک گنبد نظر آتی ہے، ابتدا میں ایک طویل و درمیان ہال تھا جہاں بیٹھ کر مصر کے پرانے ماہرین تحریمی جادو کے تجربات

بادشاہ خرطیش نے پیچھے کی جانب دیکھا اور فرسے بولا۔

”مابدولت نے مصر کی بہترین رقاصاؤں کو محض تمہارے لیے طلب کیا ہے اور نہ تم جانتے ہو کہ مابدولت عیش و عشرت پسند نہیں کرتے۔“

”عالی جاہ! امینین نے خوشامد اور چالپنی کے انداز میں کہا۔ ”انتہائی ذوق حضور کے سوا بھلا کس کا ہو سکتا ہے؟“

اور یہ گفتگو جاری تھی اور در قاصد تاج رہی تھی۔ وہ ہر امیر کے سامنے یوں بجاتی جیسے یہ جام اسی کے لیے ہے مگر جب وہ جام کی طرف ہاتھ بڑھانا، رقصہ سیدھی ہو کر دوسرے کی طرف بڑھ جاتی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ لہریز جام و زبریا بھی نہ جھلکتا تھا۔ دوسری ناچنے والیاں اس رقصہ کو حد درجہ رشک کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں کیونکہ کسی کی توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ سب ہی اس بجلی کو دیکھ رہے تھے۔

اس وقت بادشاہ خرطیش کے لیوں پر متنی خیز قسم اور نظروں میں ایک خاص تحریر تھی اور شاید رقصہ نہ بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔

اب یوں رقصہ نہ بھی رقص میں اور تیزی کے ساتھ چابکدستی پیدا کی اور بادشاہ کی طرف بڑھی تو وہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا۔ پھر جو نبی رقصہ اپنے مخصوص انداز میں اس کے روبرو کھی، بادشاہ نے جام کو شرف قبولیت بخشنے کے بجائے رقصہ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا پھر پیچھے دیوانہ ہو گیا اور چلا یا۔

”تخلیہ... تخلیہ...“

یہ سنتے ہی امراء و درو سا تیزی سے باہر نکلنے لگے۔ ناچنے والیاں ہال کے دروازوں کی طرف دوڑیں۔ سازندوں نے اپنے ساز اٹھائے اور شہزادہ ابراس بھی اپنے مصاحبوں کے جہازے لڑکھڑاتے قدموں سے ہال سے نکل گیا۔

بالائی منزل کے ایک تاریک کمرے میں پردے کے پیچھے بھی شہزادیوں نے اگلیاں دانتوں میں دبائیں۔ یہ وہی منظر تھا جسے دیکھ کر بادشاہ خرطیش نے اپنے باپ کنگی بن حربا کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دووں شہزادیوں نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی سے ہٹ گئیں۔

☆☆☆

اس ظلم خانے میں ہر دور کے مصر کا سب سے بڑا ساحر اور کسی بہترین منتر کی ایجاد کا مالک داروغہ مقرر کیا جاتا تھا۔ وسط شہر میں جادو کا گھر واقعی عجوبہ روزگار تھا۔ دور سے یہ ایک گنبد نظر آتا تھا۔ اس کے چاروں جانب گولائی میں بلند اور کشادہ بیڑھیاں تھیں جو دور سے بے حد خوشنما نظر آتی تھیں۔

کے سے اعزاز میں بولی۔ ”محفل رقص و سرود۔ سنا ہے آج شب یہ محفل گرم ہوگی۔“

”مگر آپ اسے کہاں سے دیکھیں گے؟“ دلچیت نے تعجب سے پوچھا۔ ”شاہی خاندان کی عورتوں کو محفلوں کی اس محفل میں شرکت کرنے کی اجازت کب ہے؟“

”بالائی منزل کے ان کمروں سے جن کی بلند کھڑکیاں نیچے ہال میں کھلتی ہیں۔“ حور یا نے متنی خیز اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

☆☆☆

یوں اسی شب بادشاہ خرطیش طویل و درمیان ہال میں حبشیان مصر کے درمیان بیٹھا شراب کے نشے میں شاب کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس محفل میں شہزادہ ابراس بھی موجود تھا اور امینین بھی، بادشاہ کے مصاحب بھی تھے اور شہزادے کے خوشامد می صاحب بھی اور یہ سب مبالغہ آمیز تعریف کر کے بادشاہ کے لٹس کو اور بڑھا رہے تھے۔

عیش و عشرت کے لیے مختص اس ہال کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بالائی منزل میں چاروں طرف کے کمروں کی اونچی کھڑکیاں اسی ہال میں کھلتی تھیں اور جب یہ سب کھول دی جاتیں تو اس ہال کی گنجائش چوٹی نظر آتی۔ یہاں ہر بادشاہ محفل عیش و طرب ہی منعقد کرتا تھا اور اس زمانے میں شاہی خاندان کی خواتین کے لیے ان محفلوں میں شرکت پر پابندی تھی کیونکہ یہی وہ جگہ ہوتی تھی جہاں باپ بیٹے، چچا بیٹھے اور بھائی بھائی دوستوں اور مردوں کو فراموش کر دیتے تھے۔

اس وقت مصر کی بہترین رقاصا میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور مصر کے یہ معزین اپنی بیہوشیت، اپنے مذہب اور مردوں کو بھلا کر محفل میں شریک تھے۔ ان کی بھوکی اور غلی نظریں رقاصاؤں کے جسموں کو ٹٹول رہی تھیں۔ مگر دوس کی آواز، واہ واہ کا شور اور ہانپے ہانپے کی صدا میں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں اور ہال کی روشنیوں کے طوفان میں یہ رقاصا میں امیروں اور رئیسوں کی بے تابی دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ایک ناچنے والی اپنے سر پر شراب سے بھرا جام رکھ کر رقص کر رہی تھی۔ اس کے کان کا یہ انداز سب کے لیے بڑا اٹوکھا تھا۔ شہزادہ ابراس جیسے دیوانہ ہو گیا۔ وہ بولا۔

”مقدس معبود کی قسم! آج سے قبل ایسا رقص ہم نے نہیں نہیں دیکھا۔“

”تم واقعی ایک محبت کرنے والی لڑکی ہو۔“ پھر ایک دم سے بات بدل کر بولی۔ ”سنا ہے ظلم خانے کے داروغہ معداؤس نے کوئی خاص مورتی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ ظلم خانہ ضرور دیکھیں اور معزز معداؤس سے ملیں۔ کیا تم بھی ایسا محسوس کرتی ہو؟“

”ہاں۔“ شہزادی دلچیت نے جلدی سے کہا۔ ”ہم بھی یہ ظلم خانہ دیکھنا اور بے جان صورتوں سے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ معداؤس کی بحر اور گل کی قوت نے اہل مصر کو عجب کر رکھا ہے اور جب سے انہوں نے نیا منتر ایجاد کیا ہے، تب سے تو ان کی شہرت بلند یوں کو چھو رہی ہے۔“ یہ کہتے کہتے دلچیت کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ مگر ادنیٰ اور بولی۔ ”مگر ایک بات سے ڈر لگتا ہے۔ اگر آپ ظلم خانے تشریف لے گئیں اور لو جو ان ساحر آپ کے حسن سے مسحور ہو گیا تو؟“

اس بار حور یا کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔ ”اگر صورت حال اس کے برعکس ہوگی اور لو جو ان ساحر دلچیت بخت کو ریش کے حسن سے مسحور ہو گیا تو شہزادہ ابراس کیا کریں گے؟“

جلد دلچپ تھا لہذا دلچیت بھی ہنس دی۔ نہ جانے کون سی سوچ اسے نکلتا رکھے دے رہی تھی اور وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ بڑی بڑی نمور آنکھوں میں شوخی تھی۔ بھرے بھرے عارض، خفیف سا زخمیاں اس کے حسن میں جاذبیت پیدا کر رہے تھے۔ اس نے بڑے فخر و غرور اور بڑے ہی اعتماد سے کہا۔

”جس طرح میں شہزادہ ابراس کو کسی کے حوالے نہیں کر سکتی، اسی طرح وہ بھی اپنی محبت کے درمیان کسی کو برداشت نہیں کریں گے۔“

حور یا نے محبت اور محبوب پر اس قدر اعتماد کے انداز کو تعجب سے دیکھا اور مسکرا دی۔ شاید اس وقت کچھ کہنا یا محبت کی مخالفت کرنا اسے پسند نہ تھا لہذا اس نے بات بدلی اور کہا۔

”سہر حال، ظلم خانہ تو ہم بعد میں دیکھیں گے، آج تو ہم نے ایک اور چیز دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”کیا؟“ دلچیت نے اسے متنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا دیکھ کر سوال کیا۔ یوں موضوع بدلتا اور حور یا کا ایک خاص انداز سے مسکراتا توجہ طلب تھا۔ اس نے کہا۔

”حضور کوئی خاص بات ہے۔ کیا ہمیں نہیں بتائیں گی کہ وہ کیا چیز ہے؟“

حور یا نے اس کے گلے میں ہانپیں ڈالیں اور سر گھٹی

کرتے۔ کبھی ہواؤں سے اور گرد و حال دریافت کرتے پھر دریا کی لہروں سے آنے والے حالات کی بابت پوچھنے کے لیے انہیں سڑک پر تاتوا تو اس ہال سے باہر نکلے۔ ابتدا میں یہی طریقے ان کے پاس تھے۔ ”کہتے ہوئے معداؤں عمارت کے کئی حصوں سے گزرتا ہوا ایک خالی کوٹھے کی طرف بڑھا اور آگے بولا۔

”حضور اس بات سے آگاہ ہیں کہ علم سحر پر مختلف ادوار میں تجربات ہوتے رہے۔ عرصے تک لوگ عمارت کو بھی جادوگر سمجھتے رہے مگر یہاں سے ہٹ کر تجربہ کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ عمارت کی نہیں بلکہ اس کی بلندی اور چار جہاں رخ ہونے کے سبب سٹے لوگ دور دور کی آوازیں سننے لگتے ہیں اور سن سکتے ہیں۔ پھر سحر نے نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔

”یہ زندگی بگاڑنے اور بنانے، توڑنے اور جوڑنے میں استعمال کیا جانے لگا۔ سیکڑوں میل دور بیٹھے شخص کی خرابی بڑی آسان ہوئی۔ اس کا چھوٹا سا پتلا بنا کر اس پر عمل کیا جاتا اور اس شخص پر یہ عمل اثر کرتا۔ پھر اسی علم میں ان تمام امور کا توڑ بھی ساتھ ساتھ دریافت کیا گیا۔ بہت سے ماہرین امیر اور سحر نے اس عمل کو صرف تخریب کے لیے استعمال کیا، تعمیر کا خیال ہی کم لوگوں کو آیا۔ کبھی بھی اس علم کے ماہرین میں مقابلے بھی ہوتے مگر ان تمام باتوں کی وضاحت کر کے حضور کی سچ خراش نہیں کروں گا کیونکہ اس وقت آپ صرف ظلم خاندان دیکھنا چاہتی ہیں۔ لہذا میں بتاؤں کہ جادو کا یہ سحر صرف ایک ہال نہیں بلکہ اب اس کے متعدد حصے ہیں اور سب سے خاص حصہ یہ ہے جہاں انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں اور مجسمے ہیں۔ ہم اپنا خاص متن ان تصویروں پر پڑھتے ہیں تو مستقبل میں پیش آنے والے حادثات اور واقعات ان تصویروں پر واضح ہوتے ہیں اور ہم اندازہ کر لیتے ہیں کہ کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔

دونوں شہزادیوں نے معداؤں کی گفتگو بڑے غور سے سنی اور اشتیاق سے اس سے کو دیکھا جہاں چاروں طرف دیواروں پر سیاہ چادر پٹی ہوئی تھیں اور ان سیاہ چادروں پر ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ شہزادی حور یانے اپنے مخصوص اور تین بجے میں کہا۔

”اور اب آپ نے وہ ستر ایجاد کیا ہے جو ان تصویروں اور مجسموں میں جان ڈال دیتا ہے؟“

”حضور نے درست فرمایا۔ غلام کا ستر بہت جلد بحال ہو چکا ہے۔“

”معزز معداؤں!“ ولقیہ نے دریافت کیا۔ ”جب واقعات بے جان تصویروں اور مجسموں پر اثر انداز ہوتے ہیں تو کیا ہر انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے یا صرف اسے علم کے ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں؟“

”معزز شہزادی!“ معداؤں نے نہایت احرام سے کہا۔ ”عام لوگ صرف یہ جان سکتے ہیں کہ کچھ ہو رہا ہے مگر واقعات کس کے ساتھ پیش آنے والے ہیں، اس کا اندازہ صرف ساحر اور جادوگر ہی لگا سکتے ہیں۔“

”کیا آپ ہمیں مستقبل کی کچھ جھلکیاں دکھا سکتے ہیں؟“ ولقیہ نے جلدی سے کہا۔

یہ سن کر معداؤں نے ایک نظر شہزادی حور یا کی جانب ڈالی اور ادب سے بولا۔ ”اس امر کی اجازت غلام کو شہزادی حور یا سے لینا ہوگی۔“

”اگر معزز معداؤں کو دشواری نہ ہو تو ضرور دکھائیے۔“ شہزادی حور یانے جواب میں کہا۔

تو جوان ساحر نے سر جھکا کر کہا۔ ”حضور کے حکم کی تعمیل خادم کا اولین فرض ہوگا۔“

پھر کبھی وہ وقت تھا جب شہزادی حور یانے اچانک سے پھر سوال کیا۔

”معزز ساحر! کیا مستقبل میں آنے والے حالات دیکھ کر اہل معراکے تدبیریں کر سکتے ہیں کہ خرابی سے محفوظ رہیں؟“

اس سوال پر بھی معداؤں کے قدم لڑکھڑکے۔ اس نے جلدی سے سنبھالا لیتے ہوئے کہا۔

”عالی مقام شہزادی انسان کتنا بھی صاحب علم اور متفکر ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ سوشل سے ستاروں واقعات کو تدبیر سے روکا جاسکتا ہے مگر ہر شخص کے لیے سوشل سے تین باتیں ضرور ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوصف ہم انہیں وقوع پذیر ہونے سے روک نہیں سکتے۔ وہاں انسانی طاقت بے اثر ثابت ہوتی ہے اور یہی تین واقعات باقی ستاروں واقعات پر غالب آجاتے ہیں۔“

یہ باتیں کرتے کرتے تو جوان ساحر اس خاص حصے کے وسط میں پہنچ گیا پھر اس نے آنکھیں بند کر کے بلند آواز سے ایک ستر پڑھا پھر جتر پھونکا۔ پل کے پل ایک جانب دیوار پر لگی تصویروں میں بجلی کی کوئنگی اور یہ لکیریں پردے پر مختلف انداز میں جھلکے لگیں۔ ان تصویروں میں ایک ہنگامہ سا پھوٹا ہوا۔ کئی جگہ آگ لگ چکی تھی ایک نازک سی عورت نے ایک مرد کو موت کے کھاتے اتار دیا۔ اس وقت

ولقیہ کی چیخیں کھل گئیں۔

”شہزادی حور یانے فوراً حکم دیا۔“ اسے بند کریں۔“

معداؤں نے حکم سننے ہی دوسرا ستر پڑھا تو نمایاں تصویریں معدوم ہو کر حسب سابق لکیروں میں بدل گئیں۔ اس وقت شاہی خدمت گار، محافظ اور شہزادی حور یا جٹ حیرت سے ہوئے تھے۔ یہ تصویریں چند لمحوں کے لیے نمایاں ہوئی تھیں مگر ہنگامے کے سوا کچھ نہ تھا۔

شہزادی حور یا کے رخ پر غور و فکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔ اسی لمحے معداؤں نے ولقیہ سے کہا۔

”غلام، شہزادی سے معافی چاہتا ہے کہ انہیں اس منظر سے تکلیف ہوگی۔“

”کاش! ہم اس کے بعد بھی دیکھ سکتے مگر ہماری ہمت جواب دے گئی۔ بھلا کیا کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر سکتی ہے؟“ شہزادی ولقیہ نے دریافت کیا مگر معداؤں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اسی وقت شہزادی حور یانے جانے کے لیے مڑی تو سب اس کے پیچھے چلے گئے۔ معداؤں نے جب کہ شہزادیوں کا شکر یہ ادا کیا اور وہ سب ظلم خانے سے باہر آگئے۔

جس وقت یہ لوگ شاہی سواریوں میں بیٹھ رہے تھے، تو جوان ساحر سیاہ پردوں کے عقب سے دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

”شہزادی! اچھا ہی ہوا کہ آپ نے یہ قرابا بند کرنے کا حکم دے دیا ورنہ آپ اس کے بعد جو کچھ دیکھیں، آپ کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگتی کہ تمام حالات کس کے ساتھ پیش آنے والے ہیں۔“

جب تک حسین شہزادی کی سواری نظر آتی رہی، تو جوان ساحر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اس طرح سانس لی جیسے وہ دوبارہ اسے دیکھ چکا ہو۔

اس کے بعد اس نے ظلم خانے کا دروازہ بند کیا اور ایک نئی صورت بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ ہر صورت اور مجسمہ بنانے کے بعد وہ اس کا نام رکھنے کا عادی تھا مگر اس صورتی کا نام اس کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود تھا اور یہ نام تھا ”شہزادی حور یانے خورشید“۔

☆☆☆

عین اس وقت جب تو جوان معداؤں نے ظلم خانے کا دروازہ بند کر کے جیسے خود پر دنیا کی خوشیوں کے دروازے بند کر لیے تھے، شہزادی ولقیہ، شہزادی حور یا سے کہہ رہی تھی۔

”ہم خوفزدہ ہو کر چیخ اٹھے اور آپ نے حکم دینے میں غلطی کی ورنہ اس نازک سی عورت کے بعد کے حالات بھی دیکھ سکتے تھے جس نے ایک اور عرصہ مر و کھل کیا تھا۔ آخر ہماری قوم میں اتنی جرأت منداؤں نے عورت کو مل سکتی ہے؟“

”جو کوئی بھی ہے۔“ شہزادی حور یا نے کہا۔ ”جادو اور جادو کی یہ قوت بڑی حیرت انگیز چیز ہے اور سب سے زیادہ متاثر کن چیز معداؤں کا علم ہے۔ سنا ہے کہ تصویروں میں جان ڈال دینے کا مکمل اور ستر اس کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔“

دونوں شہزادیاں دیر تک اس کے عجیب و غریب سحر پر گفتگو کرتی رہیں پھر اچانک ہی ولقیہ نے پوچھا۔

”شہزادی! تو جوان ساحر آپ کو کیا لگا؟“

”کون..... معداؤں؟“ شہزادی نے جیسے یہ الفاظ کہنے کی آڑ میں خود کو جواب کے لیے تیار کیا اور اگلے ہی لمحے خیالات کو جمع کر کے بولی۔ ”اس کے علم اور جادو کی قوت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ہمیں بھی اس کے ان اوصاف کا اعتراف ہے۔“

”ان اوصاف سے ہٹ کر وہ کیا ہے؟“ ولقیہ جیسے وضاحت چاہتی تھی۔

”ولقیہ.....! شہزادی حور یانے براہ راست نام لے کر اسے مخاطب کیا اور آگے بولی۔ ”یاد رکھو، کوئی شخص اپنے اوصاف سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس دنیا کے بازار میں ہر شے کی قدر و قیمت کسی سبب سے ہے۔ تیساری اس لیے ہے کہ تم ایک حسین لڑکی ہو، شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ میری اس لیے کہ میں بادشاہ وقت کی بیٹی اور تاج و تخت کی وارث ہوں۔“

”شہزادی! آپ کی سوچ بڑی عجیب اور منفرد ہے۔“

”تمہاری اس ساحر کے بارے میں کیا رائے ہے؟“

شہزادی حور یانے دریافت کیا۔

”شہزادی!“ ولقیہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا اور بولی رہی۔ ”اگر ہم ابراس سے محبت نہ کرتے تو یقیناً ساحر معداؤں کو پسند کر لیتے کیونکہ اس میں ہر وہ صفت موجود ہے جسے کوئی بھی شہزادی پسند کر سکتی ہے مگر یقیناً جس شخص کی نظروں میں ہم آپ کے لیے چاہت محسوس کر لیں، اس کے لیے اپنی پسند کا اظہار کر دینا ایک کٹا ہوا پتھر ہے۔“

اس آخری جملے نے حور یا کو چوکا دیا۔ ابھی تک وہ ولقیہ کے اس سوال کو عام انداز میں لے رہی تھی مگر اب اس نے غیب سے دیکھا۔ کچھ پوچھ نہ کر کیجیے جسم سوال بن گئی۔

”ہاں۔“ ولقیہ نے پوری طرح وضاحت کی۔

برآمدے اور شہزادہ ابراہیم کے شہزادہ ابراہیم کے محل میں پہنچی تو محکمہ کی گئی۔ اس وقت شہزادہ اپنے خاص معاصب ایمین کے ساتھ بیٹھا جو گفتگو تھا۔ یہ گفتگو کیا تھی؟ کسی کو خبر نہ تھی مگر جوئی غلام نے اطلاع دی جناب قمر سے کنیز آئی ہے شہزادہ اور ایمین جیسے چونک گئے۔ شہزادے کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ اس نے یاری کی اجازت دی تو کنیز ہاتھوں میں پھولوں کا گلہستہ لیے حاضر ہوئی۔ پہلے شہزادے کے در و درو سلام کے لیے جھکی پھر ادب سے گلہستہ پیش کر کے بولی۔

”حضور! شہزادی صاحبہ نے بیجا ہے۔“
شہزادے نے بالکل اس طرح جیسے کوئی عام سی چیز لیتے ہیں، اس سے گلہستہ لیا۔ لگتا تھا کچھ کہنے یا خوشی کا اظہار کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

”شہزادی سے ہمارا شکر ہے کہنا۔“ پھر اپنی سی نظر ڈال کر بولا۔ ”تم دلبر تو نہیں، پھر کون ہو؟“
”حضور! کنیز کو روشن آرا کہتے ہیں۔ دلبر طبع ہے۔“
”اوہ۔“ شہزادے نے اس سے رخ موڑا۔ بالکل

یوں جیسے جانے کی اجازت دے دی ہو۔ اس وقت کنیز نے جھک کر سلام کیا اور لوٹ آئی مگر جب وہ اس کمرے کی متعدد کھڑکیوں کے پاس سے گزر رہی تھی تو اس نے ہونے والی گفتگو کی آواز نمایاں طور پر سنی۔ شہزادہ ابراہیم کی عام انسان کی طرح کہہ رہا تھا۔

”ہائے..... ہم کیا کریں۔ جو کچھ چاہتے ہیں اس کے حصول کی توقع نہیں۔“

اس وقت ایمین بن ولید نے ہنس کر کہا۔
”شہزادے! لگتا ہے آپ تخت و تاج سے زیادہ خیمت والی کو چاہتے گئے ہیں۔“

☆☆☆

اس شب شہزادی ولیدیہ اپنے چمن میں ایک ہمارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھی ہوئی شہزادے کے جلوں پر غور کر رہی تھی جو اس نے ایمین سے کہے تھے۔ اس کی محبت کی حقیقت کو اگر بالکل عیاں تو نہیں کیا تھا تو بہت حد تک واضح ضرور کر دیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ برسوں اس کی دیوانہ وار محبت کے جواب میں شہزادہ اسے بے وقوف بناتا رہا ہے۔ وہ افسردہ سی بیٹھی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی ہوئی شہزادی حور یا اس کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

شہزادے کے محل سے واپسی کے بعد اس نے ۲۷

حیرت تھی۔
آج اچانک ہی شہزادی حور یا نے اسے تنہائی میں طلب کیا تھا اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چند لمبے اسی سکوت کی اندر ہو گئے پھر شہزادی حور یا نے آہستہ سے کہا۔
”ولیدیہ! تم ابراہیم سے روز ملتی ہو؟“ ولیدیہ اس سوال پر قدرے عینیتی پھر آہستہ سے جواب میں کہا۔
”شہزادی! ان دنوں ابراہیم بہت مصروف ہیں۔ ہر روز تو نہیں مگر دوسرے دن ضرور ملاقات ہوتی ہے۔“
”ان کی مصروفیات کیا ہیں؟“ شہزادی نے نشست کے نیچے سے ٹیک لگاتے ہوئے سوال کیا۔

”کہہ رہے تھے بادشاہ کی بہت مخالفت ہو رہی ہے۔ دوسرے بیرونی علاقوں کی کچھ مصروفیات ہیں۔ اس کے علاوہ بھی.....“

ولیدیہ کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ شہزادی نے اچانک پوچھا۔ ”شہزادہ ابراہیم اور تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“ بادشاہ نے کئی برس قبل شہزادی حور یا سے دی تھی۔
”شہزادے کی بہت سی مصروفیات رکاوٹ ہیں۔“ شہزادی ولیدیہ نے جواب دیا۔

”ولیدیہ! شہزادی حور یا نے انداز بدلا اور بولی۔
”آج میں تم سے ذاتی قسم کی وہ گفتگو کر رہی ہوں جو مجھے نہیں کرنی چاہیے مگر یہ بہت ضروری ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جس دن تم شہزادے سے ملاقات نہیں کر سکتی اس دن کوئی پیغام بھیجی ہو اور اگر بھیجی ہو تو کس طرح؟“

پے در پے کئی سوالوں نے شہزادی کو چونکا دیا اور دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ شہزادی حور یا نے جھجوری تھی، نہ اسے اس کی محبت سے کوئی غرض تھی پھر ان سوالوں کا مطلب کیا تھا؟ اس نے سوچا مگر اس کے آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

”مجھے جو پیغام بھی دینا ہوتا ہے اپنی کنیز کے ذریعے بھیجتی ہوں۔“

”ہوں..... آج سے تم یہ تمام پیغامات، گلہستہ اور دیگر اشیاء اپنی کنیز کے ہاتھ بھیجی جو شہزادے سے بہت مختصر سوالات کرے گی اور پس۔“ شہزادی حور یا نے جیسے حکم صادر کیا اور اپنے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اور ہاں، غور سے سنو۔ باپروہ اور تم کو کنیز تم خود ہوگی۔“
شہزادی ولیدیہ چونک گئی۔

☆☆☆

”نئی کنیز“ جب عیوب راہدار یاں، چمن، اونچے

تھی، اسی طرح سلام کر کے واپس لوٹ گئی۔ بادشاہ غریبش نے تالی بجائی اور رات کے لیے نئے احکامات دیے لگا۔
میں اس وقت جب وہ عیش و نشاط کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کا خاص مصاحب اور قمر شہزادی کے امور کا منتظم اعلیٰ ہامان اس کی خوشامد میں مصروف تھا، بادشاہ رخصت دیکھتے ہوئے بولا۔
”ہامان! مصر کی اس لڑکی کے بارے میں تو نے معلومات حاصل کیں؟“

”عالی جاہ!“ ہامان بولا۔ ”اس کے بارے میں تو غلام بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ بوڑھے عالم عمران کی دختر ہے۔ اس کا نام مریم ہے۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ مصر میں کوئی اس کی برابری نہیں کر سکتا مگر بوڑھا عالم عمران حصول علم کے لیے جگہ جگہ پھرتا ہے لہذا مصر میں کم ہی قیام رہا۔ پچھلے ہی دنوں وہ یہاں پہنچا ہے۔“

”اگر وہ لڑکی اتنی حسین ہے تو مابعدولت کے حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہوئی؟“
”عالی جاہ! بوڑھا عالم عمران اس فعل کو غلط قرار دیتا ہے۔“ ہامان نے جواب دیا۔

”اگر ہم اس لڑکی سے شادی کر لیں تب بھی؟“
بادشاہ نے مضطرب خاطر انداز میں سوال کیا۔
”جی ہاں۔“ ہامان نے ادب سے کہا۔ ”بوڑھا عالم اس کے لیے بھی رضامند نہیں ہے۔“

یہ سن کر بادشاہ اشتعال سے دیوانہ ہو گیا اور بولا۔
”تم نے یہ بات مابعدولت کو پہلے کیوں نہ بتائی؟“
”عالی جاہ! یہ آخری بات غلام نے آج ہی معلوم کی ہے اور آج غلام اسی لیے حاضر ہوا تھا مگر حضور محفل.....“
”یہ محفلیں ہم اسی لیے آراستہ کرتے ہیں کہ مابعدولت سکون چاہتے ہیں مگر ہر لڑکی کے ساتھ مابعدولت کو سکون نہیں مل سکتا۔ اب مابعدولت اندازہ کر چکے ہیں کہ ہمیں اسی بوڑھے عالم کی دختر کی ضرورت ہے۔ وہ رضامند نہ ہو تو لڑکی کو زبردستی اغلا لاؤ۔ مصر کے جس گوشے میں ہو، ڈھونڈ لاؤ۔ مابعدولت صرف دو دن کی مہلت دیتے ہیں۔ جاؤ فوراً جاؤ۔“

اس دھڑ پر محفل در ہم برہم ہوئی۔ رقصا صحن خوفزدہ ہو کر سٹ گئیں۔ سازندوں کے ہاتھ سازوں پر جم گئے اور خوشامدی ادب سے کھڑے ہو گئے۔
ادھر یہ سب ہو رہا تھا ادھر شہزادی حور یا اپنی نشست گاہ میں بیٹھی تھی جب سے شہزادی ولیدیہ کو دیکھ رہی تھی۔ کرا روشتیوں سے بے نقہ نور بنا ہوا تھا۔ ولیدیہ کے رخ پر اعلیٰ اور

ہمیں چاہیے اور یوں اب مابعدولت کے خیال میں تھارے لیے سب سے مناسب شہزادہ ابراہیم ہیں۔“
”جی.....“ شہزادی حور یا غیر ارادی طور پر چٹختی مگر فوراً ہی بادشاہ کی حیثیت کا خیال کر کے معذرتی لہجے میں بولی۔ ”صاف سمجھئے، ہم سے کتنی ہوئی مگر ہم یہ نہیں جان سکتے کہ شہزادے کو چند برس قبل آپ اپنی تنگی سے شادی کی اجازت دے چکے ہیں۔ اس سے آج ہمیں کیوں منسوب کر رہے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ شہزادہ ابراہیم اور شہزادی ولیدیہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟“
”شہزادہ ابراہیم اس محبت سے دستبردار ہو گئے ہیں۔“ بادشاہ نے کہا۔

”کیوں؟“ شہزادی حور یا نے قدرے طعنے سے کہا۔
”کیا سخت و تاج کے لیے؟“

”نہیں۔“ بادشاہ غریبش نے اطمینان سے کہا۔ ”انہیں سخت و تاج کی ضرورت نہیں بلکہ سخت و تاج کو ان کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات کی دلی عہد کے متقاضی ہیں۔“
”آپ انہیں دلی عہد نامہ فرما دیجیے۔“ شہزادی حور یا نے اطمینان سے کہا۔ ”ہم سخت و تاج سے دستبردار ہو جاتے ہیں مگر یاد رکھیے، کوئی بیش پرست انسان سخت و تاج سے انصاف نہیں کر سکتا۔ ہمیں ان سے بھی کوئی اچھی توقع نہیں ہے لیکن آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اقتدار طلب نہیں کریں گے لیکن یہ شادی ہمیں پسند نہیں۔“

”اس کی وجہ؟“ بادشاہ نے قدرے ناگواری سے دریافت کیا۔
”کیونکہ کسی دوسرے کی چیز لینا ہماری فطرت نہیں ہے اور یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ شہزادہ ابراہیم، شہزادی ولیدیہ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ صرف مصلحت وقت کے تحت ہمیں اپنا نہیں گئے۔“

”وہ شہزادی ولیدیہ سے محبت نہیں کرتے۔“
”جلیس مان لیا کہ ان کی محبت میں غرض شامل نہیں مگر شہزادی ولیدیہ تو صرف انہی سے محبت کرتی ہیں۔“ شہزادی حور یا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”اب ہم اجازت چاہتے ہیں۔ امید ہے حضور ہمیں مجبور نہیں کریں گے۔“

بادشاہ غریبش نے اپنی بیٹی کو تعجب سے دیکھا۔ شہزادی کے لہجے کی چٹختی، ذہانت اور علم قابل تعریف تھے لہذا اس کا اس طرح اس بات کو ٹھکرا دینا نا پسندیدہ ہونے کے باوجود بادشاہ کو ہنسا دیکھ کر بغیر زورہ سکا۔ پھر وہ دیکھتا رہا اور شہزادی جس طرح آہستہ روئی اور ادب سے حاضر ہوئی

مشورہ

ایک آدمی مسجد میں اس طرح اذان دیا کرتے تھے کہ لوگوں کو چومس ہوتی تھی۔ مسجد کا متولی بڑا مروت پسند تھا۔ اس نے مؤذن سے کہا کہ اس مسجد کے کچھ اور مؤذن ہیں۔ میں انہیں بھی رقم دیتا ہوں۔ میں تمہیں دس دینار دیتا ہوں۔ تم اپنی اہل مال کی اور مسجد میں چلے جاؤ تاکہ دوسروں کو بھی موقع دے سکوں۔ معاملہ طے ہو گیا۔

کچھ دن بعد متولی ایک جگہ سے گزرا۔ وہاں اسے وہ مؤذن مل گیا۔ متولی نے حال پوچھا تو مؤذن نے کہا۔ ”آپ نے مجھ پر بہت ظلم کیا کہ دس دینار کے بدلے نکال دیا۔ حالانکہ اب میں جس جگہ ہوں وہاں مجھے بیس دینار دیتے ہیں کہ میں کہیں اور چلا جاؤں لیکن میں اس رقم کو قبول نہیں کر رہا ہوں۔“

متولی نے کہا۔ ”ہرگز قبول نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں پچاس دینار تک دینے پر تیار ہو جائیں گے۔“

(مترجم: جہانگیر بدر، راولپنڈی)

میں دیکھا۔ کینز نے سلام کر کے کہا۔

”حضور! آج کینز کو شہزادی حضور نے نہیں بھیجا بلکہ وہ خود ان کی کیفیت بیان کرنے حاضر ہوئی ہے۔“

”بہت خوب۔“ شہزادہ بولا۔ ”تم ایک ذمے دار اور کارآمد کینز ہو۔ بتاؤ شہزادی کسی ہیں؟“

”شہزادی علیل ہیں۔ گزشتہ شب دودھ پی کر انہیں خوب نیند آگئی تھی۔“

یہ سنتے ہی شہزادے کے رخ پر تازگی سی آگئی۔ اس نے کہا۔

”تم جاؤ اور شہزادی کی دوا اور آرام کا مکمل خیال رکھنا اور ہمیں آگاہ کرتی رہنا۔“

حکم سنتے ہی کینز نے جبکہ سلام کیا اور پلٹ آئی مگر اس دن اس نے کھڑکیوں کی قطار کے نیچے سے گزرتے ہوئے دانت اپنی چال ست کر دی۔ اس وقت ایمین بن ولید کھڑے تھا۔

”شہزادے! یہ سفوف کھان کے مشہور طبیب سے بمشکل حاصل کر سکا ہوں۔“

”ہوں۔“ شہزادہ ابراس نے کہا۔ ”شہزادی حور یا کوشادی میں یہ قدر ہے تاکہ دلیقہ مجھے چاہتی ہے۔ اس

”سلطنت کی ہتھکڑی کے لیے شہزادہ ابراس کا شہینگر کرلو۔“

شہزادی نے جواب دیا۔ ”ابراس صرف دلیقہ کے ہیں۔ وہ دلیقہ سے محبت نہیں کرتے مگر وہ تو ان سے محبت کرتی ہے۔“

جواب وہی پڑا تھا۔ بادشاہ بھر اپنی عیاشیوں میں مصروف ہو گیا اور شہزادہ ابراس کی مصروفیات بھگا اور بڑھ گئیں۔

ایک دن شہزادی دلیقہ کینز کے روپ میں شہزادہ ابراس کی خدمت میں پہنچی تو ایمین بن ولید حاضر خدمت تھا اور ان دونوں کے درمیان گفتگو بڑی رازداری سے ہو رہی تھی۔

کینز نے جبکہ سلام کیا تو شہزادے نے اسے روک لیا۔

ایمین بن ولید کو رخصت کر کے شہزادی کا پیغام سنا اور بولا۔

”گزشتہ شام شہزادی صاحبہ سے ہماری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ خود کو کچھ کمزور محسوس کر رہی ہیں۔ ہم نے ان کے لیے ایک مفتوی سفوف منگوایا ہے۔ اسے روزانہ دودھ میں ملا کر پلاتا ہے۔ یہ خدمت تمہیں انجام دینی ہے اور ان کے حال سے ہمیں آگاہ بھی کرتے رہنا ہے۔“

کینز نے وہ سفوف لے لیا۔ شہزادے نے چند اور ہدایات دیں، اس کی مقدار بتائی، پابندی کا حکم دیا اور کینز کو رخصت کر دیا۔ اس وقت دلیقہ عجیب تھی۔ اس نے ملاقات کے دوران کئی کمزوری یا عیالات کا ذکر نہیں کیا تھا۔

اس دن دونوں شہزادیاں جان گئی تھیں کہ شہزادے نے نیا جال پھینکا ہے اور جب یہ سفوف پلما پر استعمال کیا گیا تو اس پر شہزادی علیل ہو گئی پھر معاملہ سمجھنے میں انہیں چنداں دیر نہ لگی۔

شہزادی حور یا نے کہا۔ ”یہ بتدریج اثر کرنے والا زہر ہے جو شہزادہ تمہیں دینا چاہتا ہے۔ میں یہ بات بادشاہ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔“ یہ سنتے ہی دلیقہ نے اسے روکا اور بڑی رازداری سے بولی۔

”شہزادی! آپ اس معاملے کو راز ہی رکھیں اور زہر رکھ لیجیے۔ بوقت ضرورت کام آئے گا اور پھر بادشاہ پوری طرح شہزادے کی حمایت اور عیش و عشرت میں مبتلا ہیں۔ اب جو کچھ کرنا ہے، آپ ہی کو کرنا ہے۔“

شہزادی حور یا نے اسے تائید کی نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ”خفیک ہے۔ اب سب کچھ ہمیں خود کرنا ہے اور ہم وہ کریں گے جو کسی نے نہ کیا ہوگا۔“

پھر دیر تک باتیں ہوئی رہیں۔ اگلے دن کینز شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آج بھی ایمین بن ولید موجود تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو کتنی خیر انداز

مدتوں سے حکومت اور حکمرانوں کا انجام دیکھ رہے تھے۔ ایسے اقتدار کی ہمیں کوئی طلب نہیں ہے۔“

شہزادی دلیقہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ عظمت کے سامنے کتنے بھرکوائے محسوس ہوا کہ ابراس کی ہر بات ”تم اطمینان سے دہرا کھیل کھیلتی رہو جیسے کہ وہ کھیل رہے ہیں۔ یاد رکھنا، ملکوں کے بہت سے شہزادیاں نہیں، کینز جی جاتی ہیں لیکن ہمیں ہر بات آگاہ کرنی رہنا۔“

اس کے بعد..... ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شام شہزادی دلیقہ اور شہزادہ ابراس کی تنہا گوشتے میں ملنے شہزادے کی محبت میں گرجوٹی ہوئی۔ کبھی چاہت کا اظہار کرتا، کبھی شادی کے وعدے اور جس دن شہزادی ایک کینز روپ دھار کر پیغامات لے کر جاتی تو اپنی محفلوں میں بیٹھ ہوا شہزادہ صرف تجت و تاج کا دلدادہ یا شہزادی حور یا کا طالب نظر آتا۔

ان محفلوں سے واپس آتے ہوئے وہ منت ہی خبریں سن لیتی۔ ایک بار اس نے سنا کہ کھان کے سپہ سالار جیرو نے ایک بڑی رقم کے عوض کھان کی چند حسینائیں شہزادہ ابراس کو بھیجی ہیں۔ اس خبر کے چند روز بعد کینز شہزادہ ابراس نے کسی سے ملاقات نہ کی۔ یہاں تک کہ شہزادی دلیقہ سے ملاوڑ اس کی ”کینز“ سے۔

پھر خبر ملی کہ بادشاہ غریب کی پیش پرستی کے سبب عوام اس کے مخالف ہو گئے ہیں۔ سرعام اس کے خلاف فریے لگتے ہیں۔ یہ خبر اور کئی ذرائع سے مل گئی تھیں آج بھی۔ دونوں شہزادیاں دیر تک اسی موضوع پر بات کرتی رہیں۔ بادشاہ غریب اور شہزادہ ابراس دونوں ہی عیش و عشرت کے دلدادہ تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ انہی میں کم ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ وقت اور بیت چلا تو خبر ملی..... ظلم خانے کے داروغہ معدائوس بن داؤل نے وہ عجیب و غریب صورتی مکمل کر لی ہے مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس صورتی کی نمائش نہیں کریں گے کیونکہ وہ انہوں نے صرف اپنی پرستش کے لیے بنائی ہے۔ خلقت کو اس صورتی کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا مگر معدائوس اس کی نمائش سے انکار کر چکا تھا۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ دلیقہ کینز کا روپ دھار دھار کر اپنے محبوب کی اصلیت دیکھتی رہی اور نئے نئے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ بادشاہ نے شہزادی حور یا کو پیغام بھیجا۔

حالات اسے بتا دیتے تھے اور اب خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چہ لے اسی سکوت کی نذر ہو گئے پھر وہ بولی۔

”دلیقہ! یہ تمام حالات ہم نے تمہارے گوش گزار صرف اس لیے کیے ہیں کہ تم حقیقت جان جاؤ۔ ہمارا مقصد تمہیں دکھ دینا ہرگز نہیں تھا۔“

شہزادی دلیقہ نے یہ جملہ کسی سوچ کے عالم میں سنا اور اندوہ کیں آواز میں بولی۔

”شہزادی! ہمیں آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ ہاں، اس بات کا ذکر ضرور ہے کہ وہ برسوں ہمیں محبت کے نام پر دھوکا دیتے رہے، غرض رہتے رہے مگر تجھ سے کہہ لیا کیوں ہوا؟ وہ شروع ہی سے اپنی محبت کا مرکز آپ کو بنا سکتے تھے۔“

”انہوں نے تمہیں اپنی محبت کا مرکز محض اس لیے بنایا کہ دادا جان (بادشاہ علی بن حربیا) کی زندگی میں ان کا خیال تھا کہ تخت و تاج انہیں ملے گا۔ وہی بیڑوں کی واحد زینہ اولاد تھے اور تم شای خاندان کی سب سے حسین شہزادی ہو۔ اقتدار اور حسن..... کبھی دو چیزیں انہیں طلب ہیں مگر اب تخت کے لیے ہمیں نامزد کر دیا گیا تو ان کا فیصلہ بدل گیا اور سوچ کا یہ تبدیلی چند ہی چندوں میں ظاہر نہیں ہوئی۔ اسی دن سے جس دن ابا جان غریب بن گئی نے تاج پہنا تھا۔ ہماری نظروں نے یہ سب اسی دن محسوس کر لیا تھا۔“

اب تک شہزادی دلیقہ بہت حد تک تسخیر چکی تھی، بولی۔ ”انہوں نے غرض برتی یا محبت لیکن ہم نے حقیقت میں انہیں چاہا مگر اب آپ کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ اگر تخت و تاج کو ان کی ضرورت ہے اور ہمیں فراموش کر کے وہ یہ سب حاصل کر سکتے تو ہم اپنی محبت سے دستبردار ہوتے ہیں۔“

اس جملے پر شہزادی حور یا کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے قدرے اشتعال کے عالم میں کہا۔

”ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے ہیں مگر تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ تخت و تاج کو ابراس کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ کوئی عیش پسند بادشاہ تخت سے انصاف کر سکتا ہے، نہ حکومت کی ذمے داریاں پوری کر سکتا ہے۔ انہیں صرف ہوس ہے، حرص ہے۔ وہ اقتدار کی بھی ہوسکتی ہے، حسن کی بھی اور شراب کی بھی۔ غریب جو چیز نہ ملے گی، اسی کو طلب کریں گے۔ جہاں تک تمہارے فیصلے کا تعلق ہے، تم کچھ مت کہو۔ ہم ابا جان سے کہہ چکے ہیں کہ اگر حکومت کی ذمے داریاں وہ اٹھا سکتے ہیں تو ہم سے محبت کرنے کا دھوکہ نہ چاہیں بلکہ دلیقہ سے شادی کر لیں۔ ہم خود ان کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ آخر ہم

کے بعد وہ کیا ہانہ کرے گی۔
”مان جا میں ہماری ترکیب۔ حصول تخت میں تیری
آنے والی تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی مگر مجھے نہ بھول
جائے گا۔“

مگر شہزادے نے کیا جواب دیا، نہ کیز نے سنا۔
اسے ضرورت تھی۔ ہاں، اس شام شہزادی ولایت اور
شہزادے کی ملاقات ہوئی تو شہزادی جیسے نیکو کے عالم میں
تھی اور یہ کیفیت شہزادے کو مطمئن کرنے کے لیے کافی
تھی۔ اس نے کہا۔

”یہ خوف باقاعدہ لگتی رہو، بالکل شکیں ہو جاؤ گی۔“
اس رات شہزادی حور یانے دن بھر کی روداد کی اور
دی پرانی بات دہرائی اور بولی۔

”شہزادی ولایت! ہمیشہ یاد رکھنا کہ محبت غرض اور
ضرورت کا پرکشش نام ہے۔“ اور آج پہلی بار شہزادی
ولایت نے یہ بات سن کر اسے جھٹلایا نہیں۔ آج اسے اندازہ
ہو چلا تھا کہ شہزادہ نہ اس سے محبت کرتا ہے، نہ حور یا ہے،
بلکہ اسے صرف تخت و تاج چاہیے۔

☆☆☆

ان دنوں مصر کی حالت کچھ عجیب تھی۔ بادشاہ خریطش
عیش و عشرت کے پیچھے دیوانہ ہو چکا تھا۔ وقت کے ساتھ
ساتھ نہ اسے اپنے ذہب کی پروا تھی نہ شاہی خاندان کے
افراد کا خیال۔ اس کے سامنے جو بھی آتا، عیش و عشرت کی
نذر ہو جاتا۔

اس کی آنکھیں اور کان کھلے ہوئے تھے اور ان
کانوں تک صرف شہزادے کی رسائی تھی۔ وہ اندرون خانہ
سازشیں کر کے تخت چاہتا تھا لیکن بادشاہ کو اپنی راہ سے
ہٹانے کی جرات نہ کر سکتا تھا کیونکہ بادشاہ کے مرتبے ہی
شہزادی حور یا تخت نشین ہو جاتی۔ لہذا شہزادی کو اپنا کر تخت
تک پہنچنے کو وہ کل بھڑھاتا۔

اور شہزادی دور پہنچ کر بھی اس کی ہر چال سمجھ رہی
تھی۔ ہر چال کاٹ رہی تھی مگر شہزادہ ہر بار ایک نئی تدبیر
سوچ لیتا۔ اب اس نے ولایت کو ہر دے کر حور یا تک پہنچنے کا
راستہ تلاش کر لیا تھا۔ اس بار شاید حور یا چاہن یا ہو کر کوئی
قدم اٹھائے مگر انہی دنوں مصر میں وہ عجیب و غریب واقعہ
ہوئی آج اس نے تخت و تاج کے لیے خود فیصلہ کر دیا۔

ان دنوں بادشاہ خریطش کی طبیعت چند دن سے
مضطرب و دبے تھی۔ اس کی وجہ سیاسی حالات نہ تھے، نہ
ہی اس کی وجہ یہ تھی کہ شہزادہ ابراہیم نے شادی کا بیٹا مریا

اور شہزادی حور یانے انکار کر دیا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ
مصری عالم عمران اپنی خوبصورت بیٹی مریم کو لے کر مصر سے
فرار ہو گیا تھا۔

ایسے میں بادشاہ کے مصاحب اپنی ہر کوشش آزما رہے
تھے اور جوں جوں مریم کے کچھنے میں دیر ہو رہی تھی، بادشاہ
دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس بات کو کافی وقت ہو گیا تھا۔ جس مصاحب
کو اس نے مریم کو حاضر کرنے کے لیے دودن کی ہمت دی
تھی، اسے ناکامی کا اعتراف کرنے پر مل کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد کچھ بعد دیگرے کئی بہادر اس کام کے
لیے سامور ہوئے مگر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ وجہ
ان کی ناکامی رہی۔

آج اس نے ایک نئے سردار زور درج کو طلب کر
تھا۔ زور درج ہاتھ باندھے بادشاہ کے در و درگھڑا ہوا تھا۔ مصر
عالم کی خوبصورت بیٹی کے بارے میں استفسار کے جواب
میں اس نے کہا۔

”حضور والا! اطلاع کی معلومات کے مطابق مصری عالم
عمران اپنی دختر کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ پھر رہا ہے۔ ابھی
تک حضور کے خوف سے کسی جوان نے اس کی بیٹی سے شادی
کی جرات نہیں کی کیونکہ حضور کے ہر کارے ہر جگہ اس عالم کا
پہنچا کر رہے ہیں مگر آج ہی خبری ہے کہ ہر جگہ حضور کے
ہر کاروں کے تعاقب سے گھبرا کر وہ عالم اپنی دختر سمیت پھر
مصر لوٹ آیا ہے مگر کہاں ہے؟ یہ کسی کو خبر نہیں ہے۔“

بادشاہ نے بڑے غیظ و غضب کے عالم میں یہ سب
سننا اور غصے سے بولا۔

”زور درج! تم جہیں آج کا دن دیتے ہیں۔ رات
گہری ہونے سے قبل اس بڑے اور اس کی بیٹی کو حاضر کرو
اور اگر بڑھا حالی بیٹی دینے پر راضی ہو جائے تو اسے عزت
مت دینا بلکہ مزکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر موت کے گھاٹ
اتارنا اور لڑکی کو بھاری خدمت میں حاضر کر دینا۔“

☆☆☆

شام گہری ہو چکی تھی۔ زور درج کے آدمی مصر کے گوشے
گوشے میں پھیل گئے تھے مگر ابھی تک ناکام تھے۔ ایسے میں
شہزادی حور یانے اچانک طلسم خانے جا کر اپنے اسلاف کے
مجموں کو کچھنے اور محدائوں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

اسے یہ فیصلہ کرنے اور طلسم خانے میں پہنچنے میں دیر
نہ لگی مگر اس نے جو بھی سڑھیاں ملے کر کے اندر داخل ہونا
چاہا محدائوں نے اس کا استقبال کرنے کے بعد گھبرا کر
”حضور! طلسم خانے کے داروغہ کی حیثیت سے میں

خانہ طلسمات

کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“ اور پھر اجازت ملنے پر
محدائوں نے کہا۔ ”جناب! آج کی شب آپ طلسم خانے
میں تہا داخل ہو سکتی ہیں، کوئی اور نہیں۔“

بات عجیب تھی مگر محدائوں نہ صرف طلسم خانے کا
داروغہ بلکہ نجوی اور مستقبل کے تمام رازوں سے واقف بھی
تھا لہذا شہزادی نے یہ بات ماننے میں ہڈ نہ کیا۔ وہ شاہی
خدمت گاروں اور محافظوں کو مہارت کے نیچے انتظار کا حکم
دے کر اس جادو گھر میں داخل ہو گئی۔ اس وقت محدائوں
نے اپنی بیٹی ہوئی موریتی پر سیاہ کپڑا ڈال دیا تھا۔ لگتا ایسا
ہی تھا کہ وہ جس کی پرستش کرتا ہے، اسے کسی کو دکھانا نہیں
چاہتا۔ شہزادی کے استفسار پر اس نے کہا۔

”حضور! آپ سب اس موریتی کو ضرور دیکھیں گے مگر
ابھی دیوتاؤں کی طرف سے اسے دیکھنے کا وقت نہیں آیا۔“

شہزادی جو اس کے علم سے محروم تھی، خاموش ہو گئی
پھر اس نے اسلاف کے مجسمے دیکھے۔ ان کے بارے میں
دیر تک محدائوں سے گفتگو کی لیکن ابھی وہ واپس نہ ہو پائی
تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ باہر شاہی ہرکارے
اعلان کر رہے تھے۔

”بادشاہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ مقدس
محدائوں طلسم خانے سے باہر تشریف لے آئیں۔ مصری
عالم اور اس کی دختر کی تلاش کے لیے طلسم خانے کی تلاش بھی
ضروری ہے اور محدائوں یہ بھی بتائیں کہ لڑکی کہاں ہے؟“

اس وقت محدائوں کا چہرہ بیسنے سے تر ہو گیا۔ اس
نے کمزور آواز میں کہا۔ ”آج شب کوئی مرد طلسم خانے میں
داخل نہیں ہو سکتا۔“

مگر اس کی آواز دب کر رہ گئی کیونکہ شاہی ہرکارے
نیچے سے تعمیل حکم کے لیے چلا رہے تھے۔ اس لمحے شہزادی
سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے کہا۔ ”مقدس محدائوں! اگر آپ
نے بوڑھے عالم اور اس کی لڑکی کو پناہ دی ہے تو ہم آپ کی
مدد کریں گے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو شاہی ہرکاروں کو
حلاشی لے لینے دیجیے۔“

یہ سن کر محدائوں احترام سے اس کے سامنے جھک گیا
اور بولا۔ ”معتز شہزادی! مصر عالم اور اس حنیہ کو کہیں پناہ
نہ ملی تو غلام نے انہیں پناہ دی ہے اور وہ طلسم خانے میں
موجود ہیں مگر غلام ایک مجبور لڑکی کو شاہ کے حوالے نہیں
کرے گا۔“

”ہم اس کی حفاظت میں آپ کی پوری مدد کریں
گے۔“ شہزادی نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد محدائوں نے شاہی ہرکاروں کو
مخاطب کر کے کہا۔ ”معتز! سردار! مصری عالم اپنی دختر کو
میرے طلسم خانے میں چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور ابھی تک
واپس نہیں آیا۔ میں آج کی شب کسی کو طلسم خانے میں داخل
ہونے کی اجازت نہ دوں گا۔ ہاں، مصر عالم کی بیٹی کو
تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔“

چشم زدن میں خیر بادشاہ تک پہنچ گئی تو اس نے کہا۔
”اگر محدائوں آج رات طلسم خانے میں داخل ہونے کی
اجازت نہیں دے رہے تو ہمیں اعتراض نہیں۔ ہاں، لڑکی
ہمیں ہر صورت ملنی چاہیے۔“

یہ سن کر محدائوں نے جواب میں کہا۔ ”شہزادی کی
سواری واپس جانے کی تو میں لڑکی کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

رات نے آہستہ آہستہ اپنا ابتدائی پیرا پہن اڑھا اور
دیکھنے ہی دیکھتے تاریکی پھیل گئی۔ مصری گھوڑوں اور بازاروں
میں بڑی دیر تک چہل چل رہی۔ جگہ جگہ آج کے واقعے پر
تبصرہ ہوتا رہا۔ کہیں بوڑھا عالم موضوع سخن تھا، کہیں اس کی
بیٹی کے لیے پناہ حسن کا تذکرہ۔ کہیں محدائوں جس نے
اسے پناہ دی تھی اور کہیں بادشاہ کی ہوس پرستی۔

یوں لوگ دلی دہلی زبان سے اعتراض کر رہے تھے۔
غرضیکہ دیر تک یہی ہوتا رہا پھر لوگ منتشر ہو گئے۔ اس
رات بادشاہ خریطش کا کمر شمع و فائوس کی کثرت سے روشن تھا
اور اس روشنی میں نقاب میں چہرہ چھپائے ایک لڑکی بیٹھی
ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر پڑا ہوا بھاری ریشمیں
پردہ ہٹا اور بادشاہ خریطش نشے کے عالم میں کمرے میں
داخل ہوا۔ شراب روڑ کی طرح اس نے آج بھی پی لی تھی
لیکن اتنی نہیں پی تھی کہ بالکل ہی ہوش و خرد سے بیگانہ
ہو جاتا۔ اسے علم تھا کہ آج زور درج کی ثابت قدمی کی وجہ
سے بوڑھے عالم کی خوبصورت بیٹی اس کی خواب گاہ میں پہنچ
چکی ہے۔ لہذا آنے والے وقت کے تصور سے اس کا چہرہ
جھٹھکا رہا تھا۔ اس نے خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے اس
طرف دیکھا اور خشک کر رہ گیا پھر چند قدم چل کر وہاں تک
جا پہنچا جہاں وہ حسن لڑکی بیٹھی تھی۔ بادشاہ نے نشے سے
ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

”رخ سے نقاب اٹھا دو۔ مابدولت جہیں بے نقاب
دیکھنا چاہتے ہیں۔“

لڑکی نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا تو بادشاہ چند
قدم اور قریب آ گیا۔ یہ قربت اتنی تھی کہ وہ گھبرا اٹھی مگر

دوسرے ہی لمحے سبیل کرکری ہو گئی۔ قاب ہوا اس کے سر پر بڑا تھا۔ ہاں، خوبصورت ہاتھ نظر آرہے تھے جن کی لڑائی اس کی سراسکی کا اظہار کر رہی تھی۔ ادھر بادشاہ کے دل میں یہ خوبصورت کاٹنے ہوئے ہاتھ بڑی طرح آگ لگا رہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح چند قدم اور آگے بڑھا اور جھٹ سے بولا۔

”لڑکی! تو قاب کیوں نہیں ہٹا دیتی۔ آخر اس قدر خندی کیوں ہے؟“

لڑکی کھرا کہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت اس کے دل میں نفرت اور حکارت کے جذبات استہار پہنچ چکے تھے۔ اس کے پیچھے ہٹ جانے کو بادشاہ نے فخریہٹ پر محمول کیا اور بولا۔

”بادشاہت وہ چہرہ دیکھنے کو بے قرار ہیں جس نے ہمیں مسلے بے قرار کر رکھا ہے۔ ہمارے کان تیری آواز سننے کے لیے بے تاب ہیں۔“ کہتے کہتے بادشاہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹی۔ بادشاہ نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے دیوانوں کی طرح کہا۔

”لڑکی! تو خوشی سے ہمارے قریب آ جا۔ ہم تیرے قدموں میں دولت کے ذخیرہ لگا دیں گے اور تیری ہر بات پر سر جھکا دیں گے۔“

مگر اس بادشاہی جواب نہ پا کر بادشاہ نے حیرت سے دیکھا۔ اتنا بے تاب وہ کسی بھی لڑکی کے لیے نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کچھ حیرت اور بے تالی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹی۔ وہ اس پر جھپٹنے کے لیے کچھ اور آگے بڑھا اور اس وقت تک ان دونوں کے درمیان صرف اتنا فاصلہ رہ گیا تھا کہ ایک ہی جھٹ میں بادشاہ اسے پکڑ سکتا تھا۔ اس کی حالت کبھی بھی جوا اپنے شکار کو بالکل نزدیک پا کر دیوانہ ہو جاتا ہے۔

ہوئی نے اس پر پوری طرح غلبہ پایا تھا۔ وہ بے قابو ہو کر ایک بار پھر جھپٹا اور قریب تھا کہ لڑکی کا قاب لوچ کر اسے قابو کر لیتا کہ خود اپنا قاب اٹھاتے ہوئے لڑکی پہلی بار بولی تو بادشاہ کو اس آواز اور چہرے نے چونکا دیا۔

لڑکی نے کہا۔ ”آپ یہ چہرہ دیکھنے کی تیار تھے ہی تو دیکھیں۔“ بادشاہ خریٹیں کا نشانہ بھر میں ہرن ہو گیا۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے شہزادی حور یا کھڑی تھی۔ وہ ایک تعجب سے سچ اٹھا۔

”جی ہاں!“ حور یا نے نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

دیا۔ ”اس بوڑھے عالم کی بیٹی کی عزت بچانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا جو آپ کی رعایا ہے۔ آپ کی حفاظت میں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بادشاہ قوم کا باپ ہوتا ہے اور آپ ایسے باپ ہیں جو خود اولاد کی عزت کو سننے ہیں۔“

☆ ☆ ☆

اس واقعے کے بعد جب شہزادی حور یا نے اپنی حکومت کا اعلان کیا تو کسی نے نہ پوچھا کہ شہزادی نے بادشاہ خریٹیں کو کس طرح مارا ہے۔ منجھرتے یا زہر دے کر؟ اب وہ ان کی ملکہ بھی جس نے جشن تاج پوشی کے بعد نئی زندگی کا آغاز کیا تھا اور انہیں امن و سکون اور عزت کا تعین دلایا تھا۔ یوں جہاں ہزاروں انسانوں نے اطمینان اور خوشی کی سانس لی، وہاں ایک ہستی مصر میں ایسی بھی تھی جو بے قرار و مضطرب تھی اور حور یا کی تاج پوشی اور اس جشن کو اپنی توہین سمجھ رہی تھی۔ یہ ہستی تھی شہزادہ ابراس بن اتریب!

بادشاہ خریٹیں کی ہلاکت اور شہزادی حور یا کی بادشاہت کا اعلان سننے کے بعد اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال آ رہا تھا۔ قوت اور مقابلہ..... اپنا حق حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ لہذا حور یا کے اعلان حکومت کے فوری بعد اہل مصر نے سنا کہ شہزادہ ابراس بن اتریب نے ملکہ حور یا کے خلاف بغاوت کردی اور کھان کے سپہ سالار جیرون سے مدد لی ہے۔

”مصر کی بادشاہت میرا حق ہے۔ میں اسے بہر صورت حاصل کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”میں ہر مقابلے کے لیے تیار ہوں۔“ ملکہ حور یا کا جواب تھا۔ اس فیصلے کے بعد مصر کی فوج ملکہ حور یا کی حمایت میں اور کھان کی فوج اور اس فوج کا سپہ سالار جیرون، شہزادہ ابراس بن اتریب کے ساتھ رہا۔ اعلان جنگ ہونے ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ لڑائی شروع ہوئی۔ اس دور کے دستور کے مطابق پہلے شخصی لڑائی ہوتی پھر باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔

ہر دو بڑی جاں بازی سے لڑا۔ دونوں طرف کے سردار بڑے اولوالعزم اور دلیر تھے۔ ایک جانب نماکش کے لیے شہزادہ ابراس مگر دراصل کھان کی بڑی فوج کا سالار جیرون تھا۔ دوسری جانب نوجوان، خوبصورت مگر حد

درجہ ہیں اور دلیر ملکہ حور یا تھی۔ دونوں جانب جنگ کا مکمل سامان موجود تھا، ہتھیار تھے اور جوش و خروش تھا مگر پہلے دن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ جو دلیر جنگ میں حصہ لے رہے تھے، وہ ٹپل کے بجٹے ہی اپنے ہتھکڑوں پر جا کر آرام کرنے لگے مگر جویش پسند اور صرف اقتدار کے دلدادہ دکھا دے کے لیے شریک تھے، اس وقت اپنے خیمے میں محسوس کر رہے تھے کہ شراب کے بغیر رات نہیں گزر سکتی۔

پہر رات کی اخیر ساعتیں تھیں۔ آسمان پر چمکنے والے ستارے تار کی کوٹ تو نہ سکتے تھے لیکن قریب کی چیزوں کو نمایاں ضرور کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک گھڑسوار بڑی آہستہ روی سے میدان کا پھر لگاتے ہوئے جیسے اپنی فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

یہ کھانی فوج کا سالار جیرون تھا۔ میدان کا چکر لگاتے ہوئے جو خیمہ وہ وسط میں پہنچا تو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا اس جانب گھوڑے پر سوار ایک عورت مصری فوج کا معائنہ کر رہی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں مطلق ویر نہ گئی کہ رات کے اس لمحے میں فوج کا معائنہ کرنے والی ملکہ حور یا ہے۔

گھڑسوار عورت چند قدم کا فاصلہ طے کر کے قدرے نزدیک پہنچی تو ستاروں کی مدد مدھم مدھم روشنی میں جیرون اسے دیکھتا رہ گیا۔ جیرون نے سنا تھا کہ حور یا کسی کی محبت پر یقین نہیں کرتی، کسی سے مرعوب نہیں ہوتی۔ اس کی ذہانت، علم اور بردہ کوئی کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ پھر اس نے سنا حور یا نے باپ کو موت کے گھاٹ اتار کر خود اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ہے۔

یہ سب سن کر اس نے اپنے ذہن میں ملکہ حور یا کا جو خاکہ بنایا تھا، یہ اس سے بالکل مختلف ملکہ تھی۔ جیرون نے اس خوبصورت اور روشن چہرے والی حسین لڑکی کو آنکھیں چپکا کر دیکھا اور جیسے سحر ہو کر رہ گیا۔ چند لمحے حیرت سے دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔

”خاکسار ملکہ مصر کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے۔“ ملکہ حور یا نے اسے دیکھا اور تعجب سے بولی۔ ”ہم کھان کے سپہ سالار معزز جیرون کا سلام قبول کرتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے سادہ لباس اور عام لوگوں کی طرح میدان میں آنے کے باوجود انہوں نے کیسے اعزازہ کر لیا کہ ہم ملکہ ہیں؟“ اس ذہانت پر جیرون متاثر ہو کر ہنسا اور بولا۔ ”اگر

بہی سوال ملکہ سے کیا جائے کہ ملکہ نے کیسے سمجھ لیا ہے کہ ہم کھان کے سپہ سالار ہیں؟“ ملکہ نے مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ”رات کے اس لمحے میں آرام کے وقت فوجوں کا معائنہ سپہ سالار ہی کر سکتا ہے۔ ہم نے اسی بنا پر آپ کو پہچان لیا۔“

جیرون ملکہ سے از حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے کئی بار ملکہ کو سرے پر تک دیکھا اور احترام سے بولا۔

”ملکہ عالیہ! اگرچہ بڑی کثافتی ہے مگر غلام یہ کہنے پر مجبور ہے کہ حضور کا حسن، نزاکت اور عراں بات کی اجازت نہیں دیتی کہ حضور یوں میدان جنگ میں تشریف لائیں۔“ ملکہ نے لکھنصر کو اسے دیکھا اور بولی۔ ”معزز جیرون! جب ہر طرف محاذ قائم ہو جائیں اور بہت سے لوگوں کی ضرورتوں کا احساس ہو تو کون کھران ہے جو میدان میں آ کر مقابلہ نہ کرے۔ ہم نے عرصے سے محسوس کیا کہ ہمارے حکمران اپنی غرض کے لیے کام کرتے ہیں۔ انہیں نہ اس سرزمین سے محبت ہے، نہ رعایا کی پروا۔ تب ہم اپنی ذات کو فراموش کر کے محض اس لیے میدان میں آئے ہیں کہ یہ سرزمین اور اس کے باشندے ہمارے ہیں اور انہیں ہماری ضرورت ہے۔“

اس ملاقات میں جیرون ملکہ سے بہت مرعوب ہو گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”ملکہ عالیہ! غلام آپ سے شفق ہے اور آنے والی صبح کھان کی افواج کو ملکہ مصر کے ساتھ دیکھے گی۔“ واقعی دوسری صبح کھانی اور مصری فوجیں متحد ہو چکی تھیں۔ اس دن شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے شہزادہ ابراس کو ملکہ حور یا کے دوہرہ لایا گیا تو وہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی شہزادی دلیچہ کو دیکھ کر متعجب رہ گیا۔ شہزادی دلیچہ نے کہا۔

”شہزادہ ابراس! آپ مجھے دیکھ کر یقیناً متعجب ہوں گے کیونکہ آپ کے خیال میں، میں آپ کے دیے ہوئے زہر کا شکار ہو چکی ہوں۔“

اس وقت شہزادے کی حالت دیگر کوں تھی۔ اس نے کہا۔ ”شہزادی دلیچہ! حقیقت یہ ہے کہ ابراس نے ہمیشہ آپ ہی سے محبت کی ہے۔ ہاں، تخت و تاج کے حصول کو وہ ہمیشہ سے اپنا حق سمجھتا رہا ہے اور اب بھی سمجھتا ہے۔“

مگر شہزادی دلیچہ نے بڑے ہی طنز سے لہجے میں جواب دیا۔ ”شہزادے اب دلیچہ بنت کوریش کی محبت پر یقین نہیں کر سکتی اور آپ کو ملکہ کے حوالے کرتی ہے۔“

اس نے اسٹین لیس اسٹیل کے ٹینکین ہولڈر کو آخری بار کپڑے سے صاف کیا اور پھر اس لڑکی کا جائزہ لیا جواب کاؤنٹر کے سامنے والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کی عمر اتنی نہیں تھی۔ شاید بائیس یا تیس سال۔ اس کی سبز آنکھیں کاہل اور مصنوعی پلکوں کے بوجھ تلے دلی دلی لگ رہی تھیں۔ اس کے مختصر بلاؤز کے ٹیٹن اس کے شباب کو چھپانے میں ناکامی کا اعلان کرتے نظر آرہے

اور آواز دے کر اپنے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور بھڑکیا لباس میں بیسوں وہ لڑکی جس طرح اندر داخل ہوئی، معلوم ہوتا تھا اس کے پیچھے کئی عفریت لگا ہوا ہے۔ شاید اس کا دلال۔ ہاں، برطانوی راج اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے لیکن وہ پریشانی نہیں چاہتی تھی جب تک کہ اسے پتا نہ ہو کہ اس کی تلاش میں کون اس کے کینے تک آسکتا ہے۔

بدفطرت

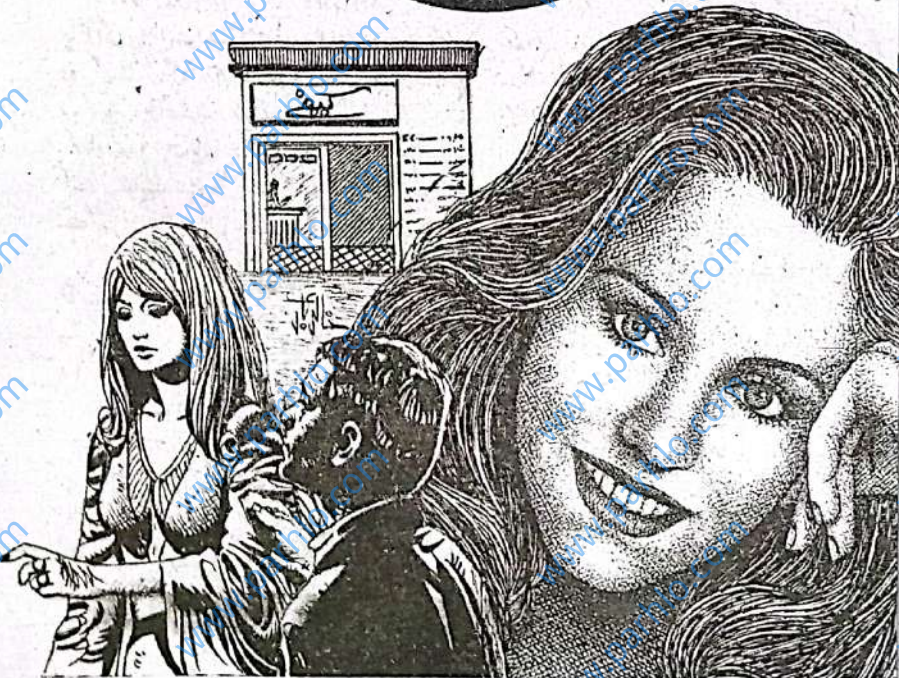
حادثہ نصیر

یہ بات تو جلد ہی برائی کا انجام ہمیشہ برائی پر ہوتا ہے... لیکن کچھ لوگ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں... برا کر کے اچھائی کنی توقع رکھتے ہیں... وہ بھی خود کو بہت عقلمند سمجھتی تھی لیکن قدرت نے اس کی سناری عقلمندی کو مندی عقل ثابت کر دیا۔

چہرے پر معصومیت کا نقاب ڈالنے والی

ایک بدفطرت حیلہ

کارنر ماسیاں



سے جیرون کی لاش برآمد ہوئی۔

ملکہ نے جیرون کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور باقاعدہ حکومت کرنے لگی۔ شہزادی ولیدیہ اب اس کی دست راست تھی۔ اس نے اپنی حکومت میں بہت سے قیصری کام کرائے۔ ظلم خانے کو وسعت دی، مصر کے اطراف واکثاف میں جاوہر گھیر کرانے، اسکندریہ کا منارہ بنوایا لیکن عجیب بات تھی کہ اپنی حکومت میں وہ بھی ظلم خانے نہیں گئی۔ یہاں تک کہ برسوں بعد ایک دن اسے معلوم ہوا کہ ظلم خانے کا داروغہ معدانوس بن وائل اپنی اس موروثی کی پرستش کرتے کرتے مر گیا ہے جس کی نمائش سے اس نے انکار کر دیا تھا۔

اس دن ملکہ نے حکم دیا۔ ”معدانوس کو پورے اعزاز کے ساتھ ظلم خانے سے باہر لایا جائے، ان کی ممی تیار کی جائے اور انہیں شاہی خاندان کی مہیوں کے ساتھ محفوظ کر دیا جائے پھر ان کی مہر و موروثی کی نمائش کی جائے۔“

اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ معدانوس بن وائل کے جسم کو محفوظ کر لیا گیا پھر ظلم خانے سے اس عجیب و غریب موروثی کو بعد احترام نکال کر ان کی نمائش کی گئی۔ ہزاروں افراد جو برسوں سے اسے دیکھنے کے تمنائی تھے، جلوں کی صورت میں جاتے اور عجیب ہو کر لوٹ آتے۔ ان سب کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔

”یہ موروثی تو ملکہ حوریا کی ہے۔ مقدس معدانوس زندگی بھر ان کی پرستش کرتے رہے۔“

بلکہ حوریا نے یہ جملے تو جیسے اسے سیکھ ہو گیا۔ اس دن اہل مصر توقع کر رہے تھے کہ اب ملکہ ظلم خانے میں جائے گی اور اس موروثی کا دیدار کرے گی مگر اگلی صبح ملکہ بیدار نہ ہوئی کیونکہ وہ ابدی نیند سو گئی تھی۔

جیرون بعد مصر کی نئی ملکہ ولیدیہ نے معدانوس اور حوریا کی مہیوں کو بھیجی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”ملکہ حوریا! عمر بھر تم محبت کے جذبے سے انکار کرتی رہیں مگر آج مان گئیں اور سچ کہو کیا تم نے محبت کا یقین آتے ہی جان نہیں دے دی؟“

اس وقت ملکہ کے بدل لب اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ ہار گئی ہے۔

اس کے بعد ملکہ حوریا نے اعلان کیا۔ ”شہزادی ولیدیہ نے اپنے مجرم کو ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ ہم اسے اپنے محسن جیرون کے حوالے کرتے ہیں۔ اگر معزز سپہ سالار جیرون ہمارا ساتھ نہ دیتے تو ہم یقیناً مقابلہ نہ جیت سکتے۔ اس کے ساتھ ہی ہم اہل مصر کے سامنے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے بعد بھی مصر پر کوئی مرد و عورت انہیں ہوگا بلکہ ہم شہزادی ولیدیہ کو ولی عہد نامزد کرتے ہیں۔“

لوگوں میں دیر تک ایک غلط فہمی اور داد و تحسین کا ہم جج ابھرتا رہا۔ اہل مصر بہت خوش تھے۔ مردوں کی عیناشیوں اور مظالم سے تنگ آکر وہ عورتوں کی حکومت کو قیمت جان رہے تھے۔

اس دن ملکہ حوریا نے اپنے محسنوں اور دلیروں کو انعامات تقسیم کیے اور بولی۔ ”معزز جیرون بھی انعام کے مستحق ہیں مگر یہ فیصلہ وہ خود کریں گے اور آج جو کچھ ہم سے مانگیں گے، ہم عطا کریں گے۔“

یہ اعلان سننے ہی کھائی فوج کا سپہ سالار بڑے ادب اور احترام سے جھکا اور بولا۔ ”ملکہ عالیہ نے انعام دینے کا وعدہ تو فرمایا ہے مگر یہ یقین نہیں دلایا کہ غلام اپنی حیثیت سے بڑھ کر بھی کچھ مانگ سکتا ہے۔“

مگر جیرون کا قہر مکمل ہونے سے قبل ہی ملکہ نے کہا۔ ”کیا کسان کا بہادر سپہ سالار ہماری فراخ دلی اور سخاوت پر یقین نہیں رکھتا؟“

جیرون عجیب سا گیا اور بولا۔ ”خضوع کی طاقت پر یقین ہے اسی نے غلام اپنی حیثیت سے بڑھ کر طلب کرنے کی بات کر دیا ہے۔ اگر حضور جان بخشی کا وعدہ فرمائیں تو عرض ہے کہ یہ کھائی سپاہی ملکہ سے محبت کرنے لگائے اور اب اسے قابل پرستش ملکہ کا ہاتھ درکار ہے۔“

اس دلیری اور جرأت کے مظاہرے پر مجمع جیسے سناٹے میں آ گیا مگر ملکہ وعدہ کر چکی تھی لہذا بولی۔ ”اگرچہ ہمارا شادی کرنے کا کوئی خیال نہ تھا مگر ہم معزز جیرون کو مایوس نہیں کریں گے۔“

اس مجلس کے بعد مصر میں دو اہم باتیں ظہور میں آئیں۔ شہزادہ ابراہیم کو سزائے موت اور ملکہ حوریا اور جیرون کی شادی۔ ملکہ حوریا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا مگر اسے مرد کی محبت پر یقین نہ تھا لہذا اگلی صبح اس کی خواب گاہ

ملاحظات:

تاریخ مصر، آرتھو باستانی، تاریخ مصر، صلیو حیان، ادوار گم گشتہ، یلدا بلار کی مترجم امین خاکانی

تھے۔ شارٹ اسکرت پرنیٹ کے موزے پہنے اس کے
 چروں میں لیور لاک بکس تھے۔ سنہری بالوں کی ہائی بوتی
 شکل بنائے اور انھوں کو سیاہ رنگ میں رنگے، اس کا ملبہ چیچ
 چیچ کر اس کا پیشہ بتا رہا تھا۔

الحال وہ ان سے منٹنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی کہ زمانے میں اس کی جی ہوئی چمکتی جلد اس وقت ان پھولوں کے مانند مٹی جو جڑوں کی طرف مائل ہو۔

اور کہاں پکائے، صفائی ستھرائی اور وینٹک ٹھیل کا سارا کام خود سنبھال لیا۔ اس نے اکاڈمک ٹینک کا ایک آن لائن کورس کیا اور بک ورک اور سرکاری فارموں سے مشا سیکھا۔ اور آدورز سمنے اسے مکمل طور پر ایک ون وومن شو تھا۔

ڈائمنز میں اس کے علاوہ بھی ایک عورت موجود ہے۔ وہ فوراً ہی اس کے پاس گئی۔ اس نے اسپنر کی جیب سے پتھر نکالا۔ ٹریسیا نے آنکھوں میں یکدم ہی ایک سرد پتھری کیفیت ابرو آئی تھی۔ ”آپ کا آرڈر؟“

”مجھے واپس جانے پر مجبور کر دو، پلیز!“ لڑکی کا دھیمے لہجہ سرگوشی تھا تھا۔ سبز آنکھوں میں خوف لیے وہ بھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ ٹریا کی نظر اس کے سیلے بلاؤز سے جھانکتے بازو کے نیچے پر مچی اور پھر راوک کی سمت۔ وہ اب بھی خاموش تھا۔

”تم تب تک یہاں روہ سکتی ہو جب تک اپنا کوئی دوسرا انتظام نہیں کر لیتیں پھر ہم دیکھیں گے کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔“

ٹریا کے اس اقدام پر راوک کی آنکھوں میں واضح سانس اُبھر آئی۔ ٹریا نے اندرونی خوشی محسوس کی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟ مجھے تمہارا نام معلوم ہونا چاہیے۔“ ٹریا کو اچانک خیال آیا۔

”لیری۔۔۔ لیری ٹریا۔“ کہتے ہوئے وہ اچانک ہاتھ پر چھوڑ کر اسٹول سے گرنے لگی۔ راوک ایک جھٹکے سے اپنے اسٹول سے اٹھا۔

”بہتر ہے کہ میں نائن ون ون کو کال کروں۔“ ٹریا بڑبڑائی۔ ”اسے پھیلے کرے میں لے جانے میں میری مدد کرو۔ ہم اسے میرے بیڈ پر لٹا دیں گے جب تک کہ ایسیو لینس نہیں آ جاتی۔“

”نہیں۔“ لڑکی بند آنکھوں سے کراہی۔ ”نہیں، ایسا مت کرنا۔ وہ مجھے ڈھونڈنے کا تو چھوڑے گا نہیں۔ پلیز! میرے پاس آج سارا دن کچھ کھانے کو نہیں تھا اسی لیے چکر آ گیا، بس۔“

”کینہ۔“ راوک غصے سے بولا۔ ”یہ کون حیوان ہے جس کے ساتھ تم رہ رہی تھیں؟“

راوک اس لڑکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر ٹریا کے کوارٹر میں لے آیا اور اسے نرمی سے بستر پر لٹا دیا۔

”مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس کوئی ہیلتھ انشورنس بھی نہیں ہوگی۔“ راوک اب دروازے میں کھڑا پریشانی سے لیری ٹریا کو گھور رہا تھا۔

ٹریا اپنے پر ہاتھ باندھے لیری کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اسے اس لڑکی کے رویے میں بہت سی باتیں ٹھنک رہی تھیں جیسے جب ٹریا نے اس کا نام پوچھا تو وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی جیسے سوچنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر کمرس ٹری کو دیکھ کر اس نے جھٹ سے اپنا نام بتایا۔ ٹریا جیسے کہہ سکتی تھی کہ اس کا اصلی نام نہیں تھا مگر وہ اپنی یہ سوچ راوک کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیری ٹریا کا حلیہ

واضح تھا۔ وہ کوئی درجن میری نہیں تھی۔ یہ بات تو راوک جانتا ہوگا مگر اس وقت اسے وہ لڑکی صرف ایک مصیبت اور مظلوم دکھائی دے رہی تھی تو ٹریا درمیان میں مداخلت کر سکتی تھی۔ فی الحال اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔

”تمہیں اچھے کھانے کی ضرورت ہے اور کوئی ایسا جہاز یا خیال رکھ سکے۔ تم جب تک چاہو یہاں آرام کر سکتے ہو۔“ ٹریا نے مضبوطی سے کہا۔

”اوہ، میڈم! میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔“ لڑکی خوشی سے مسکرائی۔

اگر ٹریا کو کوئی شبہ تھا بھی کہ وہ صحیح کر رہی ہے یا غلط راوک کو اپنی طرف عقیدت سے دیکھتا پھر اس کے سارے واسطے ہوا ہو گئے۔

”تم بہت اچھی ہو رہی! وہ واقعی سنا تھا۔“ ٹریا کے چہرے پر سرخی چھائی۔ ”یہ کم سے کم ہے میں کر سکتی تھی۔“

وہ دونوں کمرے سے نکل کر کینے میں آئے۔

”مجھے لگتا ہے کہ مجھے اب جانا چاہیے۔ بس موبائل کو ایک نظر دیکھ لوں۔“

”لیکن تم نے کھانا نہیں کھایا۔“ ٹریا نے غصے سے دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ میری بیوی کو ختم ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا بیوا نکالا اور سو ڈالر کے دو ٹیٹل نکال کر ٹریا کے حوالے کر دیے۔ ”اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو شاید اس سے کچھ مدد ہو جائے۔ پتا نہیں وہ اپنے اسپتال کے اخراجات کا کیا کرے گی۔“

ٹریا نے رقم کی طرف دیکھا اور پھر راوک کی طرف۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک مظلوم اور کمزور لڑکی کے لیے ٹکرمند ہے۔

وہ گلاس ڈور کھولنے لگا پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ راوک کا ہاتھ اس کے شانے پر آٹھما تھا۔ ٹریا کا دل کسی کوئی لڑکی کی طرح دھڑک گیا۔ راوک نے پہلے بھی اسے نہیں چھوڑا تھا۔

”تم نے اس لڑکی کی مدد کر کے بہت اچھا کیا۔“ ٹریا! مجھے تم پر فخر ہو رہا ہے۔“

خوشی کے بارے میں اس نے شرماتے ہوئے ناکل کے فرش کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے سر اٹھایا۔ ”میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ ایسا کوئی ہے جس سے ہوگا جو ایک مجبور مصیبت زدہ لڑکی کو مزک پر مرنے کے لیے چھوڑ دے۔“ اس نے کہا۔

”اور اس کے بچے کو بھی۔“ راوک آہستہ سے بولا۔

☆☆☆

لیری ٹریا کو کافی چیز سے سخت یاب ہوئی تھی۔ وہ جوان تھی اور ٹریا جانتی تھی جو ان لوگوں کو شکیبائی کے لیے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ بس خود اس پر یقین اور چند نامنر۔ اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے لیری کو ان دو سو ڈالر کے بارے میں بتا دیا جو راوک نے اس کے لیے دیے تھے اور لیری نے فوراً ہی اس کا مطالبہ کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اسے اپنے پیلے میڈیکل اپائنٹمنٹ کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ وہ صبح ٹریا کے پرانے فورڈ میں لگی اور بارہ گھنٹے بعد نشے میں دھت ہو کر واپس آئی۔ چہرے پر ہنوز گھٹیا ایک اپ کیے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں دو شاہجنگ بیکز تھے۔ ایک میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے پلاسٹک کی بالیاں نکالیں جو روشنی میں رنگ بدلتی تھیں اور ایک گلابی کرلز کے ساتھ بہری بالوں کی وگ نکالی۔ اس میں ٹریا کو کہیں بچوں کے کپڑے نظر نہیں آئے۔

”میڈیکل اپائنٹمنٹ کیسی رہی؟“ ٹریا نے سر دلچسپی میں پوچھا۔

”ویل، ایک مڑے کی بات بتاؤں گرینڈ ماں! اس کینے بڑے محسوس ڈاکٹر نے میڈیکل انشورنس کے بغیر مجھ سے بات کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ ہے نا شرم کی بات۔ اس کے لیے کوئی قانون ہونا چاہیے۔“

ٹریا کے گال غصے سے جھڑک اٹھے۔ اس بچے طوائف نے اسے دادی ماں کہا۔ ”لیکن یہ جاننے کے لیے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں کہ تمہیں پریشانی میں شراب نہیں پینی چاہیے۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں۔“ اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔

”نہیں۔“ لیری نے طنز کیا۔ ”میرا بے بی کافی مضبوط ہے۔“ اس نے اپنا پیٹ تھپتھپایا۔ ”اسے شراب پسند ہے اور سگریٹ بھی۔“ اپنا ناپا پس ٹٹولتے ہوئے سگریٹ پیکنٹ اور نیا لائٹر نکالا اور سگریٹ جلاتے ہوئے دھواں ٹریا کے چہرے پر اڑا دیا۔

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ جھوٹی۔۔۔ کیتا۔“ ٹریا نفرت سے بڑبڑائی۔

”بس بھی کرو دادی ٹریا! اگر اس نیک دل راوک ڈی کیلیب نے تمہیں اپنی جھوٹی لیری سے ایسی ظالمانہ باتیں کرتے سن لیا تو کیا سوچے گا؟“ وہ اب واضح طور پر اس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔

ٹریا کا دماغ جلنے لگا۔ غصے کے باعث اس کے

پورے جسم پر لرزہ سا طاری ہوا۔ اسی وقت ان دونوں نے راوک کے ٹرک کا بارن سنا اور جب وہ لاٹ میں داخل ہوا، لیری اگلے ہی پل اس کا استقبال کرنے کو دروازے سے باہر نکلی۔

وہ چھوٹی بی آج پھر کہیں سے نکل آئی تھی۔ راوک نے جھک کر اس پر ہاتھ پھیرا تو لیری سرعت سے اس کے پاس پہنچی اور کھینچ کر اس کی پیٹ کے بچے کو اپنی ہاتھوں میں اٹھالیا۔ یہ منظر کافی دلکش تھا جس میں لیری ایک نرم دل اور ہمدرد لڑکی نظر آ رہی تھی۔

کچھ دیر بی کے بچے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد لیری نے ایک بار پھر جھک کر اسے زمین پر چھوڑا۔ اس طرح جھٹکے ہوئے اس کے کشادہ گریبان سے جھانکتے اس کے شباب کے نظارے اسے حلقور تھے کہ اگر کوئی اس سے نظر چراتا تو وہ انسان نہ ہوتا۔ راوک بھی یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ جم سا گیا۔

دور کھڑی ٹریا یہ سب دیکھتے ہوئے بچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ قسم کھا سکتی تھی کہ لیری نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔

ٹریا نے گھوم کر تازہ کافی کا گگ کاؤنٹر پر دیکھا۔ جب وہ دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے، ٹریا نے راوک پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر ایسی جاندار مسکراہٹ تھی جو ٹریا نے اس سے پہلے بھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

لیری تیزی سے ٹریا کے پاس آئی اور آرڈر پیڈ چھین کر ہاتھ میں پھسل لیے راوک کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بالکل ٹریا کی طرح۔

”دادی ٹریا نے مجھے بتایا کہ وہ پیسے آپ نے دیے تھے۔“ لیری نے آہستہ سے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ آپ کو معلوم ہو کہ میں نے وہ پیسے کچھ ڈائریز، کمبل اور بچے کے کپڑوں پر خرچ کیے۔ جن کی ضرورت پڑے گی۔“

ٹریا کی روح تڑپ اٹھی۔ اس بار لیری نے راوک کے سامنے اسے دادی کہا تھا۔ ”جھوٹی کیتا۔“

”مدد کر کے خوشی ہوئی۔“ راوک خوش دلی سے بولا۔

”ڈاکٹر سے ملاقات کیسی رہی؟“

”یہ نہیں ہوا۔“ لیری نے چہرے پر اداسی طاری کی۔

”اس نے کہا میری میڈیکل انشورنس کے بغیر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا۔“ لیری نے آنکھوں کو یوں مسلا جیسے آنسو چھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”لیکن تم میری فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔ جب ڈیجیٹری کا وقت آئے گا تو میں

صرف ادریسی روم میں جاؤں گے۔ ویسے بھی اس وقت وہ مجھے نکال تو نہیں سکتے۔“ کہتے کہتے اس کی آواز کا پ گئی۔

اب آسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔

سہارے کے لیے اس نے کاؤٹر سے ٹیک لگائی۔ ”مجھے لگتا ہے میرا بچہ بھی باہر بڑے اس بلی کے بچے کی طرح ہوگا جس کا ذہن کوئی نام۔“

ٹریا کی سانس رک گئی جب اس نے رادک کی آنکھوں میں ہلکی سی ابھر کر معدوم ہوتے دیکھی۔

”میں اپنے بچے کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتی۔“ لیزی نے آہستہ سے سر ہٹائی۔ ”لیکن میں اس بلی کے بچے کے لیے ضرور کچھ کر چاہوں گی۔ ہاں، میں اسے ایک نام دے سکتی ہوں۔ اپنا نام۔ کیا خیال ہے؟ میں اسے کئی لوہے بنا سکتی ہوں نا؟“ اس کا سینہ لرز رہا تھا۔ وہ بھرپور کوشش کر رہی تھی سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے اپنی جذباتی کیفیات آشکار کرنے کی۔

”اوہ گاڈ! رادک نے کہا۔“ کوئی تو معقول طریقہ ہوگا تمہاری مدد کرنے کا۔“

”اب تم میرے لیے پریشان مت ہو۔ وادی ٹریسی مجھے برف میں تو نہیں پھینکنے والی اور تم نے..... تم نے بہت مدد کی۔ پتا نہیں میں تمہارے بنا کیا کرتی۔ کاش، میرے بچے کا باپ بھی تم جیسا ہوتا لیکن میں چاہتی ہوں کہ کم از کم میرا بچہ تم جیسا ہو۔ مضبوط اور مہذب۔“

ٹریا خوفزدہ اپنی جگہ سن کھڑی تھی۔ اسے اپنے ہی کہنے میں اپنا آپ مہمان محسوس ہو رہا تھا کیونکہ اسے گفتگو میں شامل ہونے پورے تین منٹ ہو چکے تھے اور اس دوران اس بدکردار لڑکی نے ٹریا کو رادک کے ذہن میں وادی کے اور اسے بچے کے متبادل باپ کے طور پر تصور کر کے ایک تصویر بنائی تھی۔

”مہل میں، میں تم سے پوچھنے والی تھی۔“ لیزی رک کر ڈراپنگ پائی۔ ”کیا تم میرے بچے کے گاؤں فادر ہو گئے؟“

رادک نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم اور آواز دھیمی تھی مگر اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ ”مجھے خوشی ہوئی لیزی! میں کوئی زیادہ اچھا آدمی نہیں لیکن میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔“

ٹریا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سینے میں قیروم کھوپٹی سانس کو خارج کیا۔

☆☆☆

”میں ایک ڈاکٹر کو جانتی ہوں۔“ ٹریا اس وقت

فرش رگڑ رہی تھی جب اس نے یہ اعلان کیا۔ اس کی آواز ساٹھ سی جیک لیزی صوفے پر پاؤں پھیلائے، ریمورس ہاتھ میں لیے دی دیکھنے میں لگ گئی۔ اس نے سنا بھی نہیں ٹریا نے کیا کہا تھا۔

ٹریا نے چند لمحے تو انتظار کیا پھر اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر تیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے کہا کہ میں ایک ڈاکٹر کو جانتی ہوں۔“

”تو کیا؟“ لیزی نے بھوس اچکا گیا۔

”ایک ایسا ڈاکٹر جو تمہیں اس بچے سے چھٹکارا دلانے گا۔“ ٹریا نے یہ کہتے ہوئے اپنے بازو اپنے سینے پر باغیچہ لیے کہ کہیں اندر اگلے غصے سے وہ اسے جھانپ نہ دیر کر بیٹھے۔

لیزی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”ادامیگی میں کروں گی۔“ ٹریا نے کہا۔ ”وہ ایک مستعد اور قابل بھروسہ ڈاکٹر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنا منہ بند رکھتا ہے۔“

لیزی ہنسی اور پھر ہنسی چلی گئی۔ ”کیا..... کیا کہا تم نے؟ چھٹکارا دلانے گا؟ کیوں بوڑھی لکھتا..... تجھے ذہن میں یہ بات آئی بھی کیسے؟“ ہنسنے ہنسنے اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

”اس میں کون سی بڑی بات ہے۔“ ٹریا کہنا چاہتی تھی کہ پیشہ ورانہ عموماً غیر متوقع طور پر پریکٹس ہونے کے بعد آن چاہے بچے سے اسے اس طرح چھٹکارا حاصل کرتی ہیں مگر تب ہی اسے احساس ہوا کہ لیزی نے اسے کیا کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اس کا دل ڈوب گیا۔

لیزی کو کہے پتا کہ وہ ماضی میں کیا کرتی رہی تھی؟ کیا اس نے صرف ٹھکانا لگایا تھا یا پھر اطراف میں ٹریا کی کسی پرانی جاننے والی نے اسے ٹریا کے بارے میں بتا دیا؟

”اوہ گاڈ! رادک کو یہ پتا نہیں چلتا چاہیے۔ کبھی بھی نہیں۔“ ٹریا سوچ کر ہی لرز گئی۔ اس نے سوچا۔ وہ بچے کی وجہ سے لیزی کے ماضی کو نظر انداز کر رہا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ ٹریا کو کبھی یہ رعایت دیتا۔

لیزی بس اس کی حالت سے مزے لیتی رہی اور پھر ریموٹ اٹھا کر نئی دی پھر سے چلا دیا۔

اسی لمبے اچانک ہی ٹریا پر مشکف ہوا کہ کوئی بچہ تھا ہی نہیں۔ لیزی حاملہ نہیں تھی۔ وہ بس انہیں بے وقوف بنا رہی تھی۔ رادک اور ٹریا جو بڑی آسانی سے اس کی چال میں آ گئے تھے۔ وہ دونوں درحقیقت عالمی معیار کے اسحق

ثابت ہوئے تھے۔

ٹریا لڑکھا کر کمرے سے نکل آئی۔ اسے اب کچھ سوچنا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن ٹریا نے اس بلی کے بچے کے لیے ایک برتن میں دودھ ڈال کر لیزی کو دیا اور خود کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگی۔

لیزی نے بچوں کے بل بیٹھے ہوئے بلی کو پکارا۔ اس کی تند آواز میں نرمی منظور تھی۔

وہ چھوٹی بلی برتن دیکھتے ہی کلا نہیں بھرتی اس طرف آئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ برتن کو منہ لگائی، لیزی نے برتن پیچھے کرتے ہوئے اس کے سر پر ایک چپت ماری۔

بلی نے پھر برتن کے پاس آنے کی کوشش کی۔ اس بار لیزی نے اسے دور دھکیل دیا۔ وہ بلی کی بھوک اور بے چینی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے برتن کو بلی کی پہنچ سے دور کرتے ہوئے اس کے سر پر کئی بار پھینکا مارا۔

بلی نے ہلکی سی میاؤں کی آواز نکالی اور لیزی کے بازو میں دانت گاڑ دیے۔

لیزی نے چلا کر ہاتھ جھٹکتے ہوئے اسے گالی دی اور برتن ہاتھ میں لیے اچھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ سامنے ڈور ڈریم کینے کی طرف تھا۔

یہ منظر دیکھ کر ٹریا بے چین ہو گئی۔ اسے سمجھ نہیں آیا لیزی وہاں کیا کرتے تھی۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ ٹوکوں اور ٹریلوں کے انجن میں ڈالنے والے اس اسٹریٹ فریز کے ساتھ واپس آئی تھی۔

بلی قریب ہی تھی جب لیزی نے وہ سرخ رنگ کا مخلول دودھ میں اندھا۔ مصوم بلی اپنے انجام سے بے خبر بے تانی سے دودھ کی طرف لپکی اور اس بار لیزی نے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

ٹریا ہماگ کر جانا چاہتی تھی۔ چلا کر اس بلی کے بچے کو خبردار کرنا چاہتی تھی مگر وہ بلی کا بچہ تھا انسان کا نہیں جو اس کے چلانے پر متوجہ ہوتا۔

وہ غریب بلی کا بچہ ایک کھٹے کے اندر اندر کافی اذیت ناک موت مرا تھا۔

شام کو جب رادک واپس آیا تو لیزی نے بلی کے اکرے ہوئے جسم اور بچے آنسوؤں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

”کسی نے اسے زہر دے کر مار ڈالا۔“ وہ ہچکیوں

کے درمیان بولی۔ ”میرا پیارا بلی کا بچہ..... اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ یہ دنیا..... ایک بلی کے بچے کو بھی بڑا ہونے نہیں دیکھ سکتی تو سوچو میرے بچے کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دنیا اس قابل ہے کہ یہاں کسی بچے کو جسم دیا جائے؟“ وہ کمال کی ادا کا رہ گئی، بچے آنسوؤں اور کاپتی ہوئی آواز کے ساتھ بھرپور جذباتی انداز میں۔

”یا خدا! مجھے صبر دے۔“ ٹریا نے اپنے احتجاج کو دباتے ہوئے دعا مانگی۔ وہ چاہتی تو لیزی کی پول کھول سکتی تھی مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ لیزی ایک بار پھر رادک کے سامنے اس کے ماضی کے دنوں کا کوئی باب کھولے۔ ٹریا کو اس وقت خود سے نفرت ہو رہی تھی۔

لیزی روتے روتے رادک کے چوڑے سینے سے ٹکرائی اور رادک اس کے گرد بازو حاصل کر کے اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

ٹریا نے اپنے بڑھتے ہوئے غصے کو اپنے چہرے سے دور رکھنے کے لیے نظروں کا زور بے بدل لیا تھا۔

”ٹھیک ہے ڈیڑا! ہمیں اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ڈرا اپنے بچے کے بارے میں سوچو۔“ رادک اسے پیار سے ہتھ مارا تھا۔

”پتا نہیں میں تمہارے بغیر کیا کرتی۔“ اس کی سسکیاں نکلتی تھیں۔

”خوش.....! رادک نے آہستہ سے اس کی نکیلی ٹھوڑی اٹھائی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں تمہیں کیسے بہتر محسوس ہوگا۔ کیونکہ ہم اس پیاری بلی کو ایک باقاعدہ فیوزل دیں۔ اس کی ہمیں تدفین کریں؟“

”اوہ، یہ بہت اچھا ہوگا۔“ لیزی ایک بار پھر جذباتی ہو کر رو دی۔

”ہاں، یہ اچھا آئیڈیا ہے۔“ ٹریا نے خشک لہجے میں کہا۔ ”ہم اسے ڈاکٹر کے باہر ہاں دفن کر سکتے ہیں جہاں زمین نرم ہے۔“

”لیکن ہمارے پاس اسے ڈالنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“ لیزی نے کہا۔ ”کاش، میرے پاس ایک چھوٹا باکس یا کچھ اور ہوتا۔“

”میرے پاس ایک بہت اچھا اسکارف ہے۔“ ٹریا نے کہا۔ ”میری ماں نے اس کی کڑھائی صرف میرے لیے کی تھی۔ ہم اسے اس میں لپیٹ سکتے ہیں۔“ درحقیقت یہ اسکارف ٹریا نے ایک پرانی دکان سے خریدا تھا اور اس کی ماں نے زندگی میں اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے کوئی چیز

نہیں بنائی تھی مگر اس وقت لیزی کی مکاری کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کوئی بھی بھوت بول سکتی تھی۔

”میں ایک بچہ لے کر آتی ہوں۔“ فریسا نے سر دھجے میں کہا۔

راؤک نے کافی تیزی سے وہ زمین کو دو کر ایک گڑھا تیار کیا اور زنی سے غل میں لپٹی بلی کو اس قبر میں اتار دیا۔ وہ تینوں ایک منٹ کے لیے اس قبر کے گرد خاموش کھڑے رہے مگر راؤک دھڑکے سے دعا کا لفظ بدلتے لگا۔

”مجھے افسوس ہے سوئی کہ ہم اس کے لیے کسی باکس کا انتظام نہیں کر پائے۔“ راؤک نے جاتے جاتے کہا۔

اور فریسا لفظ ”سوئی“ پر کانپ کر رہ گئی۔

☆☆☆

راؤک تین دن بعد واپس آیا تھا۔ فریسا نے گلاس وال سے انہیں پارکنگ میں دیکھا۔ وہ اور لیزی نوئل ہاتھوں میں ہاتھیں ڈالے اندر آ رہے تھے۔

”ہمارے پاس آپ کو بتانے کے لیے کچھ ہے۔“ لیزی نے اندر آتے ہی جھپٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں کافی دنوں سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔“ راؤک نے کہا۔ ”اور اب ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ بات سب سے پہلے ہمیں بتا چلتی چاہیے۔“

لیزی ہلکھلائی۔ ”کیونکہ آپ میری اور راؤک، ہم دونوں کی واحد باقی دوست ہیں۔“

فریسا ساکت ہوئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے کیا بتانا چاہ رہے تھے۔

”لیزی شیک ہمتی تھی، تم جانتی ہو۔“ راؤک نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کے بن باپ کے بچے کو یہ دنیا کوئی موقع نہیں دے گی۔ اس معصوم بلی کی موت نے یہ ثابت کر دیا۔ اسی لیے میں نے مس لیزی کو شادی کی پیشکش کی اور

مس لیزی نوئل نے مجھ سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ میں اس کے بچے کو اپنا نام دوں گا۔“

”اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری میڈ آف آنز بنیں۔“ راؤک نے کہا۔ ”لیزی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

فریسا کا دل چاہا وہ لیزی کے منہ پر چھڑوں کی بارش کر دے، اس کے بال توچے، اس کے چہرے پر گرم کافی چھیک دے لیکن اس نے کہا تو صرف اتنا۔

”مجھے لگتا ہے کہ اس خوشی کے موقع پر میں ایک نیا لباس ضرور خریدوں گی۔“

”اور اس کی بیوی کے طور پر کتنی میرے ہیلو

انٹورس کی ادائیگی کرے گی۔“ لیزی نے کہا۔ ”اور لاؤس انٹورس۔ اگر میرے شوہر راؤک ڈی کیلیب کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آیا تو میرا پورا خیال رکھا جائے گا۔“

بے آواز، فریسا صرف سر ہلا سکی۔ وہ ان گندے برتنوں کو گور رہی تھی جنہیں اس نے دھو یا نہیں تھا۔ ایک ڈالر کی ٹپ گندی پلیٹ کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔ بیکس اور انڈوں کی شدید بو اسے اس کا جی اٹھانے لگا۔

فریسا جانتی تھی کہ لیزی کے لیے اس شادی کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ جانتی تھی کہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ لیزی کو صرف راؤک کی لائف انٹورس پالیسی سے مطلب تھا اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ فریسا کو اب لیزی کی بد فطرتی کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔

راؤک ڈی کیلیب، فریسا کا محبوب، کیا ایک لاش میں بدلنے والا تھا؟ فریسا سوچ کر ہی لرز گئی۔ اس نے لیزی کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔

اگلے تمام ہفتے فریسا کے ذہن میں جنگ چھڑی رہی۔ اس نے حالات کا تجزیہ کیا اور سوچا، کیا وہ پولیس کو بلا دے؟ مگر وہ انہیں کیا بتائے گی کہ اسے ڈر ہے کہ لیزی کی کیا کر سکتی ہے؟ وہ صرف اس گفتگو کا تصور کر سکتی تھی۔

کیا وہ راؤک کو بتائے؟ لیکن یہاں وہ پہلے سے ہی جانتی تھی کہ کیا ہوگا۔ لیزی صاف کرتے ہوئے اسی پر الزام دھروے گی کہ وہ اس سے جلتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ راؤک کے سامنے اس کا بدنام ماضی بھی بنے قلاب کر دے۔

فریسا کو احساس ہوا کہ اب راؤک کو بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور اسے یہی کرنا تھا۔

فریسا لیزی کا پلندہ یہ طریقہ تھا۔ بہت اچھے۔ تو اس بار بھی زہری استعمال ہوگا۔ فریسا نے عزم باعنا دیا۔

وہی بھی آدھا وقت تو لیزی فٹے میں دھت رہتی تھی۔ فریسا کے لیے یہ کہنا زیادہ مشکل نہیں تھا، اگر وہ اس کی شراب کی بوتل میں اینٹی فریز ملا دے۔ وہی اینٹی فریز جس سے اس نے اس معصوم بلی کے بچے کی جان لی تھی۔

فریسا نے دروازے میں کھڑے ہو کر فریسا کی نظر سے اس عورت کی طرف دیکھا جو اسے قاتل بنا رہی تھی۔

لیزی صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ انداز میں بے فکری نمایاں تھی۔ آج راؤک کے آنے کا دن نہیں تھا اس لیے بھی وہ اپنا بیجان خیز آدھا اور مختصر لباس پہنے سامنے والے ڈورڈریم کینے کی طرف جانے کی تیاری میں تھی۔

اس کا جسم نہیں سے بھی ایک حاملہ عورت کا جسم نہیں لگ رہا

تھا۔ لیزی بھی یہ بات جانتی تھی اسی لیے وہ جب راؤک کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ اپنا میٹری امبوک ڈریس پہن لیتی اور اس کے نیچے اپنے پیٹ پر بڑھنگ چڑھا دیتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے فریسا سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ راؤک کے سامنے اس کی پول کھول سکتی ہے۔

فریسا اپنے رہائشی کوارٹر میں واپس آئی۔ قاتل..... کیا وہ واقعی قاتل پر غور کر رہی تھی؟

مگر لاش کا کیا؟ اسے اچانک بلی کی تازہ قبر کا خیال آیا۔ اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

وہ بلی کی قبر کو مزید گہرا کر کے لیزی کی لاش کو پلاسٹک شیٹ میں لپیٹ کر اس میں پھینک دے گی۔

ہر مسئلے کا حل تھا۔ اس کے باوجود فریسا کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ زبردستی کے مارچ پر ہوا اور اس کا ہر ایک قدم ایک پہاڑ کی سمت جا رہا ہو۔

راؤک کو مطمئن کرنے کے لیے بھی اس نے کہانی سوچ لی تھی۔ وہ بے چارہ پہلے ہی اپنے اور لیزی کے عموں کے فرق کے باعث کچھ کھیا سب کا شکار تھا۔ اسے قاتل کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ لیزی کی اور کے ساتھ جھگڑ گئی۔

فریسا نے اپنی کینٹیناں دیاں۔ اس کی آنکھیں نیند کی کمی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے کل کے دن اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اسے کافی ٹال چکی تھی۔ اگلے تین دن تک راؤک کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور فریسا کی تیاری مکمل تھی۔

اس نے بلی کی قبر کو گہرا کیا اور لیزی کے دو ڈاکس میں اینٹی فریز ملا دیا۔

مگر پھر..... اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

یہ شام کا وقت تھا جب فریسا دیگر گاہکوں سے فارغ ہو کر لیزی کے انتظار میں تھی۔ اس کا کافی کا کپ پکڑا ہوا ہاتھ کانپ گیا جب اس نے گلاس وال کے پار لیزی کو سامنے والے ڈورڈریم کینے کی۔ پارکنگ میں کھڑے ٹرک میں چڑھتے دیکھا۔ اسی وقت بیرونی دروازہ کھلا اور راؤک اندر داخل ہوا۔ فریسا نے بے اختیار ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

راؤک حیران نظر آیا۔ اس نے انہی تک لیزی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے کا ڈبوئے جوتوں کا ایک چھوٹا جوتا اپنے رکھتے ہوئے اس نے فریسا کی طرف دیکھا۔ ”بچے کے لیے۔“

”وہ سامنے ہے۔“ فریسا نے سرکش کی۔ باوجود

کوشش کے اس کی آواز نہیں نکل پاری تھی۔ ”سڑک کے اس پار۔“ وہ آخر کار کامیاب ہو گئی۔ ”وہ بلی کے اس پار ہے۔“

راؤک ایک لمحے کو ساکت ہوا پھر اس نے پلٹ کر دیکھا اور اگلے ہی لمبے وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

فریسا اسے ڈھلتی شام کی روشنیوں میں دیکھ سکتی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ وہ اس ٹرک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

لیزی نوئل جب ٹرک سے نیچے اترتی تھی تب ہی اس کی نظر راؤک پر پڑی۔ وہ اپنے اسی مخصوص مختصر اور دایا بیات لباس میں تھی۔ لمبی ٹانگوں سے چمکی چلتوں، وسیع گریبان والا

ٹاکائی ساٹاپ جس سے اس کا چپٹا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ پہلے پہل اس کی آنکھوں میں خوف اور بے یقینی ایک ساتھ ابھرے۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ راؤک اس طرح اچانک ہی چھاپا مار سکتا ہے۔ اس کی آمد غیر متوقع تھی کیونکہ آج اس کے آنے کا دن نہیں تھا۔

راؤک اپنی جگہ جم کھڑا تھا۔ اس کے بازو اس کے پہلو میں بے بسی سے لٹک رہے تھے۔ یہ کتنا مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے کون اس وقت زیادہ بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔ لیزی اچانک راؤک کو اپنے سامنے دیکھ کر یا پھر راؤک اس کا یہ روپ دیکھ کر۔

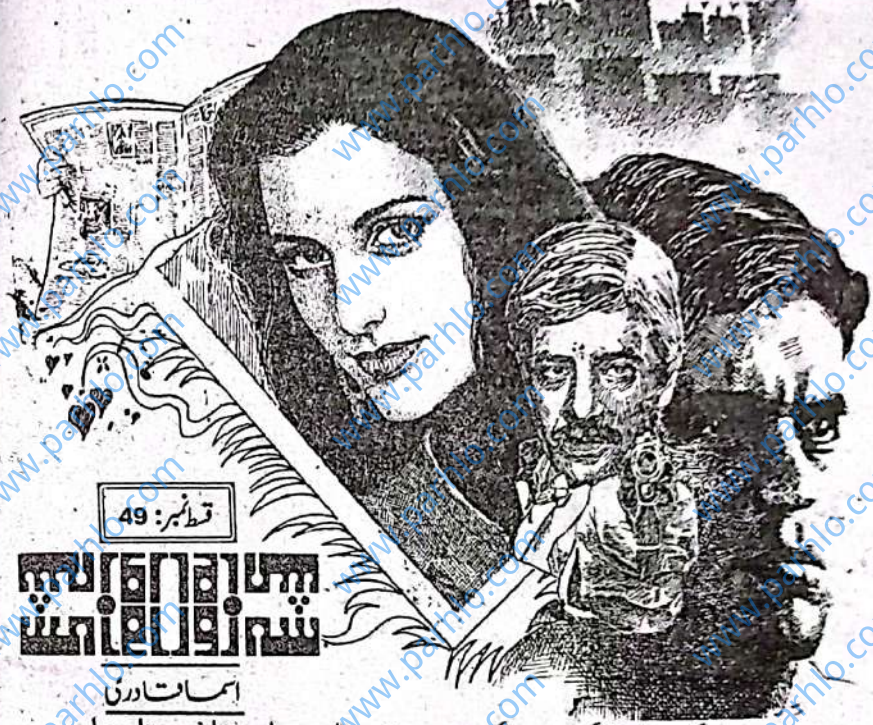
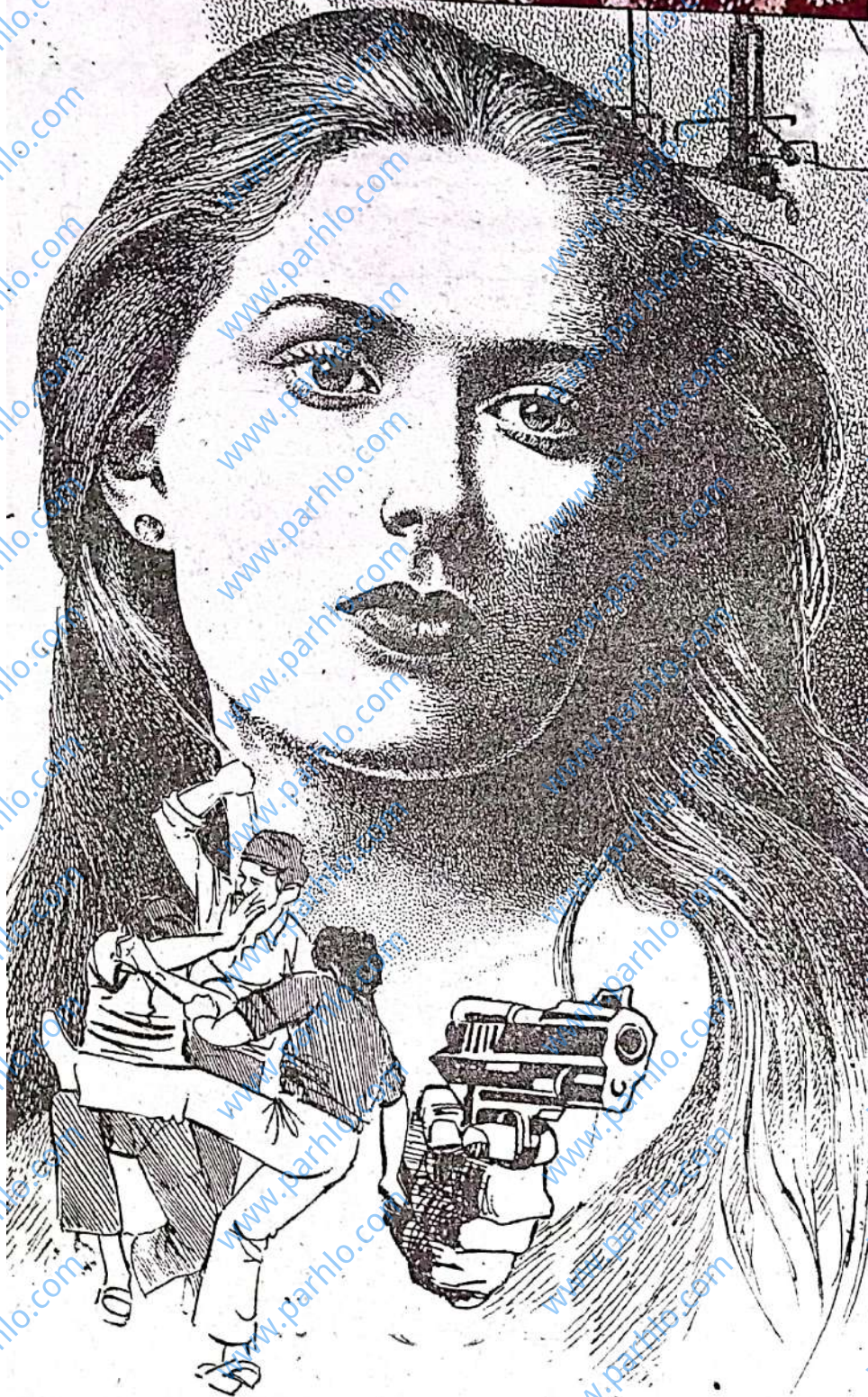
مگر وہ لیزی تھی۔ اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ پانسا پلٹ چکا تھا۔ اب نہ کسی وضاحت سے بات کہنی گئی نہ مگر مجھ کے آنسوؤں سے۔ اسی لیے ایک مکارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اس نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راؤک کو انگلی دکھائی اور ڈورڈریم کینے میں غائب ہو گئی۔

ایک گہری سانس بھرتے ہوئے فریسا نے چھوٹے جوتے اٹھائے، لیزی کا سامان اکٹھا کیا اور باہر رکتے کچرے کے ڈبے میں پھینک آئی۔

اس کی آنکھوں میں شکرگزاری کے آنسو تھے۔ وہ قاتل بننے سے بچ گئی تھی۔ لیزی نام کا ڈورا نا خواب ختم ہو چکا تھا۔ اب اسے بھی لیزی نوئل کی شکل نہیں دیکھنا پڑے گی۔

اور راؤک..... وہ جانتی تھی کہ اس میں کچھ وقت لگے گا لیکن وہ سنبھل جائے گا۔ کچھ ایسے کتن کر، ہائی وے کی میلوں کی ریت چھان کر، چند آنسو بہا کر، راؤک پھر سے پہلے والا راؤک بن جائے گا۔

اسے یقین تھا۔



قسط نمبر: 49

سہ ماہی نامہ

اسات ارن

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندو تیز آندھیوں نے اسے محض سرایا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فتنوں حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنوں، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمٹ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر تہمتیں کرنا زل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تیراگیز داستان

بھارتی فوجی اپنے سپاہی کے قاتل کی تلاش میں
بجائیں کی وکان تک آگئے تھے۔

”جیسو! کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“
بجائیں جواس نے بھی پہلے ان لوگوں کے استقبال کے لیے
کھڑا ہو چکا تھا، عاجزی سے پوچھنے لگا۔

”خدا کون ہے تمہارے ایسا ملازم؟“ درشت
لہجے میں کیا گیا سوال جہاں اس کی ریزہ کی ہڈی میں
سناٹا ہوتا تھا۔ بجائیں کے چہرے کی رکت بھی
جھیل ہوئی۔

”میں غلام ہوں۔ فرمایے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا
ہوں؟“ اس سے ضبط نہیں ہوا اور وہ قدم مزید آگے آیا۔
”خدمت کے بچے! اچل کر بیٹھ گاڑی میں۔ آج ہم
خود تیری خدمت کریں گے۔“ اس کا لہجہ مزید جارحانہ
ہو گیا۔

”پر اس نے کیا کیا ہے؟ یہ تو بہت شریف اور کام سے
کام رکھنے والا جوان ہے۔“ بجائیں نے ایک بار پھر ان
لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی۔

”بچے ہو۔ یہ تو ہو کر ایک دہشت گرد کی طرف داری
کرنے کے جرم میں، میں تمہیں بھی اریٹ کر سکتا ہوں۔“
اس نے بجائیں کو جھکا۔ اس کی زبان سے نکلا دہشت گرد کا
لفظ اتنا ہولناک تھا کہ ہر شخص ہی اپنی جگہ لرز کر رہ گیا اور
نہایت حیرت سے اس جوان کو دیکھا جو چند دن کے ساتھ
میں ہی اپنا اپنا سناٹا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

”تو تم پاکستان آری کی قید سے فرار ہو کر چالی تک
پہنچی تھیں اور اس نے سمندر کے راستے تمہیں غیر قانونی طور
پر یہاں بھجوا دیا؟“ وہ ڈیوڈ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ
اس سے طنز بھری لہجے میں مخاطب تھا۔

”کوئی شک؟“ وہ سونپا تھی۔ اس کے لہجے پر کنفیڈ
ہوئے بغیر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔
”شک کہ ہے پر مسئلہ یہ ہے کہ تمہارے پاس خود کو سچا
ثبوت کرنے کے لیے ثبوت پورے ہیں۔“ ڈیوڈ نے اپنا
لوہ جھیل نہیں کیا۔

”تو تو پھر بہتر ہے کہ تم اپنا نام بند ہی رکھو۔“ اس
نے ڈیوڈ کی عمر کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔
”تمہیں رکھنا کس نام اپنا نام بند۔ تم ماں بیٹی کی حالتوں
کی وجہ سے میرا یہاں بنانا یا سبب اب تباہ ہو گیا ہے۔ سب
سے بڑھ کر تمہیں مرانا کہنا کہ تم کی جانے والی وہ لیب تباہ ہو گئی

ہے جہاں پروفیسر اینڈریو بے حد اہم تجربے میں مصروف تھا
اور کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔“ ڈیوڈ کا چہرہ لال ہو گیا
ہو گیا اور اس کے غصے کی وجہ بھی سامنے آگئی۔

”غیر یقینی حالات بھی بھی پیش آ سکتے ہیں۔ یہ تمہاری
ذمے داری تھی کہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کا انتظام
کر کے رکھتے۔“ ڈیوڈ کے غصے کی شدت اس کے اطمینان پر
اثر انداز نہ ہو سکی۔

”یہ تم اور تمہاری ماں تھیں جن کی وجہ سے وہ باسٹرڈ
معاذ یہاں تک پہنچا اور اس نے سب تباہ کر کے رکھ دیا۔ اگر
تمہاری ماں اسے پوری طرح ٹریننگ دینے اور اپنا وقار دار
بنانے میں ناکام رہی تھی تو اسے میدان میں کیوں اتارا تھا؟
لیکن وہ کیا خاک اس لڑکے کی تربیت کرتی، اس سے تو اپنی
بیٹی بھی نہ سننا ہی گئی۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں کچھ بھی بن کر تم
نے تنظیم کو نہ قابل طاقی نقصان پہنچا یا ہے اور مجھے یقین ہے
کہ تم اب بھی اسی کے ہاتھوں میں ٹھل رہی ہو۔“ ڈیوڈ نے
اسے آہستہ دکھانے کی کوشش کی۔

”تم یہ سب کہہ سکتے ہو لیکن جو مجھ پر گزری ہے، وہ
شاید ہی کوئی سمجھ سکے۔ تنظیم کے غدار کی کا داغ اپنے دامن
پر برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ بھی اس
صورت میں کہ میری ماں اور میں نے اپنی پوری پوری زندگی
تنظیم کو دی ہے۔ ہماری طرف انگلی اٹھانے سے پہلے تم یہ تو
دیکھ لیتے کہ ہمارا سب کچھ تنظیم کا ہے۔ نہ ہم نے بھی اپنی
ذات کے لیے کچھ کمایا، نہ دنیا کے کسی حصے میں جائیدادیں
کھری کیں، نہ بھی اپنی خواہش سے کسی تفریح کے لیے گئے،
نہ خود کو محبت کرنے یا اپنی پسند سے شادی کرنے کا حق دیا۔
دیکھو میری طرف.....“ اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے
انگوٹھے سے اپنے سر پائی کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھ جیسا حسن دنیا میں کتنی عورتوں کو نصیب ہوتا
ہے؟ میں کی راستے پر چلوں تو لوگ گردن موڑ کر میری
طرف دیکھتے ہیں لیکن میں نے صرف اور صرف تنظیم کے
مفادات کی خاطر میں نے جوانی میں اس موٹے، بھدے، کم
مصلحت، کم عقل اور عمر دراز دار اب خان سے شادی کرنا قبول
کر لیا تھا۔“

”اور یقیناً ای محرومی کو مٹانے کے لیے ایک نوجوان
اور خوب صورت لڑکے پر مرثیوں؟“ ڈیوڈ کو ایک بار پھر طنز و
تمسخر کا موقع مل گیا۔
”شٹ اپ!“ سونپا اس کی بات سن کر پہلے غرائی پھر
پست لہجے میں بولی۔

شہ زور

”وہ کوئی عشق و شوق نہیں تھا۔ میں ٹرائس میں تھی۔ اس
نے میرے ساتھ کچھ ایسا کیا تھا کہ میرا دماغ میرے بس
میں نہیں تھا۔“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ وہ کوئی پٹائل یا جادوگر ہے؟“
ڈیوڈ نے اپنی ایک ابرو چڑھائی۔
”مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا ہے لیکن پتہ تو ہے جو کبھی کسی
کے قابو میں نہ آ سکا۔ پروفیسر کو کرنے اس پر کتنا کام کیا
لیکن ہم بھی اسے اپنی مرضی پر نہ چلا سکے۔ یہاں تک کہ
وہ کوئی وہ خاص ڈیوڈ اس بھی اس کے آگے نکل ہو گئی جو
دامر کے سکیل و سول کر کے کسی شخص کا کھوج لگانے میں
مدد دیتی ہے۔ وہ زندہ تھا اور ہمارے ساتھ ایک ہی شہر
میں موجود تھا لیکن اس کے غائب ہونے پر ڈیوڈ اس نے
میں کوئی سکتی نہیں دیا۔ ہم اپنے تمام وسائل استعمال
کر کے بھی اسے تلاش نہیں کر سکے اور نہ ڈیوڈ اس نے کوئی
اشارہ دیا تھا۔ کبھی بھی تو ایسا لگتا تھا کہ وہ زندہ ہی نہیں
ہے لیکن وہ زندہ تھا اور ہمارے خلاف مسلسل کارروائیاں
کر رہا تھا۔“ وہ ڈراسا سس لینے لگی۔

”اور تم..... تم جو مجھے اتنی باتیں سنارہے ہو، تم اس
کے خلاف کیا کر سکتے؟ وہ تمہاری ساری محنت برباد کر کے
خود جانا کی گود میں جا بیٹھا اور تم یہاں اپنے زخموں کو
چاہتے محض مجھ پر طنز اور الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے
لیے بیٹھے رہ گئے۔“ اس بار اس نے ڈیوڈ کی ٹھیک ٹھاک
کلاس لی۔

”جاننا کا رویہ بہت عجیب ہے۔ ایک طرف وہ
ہمارے ملک سے تجارتی اور کاروباری معاہدے کر رہا ہے تو
دوسری طرف ہمارے مخالفین کی پشت پناہی بھی کر رہا ہے۔
لیب کی تباہی ہمارا بہت بڑا نقصان ہے۔ حالات ایسے
ہو گئے تھے کہ جو کچھ بچا، ہمیں خود ختم کرنا پڑا۔ وہ سارے
مخوفی جوان برقیانی پہاڑی غاروں میں چھپے ہوئے تھے اور
وہ جو ملک لینے کے لیے نکلے تھے، سب کو چن چن کر ہلاک
کرنا پڑا۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے اور وہ ہمارے کسی مخالف یا
سر بھرے صحافی سے جا کر ملتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔
بھارتی سرکار نے تو صاف ہاتھ اٹھا لیتا تھا کہ انہیں ان
سارے معاملات کی کوئی خبر نہیں۔“ ڈیوڈ نے اپنے دھڑلے
روئے شروع کر دیے۔

”یہی میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں۔ نقصان دونوں
کا ہوا ہے تو کیا بہتر نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو الزام
دینے کے بجائے دشمن کے خلاف مل کر کارروائی کریں؟“

سونپا نے اس بار اپنا لہجہ نرم کر لیا۔

”میں تم لوگوں کی الزام اس لیے دیتا ہوں کہ رائل سے
اجتناب میں لگتی ہوئی ہے۔ اس نے ہم سب کے لیے ایک
معیشت کو جن لیا ہے۔“ ڈیوڈ کو میڈیم ایکس سے پرانی پر خاش
تھی جو اس کے خلاف بولنے سے دھوک نہیں پاتی تھی۔
”چنا تو انہوں نے ایک نایاب ہیرا ہی تھا، وہ اور
بات کہ ہمارے پاس ایسے قاتل جو ہری ہی نہیں تھے جو
اسے ترش پاتے۔“

”تم بہت سنار ہو اس سے؟“ ڈیوڈ کو میڈیم ایکس کے
حق میں دی کی دلیل میں بھی اس کا مواضع سے شش دکھائی دیا۔
”جب تک مخالف کی خوبیوں کو تسلیم نہ کیا جائے،
اس سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب آپ مان لیتے ہیں
کہ وہ کس لیول پر کھڑا ہے تب ہی اس کے لیول کے
مقابلے کی تیاری کرتے ہیں۔“ سونپا نے اس بار بھی
بزدوباری کا مظاہرہ کیا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تم سے مزید بحث
نہیں کروں گا کیونکہ اصل جواب دی تو تمہیں تنظیم کے بڑوں
کے سامنے ہی کرنی ہے اور اس کے لیے تم جانے ہی والی
ہو۔“ ڈیوڈ نے اپنی گلابی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔
”میں تمہاری مشکور ہوں کہ تم نے میری فرمائش پر
پہلے ہی سے سارے اختلافات کر کے تھے۔“

”اس اد کے۔ یہاں کوئی کام انجام دینا میرے
لیے اتنا ہی آسان ہے جتنا اپنے ملک میں ہو سکتا ہے۔“ ڈیوڈ
نے بے نیازی سے شانے اچکا کر جواب دیا۔ وہ اپنے اس
روئے میں حق بجانب تھا۔ سونپا کی آمد سے پہلے پہلے اس
کے لیے پاسپورٹ، ٹکٹ اور دوسرے سفری دستاویزات کا
انتظام اس نے محض چند منوں کا لڑ پری کر ڈالا تھا اور اب وہ
چند گھنٹوں کے آرام کے بعد مزے سے اڑان بھرنے کے
لیے تیار تھی۔

”ایسا ہی سٹاپ ہمارا پاکستان میں بھی تھا جسے شدید
نقصان پہنچا ہے لیکن خیر، کوئی بات نہیں۔ ہم دوبارہ سب ٹھیک
کر لیں گے۔ ہماری جڑیں اب بھی وہاں موجود ہیں۔ ان
جڑوں سے تناہنا نہیں اور پھول پتے پھوٹنے میں زیادہ وقت
نہیں لگے گا۔“ اس نے جانے ڈیوڈ کو سلی دی یا خود کو۔

”تمہاری فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہیں اب
ایر پورٹ کے لیے نکل جانا چاہیے۔“ اس بار ڈیوڈ نے بحث
سے گریز کیا اور ایک بار پھر گلابی کی گھڑی میں وقت دیکھتے
ہوئے اس سے سنجیدگی سے بولا۔

”سنا ہے تم بھی ان آنگ بادلوں میں شامل ہونے کی نیت سے ہی کمرے سے بھاگے تھے اور پھر تمہاری کوئی خبر نہیں ملتی تھی؟“ اس سوال کو کرتے ہوئے افسر نے خاص طور پر اپنی نظروں اس کی نظروں میں گاڑ دی تھیں۔ یوں جیسے اس کے اندر کی گہرائیوں سے سچ کھوج لائے گا۔

”آپ کی طرح میں نے بھی یہ بات بس سنی ہے۔ مجھے خود تو اپنے بارے میں جتنا یاد ہے، وہ بھی ہے کہ میں سر کی جھٹ اور ردی کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ایک بے نام و نشان انسان تھا جسے ایک پھلے آدمی نے سہارا دے کر اس کی زندگی کو آسان بنادیا۔“

”اس نے بتایا جو افسر نے گردن کو یوں جنبش دی جیسے ہیں اور کاروبار کے سلسلے میں ان کا یہاں بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔“

وہ یہ بات پہلے سے ہی جانتا ہوا اور یقیناً وہ جانتا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے اس کے متعلق کوئی ایک سوال کیے جن کے جوابات وہی تھے جو پہلے ہی ہر ایک کے علم میں تھے۔

”او کے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے میرے کسی سوال کے جواب میں جھوٹ نہیں بولا۔ اگلے بیجا من نے تمہاری سفارش کی ہے اور اس بات کا دشو اس دلایا ہے کہ رات کو تم ان کے گھر میں تھے اور جو کچھ پیش آیا، اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ کچھ الجھا الجھا سا تھا۔

”اگلہ خیامن میرے بابا کے اچھے دوست ہیں اور یہ انہی کے کارن ہے کہ تمہیں یہاں لانے کے ساتھ نار چرسل میں بھجوانے کے بجائے میں نے اپنے پاس بلوایا ہے۔ ظاہر ہے تم نے سچی اور ہوادرتہارے ہرج کا ثبوت بھی ہے پر جانے کیوں کچھ ایسا ہے جو سن میں کھٹکتا ہے اور تمہیں چپاٹنے سے روک رہا ہے۔“ اس کی الجھن کی وجہ سامنے آگئی۔

”میں آپ کی حراست میں ہوں۔ آپ اپنا پورا احمقانہ کر لیں۔“ اس نے سکون سے جواب دیا لیکن دل ہی دل میں اس شخص کی چچی جس کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکا جو سب شیک نظر آتے ہوئے بھی اس کے اندر کی گڑبڑ کو بھانپ گیا تھا۔

”ہمیں جو کرنا ہے وہ کر لیں گے، پر ابھی تم یہ بتاؤ کہ حاجی شیر خان کی بیٹی سے تمہارا کیا سبب بند ہے؟“

”کون..... پری دوش؟“ اس نے افسر کے اچانک موضوع بدلنے پر گویا چونک کر سوال کیا۔

”ہاں، شاید یہی نام ہے اس لڑکی کا۔“ اس نے

وہاں جبار علی نامی ایک شخص آیا اور مجھے کافی دیر گھور گھور کر دیکھنے کے بعد مجھے سے پوچھا کہ تم عمار ہونا؟ میں کیا جواب دیتا۔ مجھے تو خود اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے اور میرے ماضی کو جانتا ہے۔ ”وہ سانس لینے کے بہانے رکا اور زور پزیرہ نظروں سے آفیسر کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ بہت جلد سے اس کی داستان سن رہا تھا اور ابھی تک کسی چارچاند روئے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسے گرفتار کر کے لانے والے سپاہیوں کا رویہ البتہ معاندانہ رہا تھا اور گرفتاری کے وقت اس کی طرف سے کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اسے راستے میں زد و کوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ وہ خاموش رہا تھا اور جواب میں کسی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا تو ان کے غصے کو وہ نہیں لے سکی تھی اور وہ اسے صحیح سلامت یہاں تک لے آئے تھے۔

”میں نے جبار علی کو صاف بتادیا کہ میں اپنی بادشاہت کو چھوٹا کرنا اور مجھے بالکل یا تو نہیں کہیں عمار ہوں یا کوئی اور۔ اس نے مجھے یقین دلادیا کہ تم عمار ہی ہو جو ایک دن اچانک اپنے والدین کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تب سے اب تک ان بیچاروں کو تنہا رہی کوئی خبر نہیں ہے۔ پھر وہی مجھے آغا جان اور بی بی کے پاس لے کر آیا۔ ان دونوں کے خلوص اور پیار نے مجھے یقین دلادیا کہ میں ان کا کھو یا ہوا بیٹا عمار ہی ہوں۔ غرض کریں کہ اگر میں عمار نہیں بھی ہوں تو مجھ جیسے بے گھر اور بے نشان شخص کے لیے کیا برا ہے کہ اسے ایک گھر اور چاہنے والے ماں باپ مل گئے ہیں۔“ اس نے بے حد سادگی سے اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔

”یہ جبار علی کون ہے؟“ افسر کا یہ سوال ایک ہلکے لیے اسے خاموش کر دیا لیکن پھر متانت سے بولا۔

”مجھے معلوم ہے کہ اس سوال کا درست جواب میرے حق میں نہیں ہے لیکن میں آپ کو وہ بتاؤں گا جو سچ ہے۔ جبار علی، آغا جان کے پرانے جانے والوں میں سے ہے۔ شاید کوئی رشتے دار ہی بھی ہے لیکن آغا جان نے مجھے بتایا کہ وہ بہت عرصے بعد ان سے ملے آ یا تھا اور انہیں اس کی آمد ایران کوئی کئی گھنٹے کے متعلق انہیں یہی خبر ملی تھی کہ وہ حریت پسندوں میں شامل ہو گیا ہے۔ بہر حال اس نے مجھے آغا جان کے حوالے کیا اور پہلے ہی کی طرح پھر غائب ہو گیا۔“ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کے متعلق ساری معلومات جمع کر کے بیٹھے ہوں گے اس لیے اسے اپنے حلقہ دہن بتایا تھا جو بہت سے دوسرے لوگ بھی جانتے تھے۔

لکھا دیا ہوتا ہے اور دونوں فریقین میں سے کوئی ایک لازماً دوسرے کو دکھ دے رہا ہوتا ہے۔ ”کسی نے اس کے اندر ہی سرگوشی کر کے اسے آئینہ دکھایا لیکن اس کے پاس سر جھٹک کر آگے بڑھ جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ گزرتی ہوئی ماحول میں سنہری بالوں والی وہ لڑکی جس نے ہانپا آستیں والے سنہری بلاؤں کے ساتھ سیاہ ٹانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا، حسب معمول کئی نظروں کو اپنی طرف مرکوز کیے ہوئے تھی لیکن حسن کی آنکھوں میں حسب روایت بے نیازی تھی۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پیادہ چراغ کی ایک کرسی پر بیٹھنے تک اس کا یہ انداز برقرار رہا۔ اس کی فطرت میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے دیکھی وہاں موجود افراد پر ایک نظر دوڑائی تو ایک شناسا چہرے نے توجہ مبطلاتی کی۔ چوگی یوں کہ چہرہ بے شک شناسا تھا۔

☆☆☆

”تاہم تم کسی برس پہلے اپنے کمرے سے غائب ہو گئے تھے اور اب واپس آئے ہو تو تمہاری یادداشت غائب ہو چکی ہے۔“ تمہیں اپنے بارے میں کچھ بھی ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔“ اسے بنجامن کی دکان سے گرفتار کر کے آری کے ایک امرکمز مل لایا گیا تھا اور آنے کے ساتھ ہی آٹھکڑیوں میں بکڑے ہاتھوں کے ساتھ ایک جوان افسر کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ افسر کے پاس اس سے متعلق تفصیلات پہلے ہی موجود تھیں جن کی روشنی میں وہ اس سے مخاطب تھا۔ ”جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، مجھے بھی اپنے بارے میں یہی معلوم ہے۔“

”مطلب؟“ اس کی بے نیازی سے دیے جواب پر آفیسر نے ایک آئی برو اچکاٹی اور وضاحت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ مجھے اپنے ماضی کے متعلق کچھ یادیں ہیں۔ مجھے اپنے بارے میں اتنا یاد ہے کہ میں زندگی گزارنے کے لیے سخت مزدوری کرتا تھا اور روزی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹتا پھرتا تھا۔ خانہ بدوش کی اس زندگی میں ایک دن مجھے ایک اچھا آدمی مل گیا۔ اس آدمی کو بھی جانے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ مجھ پر ہر بات ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس ملازمت بھی دی اور تعلیم اور ہنر بھی۔ مجھے اپنے بارے میں جس توہ کا میں کون ہوں؟ میرا کھریاں ہے، ماں باپ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ..... لیکن میں اس شخص کی ملازمت میں خوش تھا۔ ایک دن اتفاق سے

”اوسے..... گڈ بائے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈیوڈ نے اس سے ہاتھ ملایا۔ باہر ڈیورڈر گاڑی سمیت اس کا مختصر تھا۔ ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے وہ سارا وقت یاد آیا جو اس نے معاذ کے ساتھ انڈیا میں داخل ہونے کے بعد گزارا تھا۔ اسے اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش، اس کا بار بار مل دے جانا اور پھر گڈ سے سر پر سے بیگ کی طرح غائب ہو جانا۔ اس کے غیاب کے عرصے میں وہ اس کی تلاش میں کیسے ماری ماری پھرتی تھی۔ اسے سب یاد تھا۔ معاذ کی تلاش کے اس عرصے میں ہی اس نے اس کے لیے اپنے جذبات کو ٹھٹھا تھا اور دھیرے دھیرے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں جھلا ہو چکی ہے۔ موقع ملنے پر وہ اس پر اپنے ان جذبات کو ظاہر بھی کر رہی تھی لیکن معاذ کے پاس جواب میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس عورت کے سحر میں جھلا تھا جو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ خود پند کی کو ایک طرف رکھ کر حقائق کی آنکھ سے بھی دیکھتی تو کل شاہ کو حسن، تعلیم، ذہانت اور دیگر مصلحتیں اپنے خود سے بہت بچھے مانتی تھی۔

مکمل شاہ میں تھا ہی کیا؟ ایک دولت مند گھرانے کی عام سی لڑکی جسے اس دنیا کے بارے میں ذہنیات کی معلومات بھی نہیں تھیں۔ جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ جادو اور چار دیواری میں گزارا تھا اور جو سمجھتی تھی کہ معاظ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی لیکن معاظ کی آنکھوں میں دیکھو تو میں وہی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ایسے انسٹیشن کی صورت جسے سوئیڈن کا چکا چوند کر دے تو بالآخر میں ماننے نہیں کر سکتا تھا۔

”میڈم!“ از پورٹ پہنچ کر ڈرائیور نے اسے پکارا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر ماحول میں داپس آئی۔

”شک ہے، تم واپس چلے جاؤ۔“ اپنا چوٹا سانسفری
 بیک لے کر کاغذی سے باہر نکلے ہوئے اس نے ڈراموں کو حکم
 دیا۔ اس نے ساری زندگی اسی طرح سفر کیا تھا کہ کبھی نہیں
 کوئی اپنا اسے رخصت کرنے یا استقبال کے لیے موجود نہیں
 ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا نام نہاد شوہر دار اب خان بھی
 نہیں جس نے اس کے بے تحاشا حسن سے متاثر ہو کر اسے
 اپنی زندگی میں شامل تو کر لیا تھا لیکن اپنی عیاشی کے علاوہ
 اس کے پاس بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے اس طرح
 کے ناز و خیزے افشاں کرے۔

”یہ نازخوے ایک عام سی گھریلو عورت کے عام سے شوہر ہی اٹھاتے ہیں سونیابی بی! کسی سیکرٹ ایجنٹ کو یہ سب نہیں ملتا۔ اگر ملے بھی تو اس میں حقیقت سے زیادہ

ہائے بڑے کاقدات پر ایک نظر ڈال کر خود کو انجان ظاہر کرنے کی کوشش کی حالانکہ یہ ہے تھا کہ جس کے پیچھے یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا۔ اب تک انہیں اس کا نام کیا، پورا ہجرہ نسب معلوم ہو چکا ہوگا۔

”میں نے سنا ہے کہ ہاضی میں میرے اور پریوش کے رہنے کی بات چلی تھی۔ میری آمد کے بعد آغا جان اور بی بی دوبارہ سے یہ بات چھڑنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا تھا۔“

”کیوں، کیا تمہیں وہ لڑکی پسند نہیں تھی؟“

”پسند کی بات نہیں ہے۔ میرا ماننا ہے کہ آدمی شادی جب کرے جب وہ اچھی طرح سیٹ ہو اور بڑی بچوں کو اچھی زندگی دے سکے۔ میری ابھی نئی نوکری لگی ہے۔ بکری اتنی زیادہ نہیں ہے۔ مجھے پہلے گھر کی مرمت کروانی ہے۔ ساتھ آمدنی بڑھانے کے لیے ہاتھ بڑھانے ہیں۔ ایسے میں، میں شادی کا ذمہ لے کر گئے گا میں ڈالوں؟“ اس نے اپنی شادی نہ کرنے کی وجوہات بیان کیں۔

”ہوں۔۔۔ یہ تو خیک سوچ رہے ہوں۔“ افسر نے اس کی تائید کی لیکن انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔

”خیک ہے، ابھی تم ویٹ کرو۔ انکل بنجمن وکیل کو تمہاری تہل کے بچے زور سے کر بیچنے والے ہوں گے۔ وہ بیچ جائیں تو پھر تم یہاں سے جا سکتے ہو۔“ سوچ بچار کے بعد اس نے جو فیصلہ سنایا، اسے سن کر اس کا دل چاہا کہ ایک زوردار ”یاہو“ کا نعرہ لگائے۔ ایک مشکل ترین مرحلے سے وہ اپنی آسانی سے گزر جانے کی امیدیں کر رہا تھا۔

”لیکن یاد رہے کہ یہ تمہاری ٹیجریری تہل ہے۔ ہمیں اطلاع دیے بغیر ہمیں شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔“ افسر کی زبان سے نکلا اظہار اس کی مسکراہٹ کو کیکڑ کیا۔

☆☆☆

”اعظم، ایک جا بڑا! بہت شرارتی ہو گئے ہو۔“ نئی نکلتا کر رہنے اعظم کے پیچھے آوازیں دیتے ہوئے جا رہی تھی اور شرارت میں مزید تیز تر جھانک جا رہا تھا۔

”میں پکڑے گئے بچہ اب نہیں بھاگ سکتے۔“ آخر کار نئی نے اسے جالیا اور اس کی دونوں ہٹلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گود میں اٹھالیا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ گود میں آنے کے بعد اس نے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی اور اٹھنے سے ایک سمت اشارہ کرتے

لگا۔ نئی نے دیکھا کہ وہ ایک پاپ کارن کا اسٹال تھا جہاں سے کئی بچے بھی پاپ کارن لے رہے تھے۔

”خیک ہے۔ چلو دلاتے ہیں آپ کو۔“ وہ اسے لیے ہوئے اسٹال کی طرف چلی گئی۔ وہ لوگ اس وقت ایک پبلک پارک میں آئے ہوئے تھے۔ سکل کے اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد آج پہلی بار اعظم کو کھانے کے بہانے باہر نکلا گیا تھا ورنہ اب سے پہلے تو بس اسپتال اور قیام گاہ کے درمیان ہی چکر لگتے رہتے تھے۔

”چلو آؤ۔ اب آپ کی سہا کے پاس چلے ہیں۔ اتنی دیر سے وہ اکیلی بیٹھی ہوئی ہیں۔“ پاپ کارن لینے کے بعد وہ اعظم کو لیے پارک کے اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں سکل ایک وکیل جیٹر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں اب وہ وکیل جیٹر پر تھی۔ وہ نازک آپریشن جس میں اس کی جان چلی جانے کا اندیشہ تھا، اس کی جان تو بخش گیا تھا لیکن نچلے دھڑکی معذوری ہمیشہ کے لیے مقدر ہو گئی تھی۔ البتہ وہ ہاتھ جو آپریشن سے پہلے ہی ٹا کا رہا ہو چکا تھا، اس کے سلسلے میں ڈاکٹر نے امید دلانی تھی کہ وہ اس اور فریو تھراپی کی مدد سے حرکت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ وہ سکل کے قریب پہنچے تو اسے اپنے آپ میں کم پا کر نئی نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

”میں پوچھی تمہاری اور اعظم کی بانڈنگ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تمہارا ہماری زندگی میں آنا ہمارے لیے ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ اعظم تمہارے ساتھ اتنا مالوس ہو گیا ہے کہ مجھے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ میں اپنے بیٹے کی ضرورتیں اور خواہشیں پوری نہیں کر سکتی۔ تم کسی ماں کی طرح ہی قدم قدم پر اس کے ساتھ موجود ہوتی ہو۔ سچ کہوں تو اب یہ مجھ سے زیادہ تم سے مالوس ہو گیا ہے۔“ سکل نے پاپ کارن کھانے میں مگن اعظم پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ جو کچھ میں کر رہی ہوں، وہ تو کوئی بھی تنخواہ دار ملازمہ کر سکتی ہے۔“ نئی نے بے پردائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”مفتول مت بلو۔ ملازمہ خدمت بے شک کر سکتی ہے لیکن اتنی محبت نہیں کر سکتی جتنی تم اعظم سے کرتی ہو۔ تمہارے ہونے سے میری معذوری اور بے بسی کا احساس باندھ پڑ جاتا ہے۔“ اس بار سکل کے لہجے میں ملکی سی یاسیت تھی۔ اس نے اپنی معذوری کو بہت مہر کے ساتھ قبول کیا تھا

شہ زور

اور اب پورے وقار کے ساتھ خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ایک چلتے پھرتے انسان کے لیے وکیل جیٹر پر آجیٹا معمولی صدمہ تو نہیں تھا جس پر وہ اداس بھی نہ ہوتا۔

”آپ اداس اور گر مند نہ ہوں۔ میں جب تک ممکن ہوا، اعظم کا اسی طرح خیال رکھوں گی۔ میں نے اسے جنم تو نہیں دیا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اگر میری کوئی اولاد ہوتی تو مجھے اس سے زیادہ پیاری نہ ہوتی جتنا مجھے اعظم پیارا ہے۔“ سکل کی اداسی نے اس سے اعتراف کر دیا۔ اب وہ اعظم کو ایک شیخ پر بھا کر خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ وہ پاپ کارن کے ساتھ ساتھ پارک میں کھیتے بچوں کو دیکھ کر بھی خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”میں نے تمہاری آنکھوں میں اعظم کے لیے متاع کے جذبات دیکھے ہیں اسی لیے میری خواہش ہے کہ میں رہوں نہ رہوں، تم ضرور میرے بیٹے کے پاس موجود رہو۔“ سکل کے اپنے اصرار نے اسے خود اس جگہ کا دلدادہ اور اسے محسوس ہوا کہ سکل اس سے کسی خاص موضوع پر بات کرنا چاہتی ہے۔

”مجھے اداسا میں نے اپنی خواہش اور تمہارے انکار دونوں کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک بار میں بھی تم سے بات کر کے دیکھ لوں۔ ہو سکتا ہے تم ادا سامیں کے غلوں سے نہ سکی، میری بے بسی سے ہی متاثر ہو کر ہاں کر دو۔“

”سکل!۔۔۔“ نئی کو اس کے الفاظ نے تھیف دی تو بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھی۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں نئی! تمہاری موجودگی مجھے اپنے بیٹے کی خوشی اور اچھی تعلیم و تربیت کے لیے لازم و ملزوم محسوس ہوتی ہے۔ تم اسے میری خود غرضی کہہ لو کہ ادا سامیں کی خواہش پوری ہونے میں مجھے اپنا بھی بھلا دکھائی دیتا ہے۔“

”لیکن میں۔۔۔۔۔“

”اس لیکن سے آگے کی ساری باتوں کا مجھے علم ہے۔ خیک ہے، تم موی سے محبت کرتی ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ تم اسے بھی بھلا نہیں سکتیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کوئی تمہیں ایسا کرنے کو کہہ بھی نہیں رہا ہے۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات سے ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے جو زندہ ہیں۔“ سکل جو کہہ رہی تھی، اس نے وہ خود کر کے دکھایا تھا۔ معقم کے بعد فیصل سے شادی کا فیصلہ صرف اور صرف عالم

کی خاطر کیا تھا اس نے۔ یہ اور بات کہ دوسری طرف سے اس رہنے کو نبھانے کی نیت ہی نہیں تھی۔

”اعظم کا تو میں ایسے ہی ساری زندگی خیال رکھ سکتی ہوں۔“ وہ سکل کے ساتھ اس لب و لہجے میں نہیں بول پارہی تھی جس میں عالم نے پیش آئی تھی۔

”لیکن ہم نہیں ایک حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ ایسی حیثیت جس میں تمہاری خوشیوں کی بھی ضمانت ہو۔ میرے ادا سامیں بہت نیک دل انسان ہیں نئی! میں ان کی بہن بن کر نہیں بلکہ تمہاری دوست بن کر نہیں مشورہ دے رہی ہوں کہ ایسے شخص کو رو نہ کرو۔“

”دل کے تو معاذ بھائی بھی بہت اچھے ہیں۔ اگر وہ واپس آ جائیں تو کیا آپ انہیں قبول کر لیں گی؟“ نئی نے جواباً اس سے ایک ایسا سوال کر ڈالا جس پر وہ ایک لمبے کے لیے سناٹے میں آ گئی پھر سنبھل کر بولی۔

”اگر میں اس وکیل جیٹر پر نہ بیٹھی ہوتی تو ان کا ساتھ میرے لیے باعث فخر ہوتا لیکن اب اس ادھر سے وجود کے ساتھ میں ایک پوچھ کے سوا کچھ نہیں ہوں۔“

”محبت کرنے والے محبوب کا بوجھ بھی خوشی سے اٹھاتے ہیں۔ میں نے موی کو اس دور میں سنبھالا تھا جب وہ بالکل معذور ہو کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔“

”ایسا ہے تو میں بھی تمہارے معاذ بھائی کی محبت کو آزما کر دیکھ لوں گی لیکن ابھی تو تم اپنی بات کر رہے ہو کہ اعظم کے ماموں جان قبول ہیں یا نہیں؟“ معاذ کے ذکر نے اگرچہ اسے اداس کر دیا تھا لیکن بچے کو بٹاش رکھ کر ہی نئی سے مخاطب تھی۔

”آپ کا اتنا اصرار ہے تو آزما ہی لیتے ہیں آپ کے بھائی کو۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”بندہ آزمائش پر پورا اترنے کی ضمانت دیتا ہے۔“ عالم شاہ بتا نہیں کہ وہاں آیا تھا۔ اچانک مداخلت کی تو اسے اس کی موجودگی کا علم ہوا اور بے نیازی کی جگہ ایک مدہم شرمیلی سی مسکراہٹ نے لے لی۔

☆☆☆

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ رادھا دیوی ہیں؟“ اس نے کچھ دیر دھلے ہوئے بالکل سادہ چہرے، عام سے ہمیز اسٹائل اور سفید قمیص شلوار پر سفید ہی دوپٹا لیے عورت کو جانچتی نظروں سے دیکھا اور بالآخر خود کو اس سے مخاطب ہونے سے نہ روک سکی۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ چہرے پر حزن لیے، یہ بیواؤں جیسے طبع والی عورت بھارت

کی باپ ایکٹریس تھی جو سولہ تو کیا، بیس سٹار کے لوگوں کو
 اسکرین پر تھرپن دکھائی دیتی تھی تو تلاش بین مجموعہ اسٹے
 تھے۔ بیسوں، تالیوں اور افراد کا شمار ایسے اہم تھا کہ لکھا تھا
 سنیما کی جیت اڑ جائے گی۔ وہ ایسے اداکار کی کرتی تھی تو
 تلاش بین کی آہوں اور سسکیوں سے ساری فضا ہی غمزدہ
 ہو جاتی تھی۔ اس کے ایکشن سین لہو کو گرما دیتے تھے۔ اس
 کے صرف نام کے ساتھ دیوی نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کے
 چاہنے والے اسے دیوی ہی کی طرح پوجتے تھے۔
 ”سوری! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے اتنی
 رکھائی سے جواب دیا کہ سونیا کا قہقہہ حنزل ہونے لگا۔
 ”میں سونیا ہوں، معاذ کی دوست۔“ وہ تھوڑی دیر
 اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ بے شک وہ اس وقت اسکرین کے
 مقابلے میں بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی لیکن اسے بھی
 اپنی یادداشت پر ناز تھا اس لیے اسے اپنی طرف متوجہ
 کرنے کی ایک کوشش اور کی۔ یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت ہوئی
 اور رادھا دیوی جس نے ابھی تک اس کی طرف نگاہ اٹھا کر
 نہیں دیکھا تھا، چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”میں تمہیں دیکھ کر بیک وقت حیرت اور خوش محسوس
 کر رہی ہوں۔“ رادھا کی آنکھوں میں شکاری کی دہشت تھی
 اس لیے اس نے اس کی زبان سے تصدیق کا انتظار نہیں کیا
 اور بے تعلقی سے مخاطب ہوئی۔
 ”حیرت کیسی؟ یہ انٹرویو ہے اور یہاں مسافروں
 کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ اس کا لہجہ ایک ایسے انسان کا لہجہ تھا
 جس کی دنیا میں دہشت ختم ہو چکی ہو اور جس کے لیے لوگوں
 سے بات کرنا بھی ایک بوجھ ہو۔
 ”میں تمہاری یہاں موجودگی پر حیران نہیں ہوں۔
 میں جانتی ہوں کہ تم بھارت کی باپ ایکٹریس ہو اور
 تمہارے لیے انٹرنیشنل سفر کرنا ایک معمول کی بات ہے۔
 میں حیران اس بات پر ہوں کہ تم ان سارے لوازمات کے
 بغیر کیوں ہو جو تمہارے پرورش کا لازمی حصہ ہیں۔“ سونیا
 نے اس کے لہجے کا پیرا مانے بغیر سادگی سے وضاحت دی۔
 ”اور خوشی..... خوشی کا کیا کارن ہے؟“ وہاں لہجے
 میں اب بھی وہی رکھائی تھی۔
 ”وہ بس ایسے ہی ہے۔“ سونیا ہنس دی۔ وہ اسے کیا
 بتاتی کہ اس وقت اس کا دل کسی ٹھن انجیر لڑکی کی طرح
 جذباتی کیفیت کا شکار ہے جسے محبوب کو چھو کر آنے والی ہوا
 بھی پیاری لگتی ہے۔ رادھا دیوی وہ ہستی تھی جس نے سادھو
 کی عقیدت میں ایک ایسے وقت میں حنا کو اپنے گھر میں

شہ زور

کے درمیان موجود عجیب سا تعلق یاد آ گیا۔
 ”وہ جس نے رادھا کو اتنی دیوانگی سے پوچھا تھا کہ عام
 سی رادھا دیوی کو کچھ کی دیوی بنا دیا تھا وہ نہیں رہا تو
 رادھا کیسے رادھا دیوی رہتی۔ اسے تو اپنا سنگھاسن چھوڑنا ہی
 تھا۔“ وہ جو کہہ گئی تھی اس نے سونیا کے پورے وجود کو سن
 کر ڈالا۔ اس نے اگر خود سے عشق نہ چسکی ہوئی تو شاید
 رادھا کے جذبات کو سمجھنے میں مشکل ہوئی لیکن اب وہ جانتی
 تھی کہ دنیا میں ایک طاقتور ترین جذباتیسا ہے جو انسان کو اپنا
 سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے لیے راضی کر لیتا ہے۔ وہ اپنی
 ماں سے باغی ہو گئی تھی۔ اس نے وہ سارے عہد توڑ دیے
 تھے جن سے اسے کسی میں باندھا گیا تھا۔ وہ اس تربیت کو
 فراموش کر چکی تھی جو اسے اسرا نیل کی خدمت کے لیے
 برسوں دی گئی تھی تو پھر رادھا دیوی کا اپنے سنگھاسن کو ٹھوکر
 مار دینا بھلا کیا حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں تو
 خاصی آزاد عورت تھی اور اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتی تھی۔
 ”دنیا اس کی شکل و صورت کو دیکھتی تھی۔ وہ خود بھی
 میرے اور اپنے بچہ شکل کے فرق کو لے کر ڈرتا تھا اور اس
 کے اس ڈرنے مجھے بھی دنیا کے سامنے اپنی حجت کا اعتراف
 نہیں کرنے دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ میری حجت صرف ایک
 جذباتیت یا پھر احسان مندی ہے اسے بھی یہ بات سمجھ ہی
 نہیں آئی کہ وہ حجت رادھا کے ساتھ مل کر جو ان ہوئی ہے
 اور خون ہی کی طرح رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے۔ تم ہی
 بتاؤ، خون کو روک رو گئے تو نکال کر بھی بھلا کوئی جیا ہے؟“ اس
 نے اپنی سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ سونیا سے سوال کیا۔
 سونیا جواب نہیں دے سکی۔ اسے بھی یقیناً جواب دینا پڑا نہیں
 تھا۔ وہ تو بس اس کے اندر کا بچہ تھا جو زبان پر آ گیا تھا۔
 ”رادھا دیوی نے فلمی دنیا سے ریٹائرمنٹ لے لی،
 یہ خبر تو بھارت کے ہر نیوز پیپر اور نیوز چینل نے دے دی
 لیکن رادھا دیوی جیتے جی مر گئی، اس کی کسی کو خبر نہ ہوگی۔ وہ
 تو اس سے ہی موت کا اعلان کرتے ہیں نا جب سے مٹی کا ڈھیر
 شہر برسانوں کے پوچھ سے آزاد ہوتا ہے۔“ وہ اپنے اندر
 کی ٹھن باہر لا رہی تھی اور سونیا کے پاس اس کے ہاتھوں کو
 تھام کر خاموش دلاسا دینے کے سوا کوئی حل نہیں تھا۔ بعض
 زخم اٹھنے سے پہلے ہی کہ سامنے والے کے لیے ان پر
 مرہم رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔
 ”فلم انڈسٹری نے مجھے بہت شہرت اور پیسہ دیا لیکن
 میرے من کی خوشی تو اس کی خوشی میں تھی۔ میں اس کے لیے،
 اس کی خوشی کے لیے ناچتی تھی، گاتی تھی، سٹار کرتی تھی۔ اب

انتظار کیے بغیر چل پڑی۔ اس کی فلاح کا اعلان ہو رہا تھا۔
☆☆☆

”یہ ہے یروشلم The City of faith“ مرد نے اپنی دونوں ہاتھیں پھیلا کر شہر کی کیفیت میں کہا۔
”اور یہاں ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ یہاں موجود ہیں۔“ لائیک کوٹ پر سیاہ اسکارف لیے عورت کی آنکھوں میں بھی جھٹو چمک رہے تھے اور وہ بچوں کے سے جس سے اپنے سامنے موجود دمشق گیٹ (Damascus gate) کو دیکھ رہی تھی۔
انسانوں کا ایک جھوم تھا جو اس دروازے سے گزر کر اندر جا رہا تھا۔

”یہ سب کتنا اپنا اپنا سا ہے نا۔“ اس نے گیٹ کے باہر کھڑا بچھانے اس پر سبزیاں رکھ کر چچی عورتوں کو دیکھتے ہوئے سہمہ کر لیا۔ ان عورتوں نے مختلف رنگوں کے گاؤں پہن رکھے تھے اور ان کے سر اسکارف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ واضح طور پر مسلمان عورتیں تھیں۔ یہ مسلمان اکثریتی علاقہ تھا اور اس گیٹ سے گزر کر وہ قدیم یروشلم کے شمالی مسلمان علاقے میں پہنچنے والے تھے۔

”آپ کا دھیان کہاں ہے؟“ اپنی بات کا جواب نہ پا کر عورت نے مرد کو دکھا اور اس کے دائیں ہاتھ کی آستین چبھتے ہوئے پوچھی۔
”چلیں، اندر چلتے ہیں۔“

”ہاں چلو۔“ مرد جو کہ دائیں جانب موجود فوجی چوکی کا جائزہ لے رہا تھا، اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسے چوکی پر سپاہیوں کی ابھی خاصی نفری محسوس ہوئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق اگر حالات معمول پر ہوں تو چوکی پر سپاہیوں کی تعداد کم ہوتی تھی ورنہ زیادہ۔ اس وقت زیادہ تعداد نظر آنے کا مطلب تھا فحاش کشیدگی ہے لیکن بازار کی گھبراہٹ میں کوئی کی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئے ہی جس نسبتاً تنگی گلی میں داخل ہوئے تھے وہاں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک تسلسل سے آمدورفت جاری تھی۔

”یہ تو کچھ ہمارے عوامی بازاروں جیسا ہی ہے۔“ دونوں اطراف موجود دوکانوں، اسٹالز اور چھوٹے مکانات کو دیکھتے ہوئے عورت نے رائے دی۔

”صفائی کے فرق کے ساتھ۔“ مرد نے گرہ لگائی اور حقیقت تھی کہ تنگ گلی اسٹالز اور افراد کی زیادتی کے باوجود بالکل صاف ستھری دکھائی دے رہی تھی۔ نہ تو دیواروں پر

چاکلگ تھی، نہ ہی نیچے پھٹے پتھر کے فرش پر کوئی کوڑا کرکڑ دکھائی دے رہا تھا۔

”میں اس کی ویڈیو بناتی ہوں۔“ عورت اس کے تہرے کو نظر انداز کر کے اس پر رونق بازار کی ویڈیو بنانے لگی۔ کپڑے، پھل، سبزیاں اور مٹھائیاں..... وہاں وہی سب بک رہا تھا جو عموماً بازاروں میں بچکا ہے اور روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لازم ہوتا ہے لیکن ہر شے میں صفائی اور ترتیب کے خاص تناسب نے جبکہ گلی کے باوجود منظر کو خوبصورت بنا رکھا تھا۔

”مجھے یہ کھانی ہے۔“ ایک دکان کے سامنے گئے اس کے قدم جکڑے اور وہ فوراً انگوں سے سچے تیلے پیڑی سلاکوں والی اس بریڈ کی طرف متوجہ ہوئی جس کی تازگی اور خشکی دیکھنے سے ہی عیاں ہو رہی تھی۔

”یہ طبون ہے۔“ مرد نے اس کی فرمائش پر وہ بریڈ خرید کر اسے تھمتاے ہوئے مسکرا کر بتایا۔ چھوٹے پردہ گرم تھے اور یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی تھور سے نکل کر وہاں پہنچے ہوں۔
”طبون۔“ وہ بریڈ کا ایک حصہ اسے توڑ کر دیتے ہوئے مسکرائی۔

”مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں آنے سے قبل یہاں کی ایک ایک چیز کے بارے میں معلومات حاصل کر کے نکلے ہوں گے۔“

”ایک اچھے سیاح کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ مرد نے جوابی مسکراہٹ اٹھاتے ہوئے جواب دیا اور بریڈ کا لقمہ منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے دل ہی دل میں اس کے خوش ذائقہ ہونے کا بھی اعتراف کیا۔

”سیاح۔“ وہ اس کے منہ سے نکلنے والا لفظ سن کر مسکرائی اور اس کے پیچھے اپنے قدموں کو آگے بڑھایا۔ بازار میں بطور خاص کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا لیکن ان کی طرف سے مکمل احتیاط برتی جا رہی تھی۔ وہ آہٹیں میں گفتگو بھی انگریزی میں کر رہے تھے تاکہ اگر کوئی سن رہا ہو تو اسے بات سمجھ آئے اور وہ ان کو مشکوک نہ کرانے۔

”اب ہم trifurcation of faith پر موجود ہیں۔“ گلی میں سیدھے چلتے چلتے وہ ایک سرداب پر پہنچ کر رک گئے اور مرد نے اسے اطلاع دی۔

”مطلب؟“ اس نے دلچسپی سے دائیں، بائیں اور سامنے نکلنے راستوں کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں

شہ زور

سے اگر بالکل سیدھے چلتے چلے جائیں تو Western wall یعنی دیوار گریک بکلیج جائیں گے۔ سیدھے ہاتھ پر Church of Holy Seplechur جانے کا راستہ ہے جہاں عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب کیا گیا تھا جبکہ بائیں ہاتھ پر.....

”بائیں ہاتھ پر مسجد اقصیٰ کو جانے والا راستہ ہے۔“ اس نے مرد کی بات عمل نہیں ہونے دی اور جبے پناہ جوش سے پوچھی۔ ہر مسلمان کی طرح اسے بھی اس مقدس مقام سے محبت تھی اور دل میں کہیں یہ خواہش بھی کہ اس مقدس سرزمین پر سجدہ کرنے کا موقع مل جائے۔ قدرت نے بغیر کسی کوشش کے یہ موقع فراہم کر دیا تھا تو اس کا جوش میں آنا تو جانتا تھا۔
”ہاں، مسجد اقصیٰ۔“ مرد مسکرایا۔

”آؤ، چلتے ہیں۔“ یہ سوال کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس سہرا بے پر انہیں تینوں میں سے کس راستے پر جانا ہے۔ وہ دونوں سرشار سے بائیں راستے پر چل پڑے۔ خوش دونوں ہی تھے لیکن مرد اظہار کم کرتا تھا۔
”نام؟“ یہاں انہیں ایک چھوٹی سی پولیس چوکی پر روک لیا گیا اور ایک پولیس والے نے دریافت کیا۔

”مرا اور میری دائف تانیہ!“ اس نے سکون سے جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے اور اگر انہوں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کر کے خود کو مشکوک نہ بنایا تو بہت آرام سے اس پولیس چوکی سے گزر جائیں گے۔
”مسلم۔“
”میں۔“
”ٹورسٹ؟“

”میں۔“ اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیتے ہوئے اپنا پاسپورٹ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ یہ گرین پاسپورٹ نہیں تھا۔ گرین پاسپورٹ پر اسرائیل کا ویزا لگ ہی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان نے باوجود اس کے کہ کئی بڑے اسلامی ممالک اسرائیل سے دوستی کا بندھن باندھ چکے تھے، قیام سے لے کر اب تک اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا۔
”اوکے۔“ پولیس مین نے پاسپورٹ پر سرسری سی نظر ڈالی اور انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔
”اگر یہ جان لیں کہ ہم مراد اور تانیہ نہیں بلکہ شہریار عادل اور ماہ پانویں اور ماضی میں ان کے سوزماؤں کو خاک چٹا چکے ہیں تو یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں؟“ پاسپورٹ جیب میں رکھ کر آگے بڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں جو

سوال اٹھائیں کا جواب وہ خود بھی جانتا تھا اور ایک ایک کر کے ماضی کے کردار یاد آتے جا رہے تھے جنہوں نے پاکستان میں اپنی سازشوں کا جال بچھانے کے لیے بہت خوبصورت بہرہ ور کیا تھا۔ یہی نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خدا کے فضل و کرم اور اپنی نیک نیتی کے سہارے نہ صرف ان سازشوں سے محفوظ رہا تھا بلکہ ان دشمنوں کو فاش شکست بھی دی تھی۔ ہاں کراہ کر بھی وہ سازش ٹولا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت کے ساتھ مقابل اکھڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسے اپنی گوشہ نشینی ترک کر کے ایک بار پھر مقابلے کے لیے میدان میں اترنا پڑا تھا اور وہ بھی جان سے اس منصوبے میں شامل ہو گیا تھا جس میں سازشیں کو ان کے گھر میں کھس کر سبق سکھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

”قتبہ الصخرہ Dome of Rock“ اپنی سوچوں میں گھرے چلتے اسے ماہ بانو کی آواز نے متوجہ کیا۔ وہ داخلے کے بارہ دروازوں میں سے ایک دروازے سے گزر کر اب Mount of temple کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور سامنے ہی وہ سنہری گنبد نظر آ رہا تھا جس کی خوبصورتی اور شکوہ نے عرصے سے اس مقام کو Photograph building کا درجہ دے رکھا تھا اور کہا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ تصاویر اسی کی لی جاتی تھیں۔ سونے سے بے اس گنبد نے اس کی نظروں کو بھی باندھ لیا۔ اموی بادشاہ عبدالملک کا تعمیر کروایا گیا یہ شاہکار اگرچہ مسجد اقصیٰ نہیں تھا لیکن اس کی اپنی ایک اہمیت تھی۔
”میں یہاں لواٹل ادا کروں گی۔“ ماہ بانو گل گئی۔

اس وقت اسے اپنی اسرائیل آمد کا اصل مقصد یاد نہیں تھا۔ بس ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ارض مقدس پر ہے جس کے چپے چپے پر انبیاء کے نقش قدم ثبت تھے۔ سوائے بھی اس مقام پر سجدہ کرنا تھا جو بے شک مسجد نہیں تھا لیکن اس کے لیے مقدس بہر حال تھا۔

”بالکل ادا کرو بلکہ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔“ اس نے فوراً ماہ بانو کی تائید کی۔ وہ آخر اس جگہ کیوں نہ سجدہ کرتا جو اس چٹان پر تعمیر کی گئی تھی جہاں سے روایات کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار ہو کر معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ویسے یہود کے نزدیک بھی یہ مقام مقدس ہے اور وہ اس چٹان کو Foundation stone کا نام دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ پہلا مادہ (Matter) ہے جو اللہ نے بنایا اور حضرت آدم علیہ السلام

کام کر رہے ہیں جبکہ میری یادداشت بحال ہونے لگی ہے۔ اس ساری صورت حال سے میں نے اندازہ لگایا کہ معاذ اللہ پر وقتے وقتے سے مسئلہ کل کرتا تھا جس کا اسے میرے قید میں ہونے کی وجہ سے علم نہیں ہو سکا اور میں دھیرے دھیرے اس کے اثر سے باہر آگئی۔ اس نے بہت تفصیل سے صورت حال کا تجزیہ کیا۔

”میری تو ہوسکا ہے کہ تم اب بھی معاذ اللہ زیر اثر ہو اور اس کے کسی خاص ایجنڈے پر کام کرنے کے لیے ہمارے درمیان واپس آئی ہو؟“

”بالکل نہیں۔ اس نے شدت سے میڈم ایکس کے الزام کو رد کیا اور پھر شکایتی لہجے میں بولی۔

”آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں؟ مجھ پر..... میں جو آپ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ واؤں لگا دیا کرتی تھی، کیا اسی کی حصاروں میں کہ آپ مجھ پر شک کریں؟“

”حالات نے مجھے اس پر مجبور کر دیا ہے۔ تم جتنا نقصان کر چکی ہو اس کے بعد اس سوال کی گنجائش جتنی نہیں ہے۔ تم نے اپنی حرکتوں سے مجھے تنظیم کے بڑوں کے آگے جتنا شرمندہ کروایا ہے اس کے بعد یہ ان کا احسان ہی ہے کہ اب بھی انہوں نے مجھے ہی تنظیمیں ڈیل کرنے کے لیے آگے رکھا ہے ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور سے یہ کام لیتے۔“

”میڈم ایکس براں کے لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے آج بھی اس سے بڑھ کر اپنی تنظیم کی فکر تھی۔

”ٹھیک ہے، تو پھر آپ جیسے چاہیں اپنی تسلی کر لیں۔ اس نے ہلے ہوئے منہ کے ساتھ پیشکش کی۔

”وہ تو میں ضرور کروں گی اور باتیں کروں گی کہ تم اسرائیل کے سامنے کسی اولاد بھی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔“

”میڈم ایکس نے اسے بے نیازی سے جواب دیا اور پھر انٹرکام پر کسی کو وہاں آنے کے لیے کہا۔

چند ثانیوں میں ایک لمبا ٹوکا اور خوب کسے ہوئے جسم کا لوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”اسے لے جاؤ اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے جو جوبہ استعمال کرنا چاہو کرو۔ سچ تک پہنچنے کے لیے مجھیں اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ بھی الگ کرنا پڑے تو رعایت نہیں کرنا۔ اگر یہ اسرائیل کے مفادات کے خلاف ہے تو اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”میڈم ایکس کے لہجے کی سختی نے اسے یقین دلادیا کہ وہ عورت اسے اس دنیا میں لانے کی ذمہ داری تو بے شک ہے لیکن اس کا اپنے وطن کے علاوہ کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

”سوری ڈارلنگ! لیکن کیا کروں۔ تمہاری رکروں میں دوڑتا تمہارے مسلمان باپ کا خون مجھے کبھی تم پر پورا نہیں سونپاؤں گے۔“

”میڈم ایکس نے اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا اور نہایت صاف گوئی سے اپنے عمل کی توجیہ پیش کی۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے اس شخص کے ساتھ چل پڑی جو موت کے فرشتے کی طرح اس کے سر پر سوار تھا۔

☆☆☆

”کہاں چھپایا ہے انہیں، جلدی بتا کہاں چھپایا ہے ورنہ میں تیرا لکھون لی جاؤں گا۔“

”باہر کو باہر بلی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ شخص گل دوش کے خاندان کبیر کا کریاں پکڑے اسے بری طرح جھجھوڑ رہا تھا۔ گل دوش اور کبیر کی ماں بندوق کے سامنے میں ایک طرف کھڑی ہوئی کھڑی تھیں۔

انہیں گہری نیند سے جگا یا گیا تھا اور اب وہ بے بسی سے بے سنورے گھر میں دندناتے بھارتی سپاہیوں کو اپنی من مانی کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

”کک..... کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں جناب؟“

”کبیر بھی نیند سے جگائے جانے پر پشیمان ہوا تھا۔

”تیرے ماں کے خصم کی، سالانا تک بازی کرتا ہے ہمارے ساتھ۔“

”غصے سے اس شخص نے کبیر کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔ کبیر کا چہرہ طمانچے سے زیادہ اس کے الفاظ کی شدت پر سرخ پڑ گیا لیکن مجبوری تھی کہ پلٹ کر جواب نہیں دے سکتا تھا۔

”میرا یقین کرو، میں نہیں جانتا تم کے تلاش کر رہے ہو۔ میرے گھر میں تو بس ہم تین ہی لوگ ہیں۔“

”انجان بن رہا ہے۔ سالی کے کوئل ہاتھوں کی روٹیاں کھانے والے کو کبیر ہی نہیں ہے سالی کے کارناموں کی۔“ اس نے کبیر کو ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ کس کی تلاش میں وہاں آیا ہے۔

”وہ لوگ یہاں نہیں آئے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ تم لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے سب سے پہلے یہیں آؤ گے اس لیے انہوں نے یہاں کا رخ نہیں کیا۔“

”ماں اور بیوی کے سامنے مسئلہ ہونے والی تو ہیں پر کبیر کی رگوں میں خون ابل رہا تھا لیکن حالات کو بدترین ہونے سے بچانے کے لیے اسے محل کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔

”جو اس مت کر۔ ہمارے کوجوں کو ان کے اس

شہ زور طرف آنے کے صاف اشارے ملے ہیں۔“ اس نے غصے میں کبیر کو ایک اور طمانچہ رسید کیا۔

”اگر وہ یہاں آتے تو اب تک تمہیں مل چکے ہوتے۔ تمہارے ساتھیوں نے میرا پورا گھراؤ ڈھلا دیا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو تمہیں مل جاتا۔“ اس بار کبیر کی آواز معمولی سی تیز ہو گئی۔

”بھونکتا ہے..... مجھ پر بھونکتا ہے، سالانا۔ میں تیرا یہ منہ ہی تو ڈوڑوں گا جس سے تو مجھ پر بھونکنے کی جرأت کر رہا ہے۔“

”اس نے کبیر کے منہ پر لگا ہاتھ کی کدے مارے۔ کے اتنے زوردار تھے کہ اس کے ہونٹ چھٹنے کے ساتھ ساتھ سامنے کے دانت بھی مل گئے اور منہ سے خون ابل کر ٹھوڑی سے بہتا ہوا زمین پر پھٹنے لگا۔ اس منظر کو دیکھ کر گل دوش اور کبیر کی ماں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔

ماں نے تو بے اختیار آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی کہ بیٹے کو اس بے دردی سے مارنے والے کا ہاتھ پکڑے لیکن اسے کھڑے سپاہیوں میں سے ایک نے اسے اس زور کا دھکا دیا کہ وہ توازن کھو کر نیچر پڑی۔ گل دوش خاندان کو بھول کر ساس کو سنبالنے کے لیے لپکی۔

”ابھی صرف تیرا گھراؤ ڈھلا ہے۔ زبان نہیں کھولے گا تو گھر کے ساتھ ساتھ تیری کھال بھی اوڑھ کر رکھ دوں گا۔“

خونخوار آنکھوں والا کے مارنا چھوڑ کر اب کبیر کے جڑوں کو اپنی آہنی انگوٹھوں میں پکڑے اسے دھکا رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم وہ لوگ کہاں ہیں۔ مارا کرا رہی کبیر انکار پر قائم تھا۔

”اور میں معلوم کیے بنا تیری جان نہیں چھوڑوں گا۔ جو مرا ہے وہ صرف انڈین آرمی کا سپاہی نہیں تھا، وہ میرا سگا بھائی تھا اور میں اپنے بھائی کے کھوئیوں (خونیوں) کو زک میں پہنچانے بنا چمکن سے نہیں بیٹھوں گا۔“

اس بار اس نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑا اور اس کے بٹ سے کبیر کو بے دردی سے پیٹنے لگا۔ ہر ضرب زوردار تھی اور مارنے والا غصے میں اتنا پاگل ہو رہا تھا کہ مارتے ہوئے یہ تک نہیں دیکھ رہا تھا کہ سامنے والے کو کس جگہ چوٹ لگ رہی ہے۔

چند منٹوں میں ہی کبیر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا اور اس کے حلق سے دردناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اس کی ہر بلند ہوتی چیخ کے ساتھ گل دوش اور اس کی ساس کی چیخیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔

وہ بھی اس ظالم سے فریادیں کرنے لگتی تھیں اور بھی اس ظلم پر ہیں۔ انہوں نے مشہور بار کبیر تک پہنچنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ظالم کے معاونین جو دیے تو خاموش

کوشش بھی کی تھی لیکن ظالم کے معاونین جو دیے تو خاموش

تماشا کی جے ہوئے تھے، انہیں ان کی ایسی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دے رہے تھے اور ہر بار بے دردی سے پیچھے دھکیل دیتے تھے۔

”کوئی تو آؤ مدد کو۔ یہ ظالم میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔“

”بے بس ماں کی پکار اس پاس کے کئی لوگوں نے سنی تھی لیکن اپنے آپ میں شرمندہ اس پکار پر آنسو بہانے سے زیادہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ بھارتی سپاہیوں نے شہد کی کھینوں کی طرح کبیر کے گھر کو اپنے گھرے میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں کسی کی ذمہ سی مداخلت سے بات بہت زیادہ بگڑ جاتی۔ وہ سب عام سے لوگ تھے اور کس سپاہیوں سے لڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

”آخری بار پوچھ رہا ہوں، بتادے کہ اپنے سرالوں کو کہاں چھپایا ہے۔ تو اگر سمجھ رہا ہے کہ زبان بند رکھ کر انہیں بچالے گا تو یہ ہو نہیں سکتا۔ میرا نام شرابے اور میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو بائال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”مارا کھا کرا کبیر ادا ہو گیا تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور کبیر کی گردن پر پیر رکھ کر اپنے بھاری بوٹ سے اس کا زرخہ دباتے ہوئے بولا۔ دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ کبیر کا سانس رکنے لگا اور اس کے حلق سے خرخرہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔ یہ وہ نازک مقام تھا جہاں آکر اس کی ماں کی برداشت جواب دے گئی اور زور سے چیختی۔

”وہ باغ میں ہیں۔ باغ میں اوزار وغیرہ رکھنے کے لیے جو کر رہا ہوا ہے، اس کے نیچے ایک دکان بھی ہے۔ وہ لوگ اسی دکان میں ہیں۔“

اس موقع پر گل دوش نے اذیت سے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

اسے جاس کے ہمت ہار جانے پر شکوہ نہیں تھا۔ ایک ماں اپنے خلیہ کو جہاں تک آزما سکتی تھی، انہوں نے آزما یا تھا لیکن وہ کیا کر سکتی کہ اس کا وجود تو ترازو کے دو پلڑوں کے بیچ بنا ہوا تھا۔ ایک پلڑے میں شوہر کی محبت تھی تو دوسرے میں چار چار خونی رشتے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی..... سب کچھ واؤں پر لگ گیا تھا۔

”دھیواد مائی! اتونے اپنے بیٹے کی مشکل آسان کر دی۔“

اس نے پاؤں کا پورا وزن کبیر کے زرخے پر ڈال دیا۔ وہ اگرچہ پٹ پٹ کر بڑھتا ہوا تھا لیکن ایک جوان صحت مند جسم میں سے روج نکلنے کا عمل آسان نہیں ہوتا۔ اس کا پورا جسم بن پانی کی پمپلی کے مانند اس بری طرح تر پنے اور پھرنے لگا کہ شرا کے لیے اس کے زرخے

سپنس ڈائجسٹ 61 مارچ 2024

سپنس ڈائجسٹ 60 مارچ 2024

کے حصول کے لیے ہی خرچ ہو۔ اس نے اپنی دلی خواہش بیان کی۔

”اللہ تمہیں تمہارے نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور ان ظالموں کو نیست و نابود کر دے جو مظلوموں کی لاشوں پر اس دنیا میں اپنی جنت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔“

”آمین!“ اس نے آغا جان کی دعا پر بڑے دل سے کہا۔

وہ جبار علی عرف جادو کی تجویز پر کشمیر میں موجود تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کے ایک عزیز عمار سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے اور جو تھوڑا بہت فرق موجود ہے، اسے اس لیے آرام سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ عمار اپنے جان پہچان والوں کے لیے گزشتہ چھ برس سے گمشدہ ہے۔ چھ برسوں میں انسان یوں بھی اچھا خاصا تبدیل ہو جاتا ہے اور ایک بڑھتی ہوئی عمر کے نوجوان میں تو یہ تبدیلی اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے اس لیے اسے عمار کی حیثیت سے بہ آسانی قبول کر لیا جائے گا۔ جبار علی کی یہ بات درست ثابت ہوئی تھی اور وہ اپنی ارد گرد والوں نے ایک حیرت انگیز مسرت کے ساتھ اسے قبول کر لیا تھا۔

”مجھے جبار نے عمار کی شہادت کے کچھ عرصے بعد ہی اطلاع دے دی تھی لیکن میں زندگی کو خیر نہیں دے سکا۔ وہ اس آس پر جیتی ہے کہ ایک دن اس کا عمار واپس لوٹ آئے گا۔ مجھے لگتا ہے جس دن اس کی یہ آس ٹوٹ گئی، اس کی سانسوں کی دھڑکی ٹوٹ جائے گی۔“ ان کی بے نور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

”مجھے جبار علی نے عمار کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے اس کے جذبے نے بہت متاثر کیا۔ اس طرح اپنے پیار کرنے والے ماں باپ اور گھر کے آرام کو چھوڑ کر گنتا کی زندگی اختیار کر لینا اور گنتا کی میں رہ کر ہی آزادی کے لیے جان نچھاور کر دینا معمولی قربانی نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں عمار کے لیے بے حد متاثر تھی۔

”یہ سب تو تم بھی کر رہے ہو۔“ آغا جان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

”میں تو اس طرف دھکیلا گیا ہوں۔ عمار کی طرح میں نے خود سے اپنے لیے اس راہ کا یقین کہاں کیا تھا۔“

”تم منتخب کیے گئے ہو معاذ اللہ! اس راہ کے مسافر کہیں بہت اوپر سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ مجھے جیسوں پر تمہاری محرم فرض ہے۔“ آغا جان نے اس کے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے یقین دہانی کر دلی۔

پراپوں بجائے رکنا مشکل ہو گیا۔ اس موقع پر اس کے حواری آگے بڑھے اور کیر کی دونوں ٹانگیں مقبوضی سے جکڑ لیں۔ اب شرکا کا کام آسان ہو گیا تھا لیکن گل و شاد اور اس کی ساسی کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”چھوڑ دے ظالم! چھوڑ دے میرے بچے کو۔“ جھجھکے اندھا کا قہر نازل ہو اور تیرے بھائی کی طرح تو اور تیرا سارا خاندان بھی کتے کی موت مارا جائے۔“ وہ اسے بدعائنیں اور گالیاں دیتی ہوئی جوتی انداز میں اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے جنون کے آگے بند باندھنا سپاہیوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”گولی مار دو سائیلوں کو۔ میرے پر پیار کو شواب دینے والوں کو اس زمین پر رہنے کا ادھیکار نہیں ہے۔“ شرانے غم صادر کیا۔ کیر کے جسم نے آخری جھٹکا لیا تو گل و شاد اور اس کی ساسی بھی جسم میں جوتی ہونے والی گولیوں کے باعث جھٹکا کھار زمین پر گر چکی تھیں۔ کشمیر میں ہر روز برپا ہونے والے ظلم کی داستانوں میں ایک اور داستان کا اضافہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”ہم جانتے ہیں کہ تم مسافر ہو اور تمہیں ہمارے پاس کچھ عرصے ہی مہمان رہنا ہے پھر بھی تم سے اپنا دل لگا بیٹھے ہیں اور میں سچ بچی لگتا ہے کہ ہمارا عمار واپس لوٹ آیا ہے۔“ شفاف پانی کے جمرے کے قریب بیٹھے آغا جان اس سے بہت محبت اور اپنائیت سے مخاطب تھے۔

”زور دینے کی بات تمہارا ہر نقش عمار جیسا ہے۔ اگر آج ہمارا عمار ہمارے پاس ہوتا تو بالکل تم جیسا ہی ہوتا۔“

”مجھے بھی آپ لوگوں سے بہت اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔“ اس نے آغا جان کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے تمام کر زنی سے دبائے۔

”کاش میں بھی آپ کا عمار بن کر ہمیشہ آپ کے پاس رہ سکتا لیکن میں تو ان کے پاس بھی نہ رہ سکا جن کے دل بھی ہر پل اسی طرح میرے لیے تڑپتے ہیں جس طرح آپ اور بی بی کے اپنے عمار کے لیے۔“

”لیکن میں اس بات پر خوش بھی ہے کہ ہم تم جیسے قابل فریڈوں کے باپ ہیں۔“ آغا جان نے اس کے لہجے میں مٹی اداسی کو محسوس کر کے اسے گویا حوصلہ دیا۔

”عمار تو بے شک قابل فریڈ ہے کہ اس نے اپنی مہر کی لیے اپنی جان قربان کر ڈالی۔ آپ میرے لیے بھی دعا کیجئے گا کہ یہ زندگی اگر خرچ ہو تو عمار کی طرح کسی بلند مقصد کے لیے۔“

شہ زور

مثال حسن بار بار اس کی نظروں کو باندھ لیتا تھا۔

”ہاں، مسٹر جونا تھن ہمارے لیے اللہ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ جبار علی نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے عمار کو بھی بہت سپورٹ کیا۔ عمار کی شہادت کے بعد وہی تھے جنہوں نے اتنی خاموشی سے اس کی تدفین کروائی کہ کسی کو کالوں کا ان اس کی حقیقت کا پتا نہیں چل سکا۔“ عمار کے ذکر پر ہر بار ان کی آنکھوں میں کرب کر ویش لیتا تھا۔

”ایک غیر مسلم ہو کر مسلمانوں سے اتنی ہمدردی حیرت انگیز ہے۔“ اس کی حیرت لبوں پر آگئی۔

”انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے لیکن جبار علی نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر جونا تھن عرصہ ہوا اسلام قبول کر چکے ہیں۔ شروع میں ڈر کر اظہار نہیں کیا پھر مصلحت آڈے آگئی کیونکہ یہ تو طے ہے کہ جونا تھن کی حیثیت سے وہ ٹھوک و شہادت سے بالاتر ہو کر جتنا عرصہ کام کر سکتے ہیں، کسی مسلمان شناخت کے ساتھ نہیں کر سکتے۔“

”لیکن اس طرح ان کو اپنی نئی زندگی میں تو کافی مشکلات پیش آتی ہوں گی؟“

”زیادہ نہیں۔ ان کی بیوی ایک کشمیری مسلمان ہی ہے۔ درحقیقت انہیں اس لڑکی کی محبت نے ہی اسلام کی طرف راغب کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ خدیہ خور پر مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ اطلاع کرنا اس لیے ضروری نہیں تھا کہ انڈیا ایک سیکولر ملک ہے اور وہاں ہندو مسلم شادی اتنا بڑا ایجنڈا نہیں ہے۔ جبار علی کے مطابق ان کی بیوی ایسی باکمال عورت نکلی کہ اندر سے انہیں بدل کر رکھ دیا اور آج وہ ہم کشمیریوں کے سب سے بڑے ہمدرد ہیں۔“ انہوں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

”اللہ کا اذن شامل ہو تو مشکلات اسی طرح آسان ہوتی ہیں۔“ وہ بے اختیار بول اٹھا۔

”بے شک۔“ آغا جان نے اس کی تائید کی۔

”چاچا شیر خان اور ان کے خاندان کی کوئی خبر؟ مجھے ان کی فکر ہو رہی ہے کہ کہیں وہ لوگ انڈین آرمی کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔“

”اللہ ان کی مدد فرمائے۔ کاش مجھے بر وقت اطلاع مل جاتی تو میں ان کو کسی مناسب جگہ بھجوا دیتا۔ حاجی شیر خان بے چارہ سیدھا سادہ آدمی ہے۔ ان حالات میں خاندان کو لے کر نہ جانے کہاں بھٹکتا پھرتا ہوگا۔“ وہ خود ان لوگوں کے لیے پریشان تھے۔

”آپ نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی

”آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ وہ جنب سا گیا۔

”نہیں۔ میں تمہیں براہ راہوں اور تم پر شک کر رہا ہوں۔“ آغا جان بر جھکی سے بولے۔ ”کاش، میری ہمدردی میری راہ میں رکاوٹ نہ بنی تو میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوتا۔“ ایک حسرت سی تھی ان کے لہجے میں۔

”ساتھ تو آپ اب بھی دے رہے ہیں۔ عمار کی تربیت آپ کے اور بی بی جان کے ہاتھوں نہ ہوئی ہوئی تو بھلا اس کے دل میں ایسا جذبہ پیدا ہوتا؟“ اس کے لیے وہ بڑھا اور تاج پٹیل سچ سج قابل ستائش تھا۔

”آپ میری مدد کر کے بھی تو قتی جرات اور کشادہ دلی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ میں جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں، اس کا آپ کی جدوجہد آزادی سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔“

”امت مسلمہ کی بھلائی سے تو ہے نا۔“

”جی، وہ تو ہے۔“

”بس تو پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ تم پاکستانی اور میں کشمیری۔ ہمارے دل تو ایک ہی ہیں نا اور ہم ایک ہی کلمے کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔“ آغا جان سچ سچ بہت کشادہ دل کے مالک تھے۔

”میں نے بنجامن سے بات کی تھی۔ موجودہ حالات بے شک پریشان کن ہیں لیکن میرے لیے ان حالات کی وجہ سے ہی بنجامن سے بات کرنا مزید آسان ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ میں ان حالات میں عمار کو کشمیر میں رکھنا مناسب نہیں سمجھتا اس لیے بہتر ہے کہ تم اسے کہیں باہر بھجوا دو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ اس کا زیادہ کاروبار مشرق وسطیٰ میں ہے تو تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔“

”یہ بہت اچھا کام کیا آپ نے۔ میں براہ راست اسرائیل نہ بھی جاسکا اور کسی قریبی ملک میں بھی پہنچ گیا تو آگے کی راہ نکال لوں گا۔“ وہ سن کر خوش ہو گیا۔

”تمہارا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے نا؟“

”جی بالکل۔ ہمارے انڈیا میں ایجنے کا ٹیکس ہیں اس لیے اس طرح کے سارے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ جادو، میرا مطلب ہے جبار علی نے جب عمار بچنے کی تجویز دی تو اس تجویز کو قبول کرنے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ یہاں سے سارے انتظامات کرنا ہمارے لیے نسبتاً آسان تھا۔ پھر مسٹر جونا تھن کی مدد شامل ہونے سے مزید آسانی ہو گئی۔“ وہ جمرے کے پانی پر نظر میں جمائے ان کے سوال کا جواب دینے لگا۔ مشکل حالات کے باوجود کشمیر کا بے

کوشش نہیں کی؟“

”میرا آج کل زیرِ نگرانی ہونا چاہیے ہے اس لیے میں اپنے سارے راتوں سے لاطیف بنا ہوا ہوں اور کسی طرح کی معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔ حجاز بھی اس بات کو سمجھتا تھا۔ بنیان کی کھاتات اور گواہی اسے سلاخوں سے باہر توڑے آئی تھی لیکن وہ ٹھوک و شہادت کی زد میں تھا اور اس کی وجہ سے آغا گل بھی۔ اسے اس وقت مجبور یوں اور مضطربوں میں جکڑے کشمیریوں کی طرح ہی کا محسوس اور کار ہوا۔

☆☆☆

اس جنگ و تارک اور سلین زروہ خانے میں موجود ان چار نفوس کے لیے عمل کر سانس لیتا بھی محال تھا۔ وہاں ایک ممکن تھی جو طبیعت میں بیزاری پیدا کرتی تھی اور سلین اور تارکی کی وجہ سے قوتوں میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ تہ خانے میں بجلی کا کشش تھا لیکن کبیر نے انہیں بلب روشن کرنے سے منع کیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر کسی دروازے روشنی باہر چلی گئی تو کسی کو ان کی وہاں موجودگی کا شک ہو جائے گا۔ وہ شخص زروہ کے بلب کی روشنی میں گزارہ کر رہے تھے اور اتنی احتیاط سے چلتے پھرتے تھے کہ کوئی آہٹ پیدا نہ ہو۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اچھی میزبانی نہیں کر سکوں گا اور آپ کو یہاں تھوڑی سی تشریف میں گزارہ کرنا پڑے گا۔“ کبیر نے انہیں یہاں ٹھہراتے ہوئے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے ایسے ضرورت کے ساتھ اس طرف آنا جاتا دیکھ کر کوئی کوجنب میں پڑ جائے اس لیے ہر ممکن احتیاط سے کام لے رہا تھا لیکن ممکنہ حد تک انہیں سہولیات بھی فراہم کی گئیں۔ ستر، ضرورت کے کچھ برتن، خشک میوہ جات اور پانی..... یہ وہ بنیادی ضرورت کی چیزیں تھیں جو اس نے کسی نہ کسی طرح انہیں فراہم کر دی تھیں۔ موقع پا کر عمل دوش کے ہاتھ کا پکا پکا کھانا بھی ان تک پہنچا دیتا تھا لیکن تین دقت کا تازہ کھانا کھانے کی عیاشی بانی نہیں رہی تھی۔

”اتنی چھوٹی سی جگہ پر رہتے رہتے میری ٹانگیں اکڑنے لگی ہیں۔ مجھے تھوڑی دیر باہر جا کر کھینے دینا۔ میں باہر جا کر تازہ ہوا میں سانس لیتا چاہتا ہوں اور روشنی میں جزدوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس تاریکی میں وہ روتے ہوئے ایسا لگے گا جیسے میں اندھا ہو چکا ہوں۔“ کل ان کا چھوٹا بھائی ہرام ضد پر اڑا کھتا۔ ماں نے بڑی مشکل سے اسے

سمجھا بجا کر ضد سے باز رکھا لیکن یہ سوال تو سب ہی کے ذہن میں تھا کہ آخر وہ کب تک اس جگہ پر یوں قید یوں کی طرح روہ سکتے ہیں۔ باہر اگر جان جانے کا خطرہ تھا تو یہاں بھی گٹ گٹ کر دم نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو چلا تھا۔ کیم کے سامنے اس مسئلے کو رکھا گیا تو وہ بولا۔

”آپ کی بات بالکل درست ہے۔ واقعی اس جگہ کی کانزادہ دن رہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ اگر آپ لوگ محفوظ نہیں رہیں گے اور میرے پاس اس کے سامنے کوئی اور ٹھکانا موجود نہیں ہے۔“ وہ چاروں ہی جانتے تھے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

”میں کو شش کرتا ہوں کہ میرا کسی حریت پسند تحریک کے دوست سے رابطہ ہو جائے۔ عام آدمی کی نسبت ان کے پاس بھر بھی تھوڑے بہت وسائل ہیں اور وہ آپ لوگوں کے لیے کسی محفوظ مقام کا انتظام کر سکتے ہیں۔“ وہ انہیں ایک آس سی دلا کر چلا گیا اور آج دوپہر میں بس ڈراما کی ذرا کھانا پہنچانے ہی آیا تھا۔ اس کا پہنچایا ہوا کھانا ٹھنڈا ہی سمی، پر اتنا تھا کہ رات کو بھی علمیری کے کام آگیا تھا۔ صرف پری دوش تھی جس نے روٹی نہیں کھائی تھی اور بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے چند خشک خجانبوں پر گزارہ کر لیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے حصے کی روٹی صبح بہرام کے کام آجائے۔ وہ ویسے ہی اس جبر اختیار کی جانے والی قید سے بیزار تھا۔ ایسے میں بھوک کے حفریت کا شکار ہو جاتا تو ان کے لیے اسے بھلانا اور بھی مشکل ہو جاتا۔ دو بیٹیوں کے بعد خاصے وقفے سے پیدا ہونے والے بہرام کو یوں بھی جھٹل کے چمالے کی طرح پالا گیا تھا اس لیے وہ کچھ نازک مزاج بھی تھا۔

”میری ذرا سی جذبائیت نے میرے پارے خاندان کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ بری وٹس ماں کے ساتھ ستر پر لیٹی اس وقت کے لیے بچھڑا رہی تھی جب وہ جذبات میں اندھی ہو کر رات گئے عمار کے لیے کھانا لے کر آغا گل کے کمر کی طرف چل پڑی تھی۔ ایک تو غیر عینی حالات سے پیدا ہونے والا ذہنی دباؤ تھا، دوسرے خالی پیٹ بھی پریشان کر رہا تھا اس لیے خند اس کی آنکھوں سے دور تھی اور وہ بہت کچھ سوچتی جا رہی تھی لیکن اس کیفیت میں بھی اسے اس بات کا خیال تھا کہ اس کی اندرونی بے چینی ظاہر نہ ہونے پائے۔ وہ ماں کی نیند خراب ہونے کے خیال سے انھیں سوئے بالکل سناکت لیتی ہوئی تھی۔ یوں تو اس نے خانے میں دن رات تقریباً بارہ گھنٹے تک قدرت کے عطا

کردہ نظام اور خود اپنے برسوں کے معمول کے باعث وہ لوگ مقررہ اوقات میں سونا چکا اور کھانا پینا انجام دیتے رہتے تھے۔ اب بھی قدرت کی طرف سے جسم میں چلتی جاتی تھائی کھڑی نے طے شدہ معمول کے مطابق سب کو سونے کے لیے لیٹا دیا تھا اور اس نئے خانے میں موجود چاروں نفوس میں سے صرف وہی تھی جو اس پہر جاگ رہی تھی۔

اجا تک ہی آہٹ ہوئی تو وہ چونک گئی اور پٹ سے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

کپڑوں کی ہلکی سی سرسراہٹ نے اسے بتایا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی ہے جو اس وقت جاگ رہا ہے۔

”کون؟“

سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اپنے ساتھ کوئی ماں کی گہری سانسیں تو وہ سن رہی تھیں اور باپ کا معلوم تھا کہ وہ اپنی گہری تیندو سننے کے عادی تھے مگر اگر انہیں چکا جانے جائے تو جبر سے پہلے درمیان میں کسی صورت نہیں اٹھتے تھے۔ ”بہرام! آ“ انہیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بالآخر اٹھنے والے کا بیولا دکھائی دے ہی گیا۔ ”اس وقت چپکے چپکے کہاں جا رہا ہے؟“ بہرام نے حد احتیاط سے بالکل دبے قدموں حرکت کر رہا تھا اس لیے وہ یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ کسی حاجت کے باعث اٹھا ہے۔ یوں بھی اس کا رخ تیرخانے کے ایک کونے میں بنے بیت الخلاء کے بجائے اس جانب تھا جہاں تیرخانے سے اوپر جانے والی سیڑھیاں موجود تھیں۔

”ادو میرے خدا یا! اس کے دماغ سے باہر جا کر کہلی
نفا میں سانس لینے کی بات لگتی نہیں ہے اور یہ اس وقت چپکے
سے باہر جا رہا ہے۔“ اسے معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی لیکن
اس نے بہرام کو روکنا اور نوکنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور
چپ چاپ اپنی جگہ بیڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ اتنی احتیاط
سے کام لے رہا تھا کہ اگر وہ جاگ نہ رہی ہوتی تو اسے اس
کے اس طرح جانے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ زینہ کے کمرے کے
خانے کا راستہ کھول کر باہر نکل گیا تو وہ خود بھی اسی کی طرح
احتیاط سے بستر سے اٹھی اور اوزار و سنی کو اچھی طرح اپنے گرد
لیٹھنے ہوئے زینہ چڑھ گئی۔ خانہ اوزاروں والے کمرے
میں کھل رہا تھا اور کمرے کا دروازہ بہرام کھلا چھو گیا تھا۔ وہ
بھی کھلے دروازے سے باہر چلی آئی۔ باہر آتے ہی ٹھنڈی
اور تازہ ہوا کا جھوٹکا جسم سے ٹکرایا تو اسے بہت اچھا لگا اور
بے اختیار ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔
”بہرام کہاں چلا گیا، اسے دیکھتی ہوں، اسناہ ہو کر

زیادہ آگے نکل جائے۔“ چوتھے بھائی کے خیال نے اسے فکر میں مبتلا کیا تو سب بھول بھال کر اس کی تلاش میں قدم آگے بڑھائے۔ چڑھتا چڑھتا اس لیے رات کا وقت ہونے اور کوئی منصوبہ روشنی نہ چلنے کے بار چڑھتا کھپ اندر صرا نہیں ہو رہا تھا کہ کچھ دکھائی نہ دے۔ اس کی نظروں نے جلد ہی بہرام کو جالیا۔ وہ بارش کے چھانک کی طرف جا رہا تھا۔

”مجھے اسے روکنا ہوگا۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ باہر نکل کر کسی مشکل میں گھر جائے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتی اس کے پیچھے لگی۔ واکیں بائیں ایک خاص ترتیب میں لگے سیب کے پتروں نے حسرت سے اس دھرتی کی بیٹی کو دیکھا جس کی مٹی میں وہ تاثیر تھی کہ اس کا تقابل صرف جنت سے ہی کیا جاسکتا تھا۔ روئے زمین پر دوسرا کوئی خطہ بھلا کشمیر کی مثل کہاں تھا۔ اس دھرتی سے جنم لینے والا حسن بے مثال تھا تو نمونے والے ذائقے لا جواب۔

لا جواب ڈالنے والے بیوں کے وہ بیڑا اگر بول سکے تو اپنی دھرتی کی بیٹی کو پکار کر یہاں سے کہیں دور بھاگ جانے کا مشورہ دے لیکن چونکہ وہ بول نہیں سکے تھے تو ان کے نصیب میں بے بسی سے سب دیکھتے رہنا ہی لگھا تھا۔

”بہرام!“ اپنی جانب بڑے خطرے کی ٹوسو گئے بغیر ہی پری دوش نے دلی آواز میں بہرام کو پکارا لیکن اس کی پکار بہرام تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ ان گاڑیوں کے غراتے آنجنوں کی آواز میں کم ہوئی تھی جو ابھی ابھی وہاں پہنچی تھیں اور جن سے بھارتی سپاہی اچھل اچھل کر باہر کور ہوئے۔

پری دوش کا دل اچھل کر قفل میں آگیا۔ بہرام بھی ان آوازوں کو سن چکا تھا اور دھک کر راہنی جکڑ کر گیا تھا۔

”بھابھا بہرام! ابھا گوادر ان بیڑوں کے درمیان کہیں جا کر چھپ جاؤ۔“ وہ جواب تک بہرام کو بلاطم رکھنے کی خاطر اس کے پیچھے بہت احتیاط سے آ رہی تھی۔ پوری رفتار سے دوڑ کر اس تک پہنچی اور فطری لہجے میں اس سے کہا۔

”پہلے دیکھتے تو دیں آپا کہ کون ہے؟“ وہ مضطرب تھا لیکن پری دوش جتنا نہیں۔

”دیکھنا کیا ہے میرے بھائی! میں ان بیخیز یوں کی کو
 کو یہاں سے بھی محسوس کر سکتی ہوں۔“ باہر صبح لائیں روز
 ہونا شروع ہو گئی تھیں اور کوئی دم نہیں جاتا تھا کہ وہ چھانک
 تو ذکر اندر مٹ آتے۔

”آپ..... آپ بھی میرے ساتھ چلیں آیا“ بہرا
نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ پیچھے لے جانے کو ششکی۔
”نہیں، تم جاؤ۔ میں جا کر اماں اور بابا کو خبر دوں۔“

بہترین تحریریں، اہم جواب زوداد اور
ان کی داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگوشی کا مہار اور سروری ہے

سیرگزشت
ماہانہ

مارچ 2024
کی شگلیاں

نوائے حیات

زویا صفوان کے قتل کے ایک
معروف ادیب کی سوانح حیات

کاوان وکیت

معروف کارطابرجا وید مغل
کی روداد حیات

ظابطی

احمد نعمان شینے کی دلچسپ
تحریک عن ظابطی کے قتل ہوا

سیرت

معروف اداکار محمد علی کی
سیرت و کنوین کا تذکرہ خاص

السید عتیق

احمد سلیم سلیم کی لہو گرما
دینے والی طویل ترین تحریک

عزت دار

فوج انیس کے قتل کی خبر
آفرینی ایک مروج سچ بیانی

سیرت

بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات

بننے والی مظلوم عورت کو دوسری سانس لینا بھی نصیب نہ ہوا۔
”بزدلو! ایک عورت کو کوئی مار کر کون سی بھادری کا
ثبوت دیا ہے تم نے۔ ماں کا دودھ پیاتے تو آؤ اور ہتھیار
چھیک کر کسی مرد سے لڑو۔“ زندگی کی سانس کو یوں ہل بھر
میں اپنی نظروں کے سامنے دم توڑتے دیکھ کر شیر خان کا
دماغ مدد سے الٹ گیا اور وہ سب کچھ بھول بھال کر
لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے اس بے بس اظہار پر ان
لوگوں نے زوردار قہقہہ لگایا پھر شر اس کے سین سامنے کھڑا
ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”سنئے مجھ سے پہلے چراغ خوب پڑھنا ہے۔ تیرا
بھی کچھ وہی حال ہے۔ چل پھر کھانا چھوڑ، ہم تجھے بھی وہیں
پہنچا دیں گے جہاں تیری چٹی اور بانی کا پر یواری موجود ہے۔“
اس نے رائل کی نال حاجی شیر خان کے سین پر رکھی۔
”دیکھا مطلب؟ کیا کیا ہے تم نے میرے بچوں کے
ساتھ؟“ شیر خان رونے والا ہو گیا۔

”ہم نے غدار کی سزا سنائی ہے حرام زادوں نے۔
ہمارے مجرموں کو پناہ دی گئی تھی مگر پناہ نہیں رہی۔ مار آئے ہیں
ان کے لیے دھڑی پر کہیں کوئی پناہ نہیں رہی۔ مار آئے ہیں
ان غداروں کو اور اب تمہاری باری ہے۔“ شرانے دیوانگی
کے عالم میں اس کے چہرے پر رائل کے کئی بیٹ مارے۔
شیر خان کو اگر جدو سپاہیوں نے جکڑا ہوا تھا پھر بھی وہ پھر گیا
اور خود کو ایک جھگڑے سے پھراتے ہوئے شرانے کا گلا پکڑ لیا۔

”خون لپی جاؤں گا میں تیرا۔ سلوں سے تم ہمیں ڈس
رے ہو، اب تمہاری باری ہے۔“ دیوانگی میں وہ اس زور
سے شرانے کا گلا کھونٹ رہا تھا کہ لحوں میں اس کے ہاتھ چر
ڈھیل پڑ گئے تھے اور حلق سے خرخرات کی آوازیں نکلنے لگی
تھیں۔ کئی سپاہیوں نے زور لگا کر اسے شرانے الگ کرنے
کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ جبر کی انتہا تھی کہ
ایک سید سادہ آدمی مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔

”گولی بارودا ہے۔“ شرانے کی جان پر پڑنے دیکھ کر حکم
صادر کرنا پڑا۔ گولی شیر خان کی کھوپڑی میں اتری تو شرانے
خرخرے پڑے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ
کسی کتے ہوئے شہر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

اور شرانے پر دباؤ بننے سے ایک بار پھر جی اٹھا اور کسی
ہانے ہوئے کتے کی طرح منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔
ذرا حالت سنبھلی تو شیر خان کے مردہ وجود کو شوکر مار کر چٹا۔

”کہاں ہے اس کی لونڈیا؟ جلدی سے لے کر آؤ
اسے۔ اس کی لاش پر لٹا کر اس کی لونڈیا کا بلات کار نہیں کیا تو

”اس طرح چپ چاپ رات گئے وہ کہاں اور کس
گھر؟“ حاجی شیر خان کو اپنے سوال کا جواب تو نہیں ملا
پھر چلتی گولیوں کی آواز نے ایک بار پھر دل کو لرزادیا۔
”میرے بچے۔“ متاثرہ کر پیکاری اور دنیا کے
خوف کو ہل پھٹ ڈال کر ایک ماں کو اپری طرف دوڑا
حاجی شیر خان جس کا سب کچھ داہر لگ چکا تھا، اب وہاں پھر
کیا کرتا۔ وہ بھی بیوی کے پیچھے ہی بھاگا۔ دھانے کا کھلا دار
اور اس سے آگے کرے کا پوٹ کھلا دروازہ سب کو اپنی دوسری
رہے تھے کہ اندر کے جس اور اندر سے سے گھبرائے ان کے
بچے مکمل نفا کی خواہش میں باہر نکلے تھے اور.....

اس اور سے آگے سوچنے کا انہیں حوصلہ نہیں تھا لیکن جو
سوچا نہیں جاسکتا تھا وہ حقیقت کے روپ میں ان کے سامنے
تھا۔ مکمل دروازے سے باہر تیز روشنی اور اس روشنی میں
دکھائی دیتی ایک کے پیچھے ایک کھڑی فوجی گاڑیاں۔ ان
دووں کے دل اس منظر کو دیکھ کر بری طرح ڈوب گئے اور
انہوں نے وہاں موجود بھارتی سپاہیوں کے ہجوم میں پریوش
اور بہرام کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ہی وہاں موجود
نہیں تھے۔ ایک طرف اطمینان ہوا تو دوسری طرف دماغ
میں سوال بھی گونجنے لگے کہ آخروہ دونوں کہاں ہیں؟

”پنڈز اپ۔“ یہ کہیں ممکن تھا کہ وہ ان خون
بھریوں کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہے۔ ایک ساتھ
کئی ہندوئیں ان کے اوبرتن گئیں۔

”بزدل چوہے مل میں چھپ کر بیٹھے تھے۔ کیا سب
رہے تھے تم کہ بھارت ماما کے سپوت کو مار کر خود
جاؤ گے۔“ شرانے کا غصہ ان پر نکلنے لگا اور اس نے بلا تکلف
حاجی شیر خان کو رائل کے کئی بیٹ دے مارے۔

”ہم نے کسی کو نہیں مارا ہے۔ اس خبیث کو اس کے
کرموں کا بدلہ دینے کے لیے اللہ نے ہمارے لیے فرشتے
بجھا تھا۔ ہم بے گناہ تو ہیں تم ظالموں کے ظلم سے بچنے کے
لیے پیچھے پھر رہے تھے۔“ اب کچھ نہیں رہا تھا جسے بچانے
کی آس میں اپنی آواز کو گھونٹا جاتا۔ بھارتی درندوں کے
غزے میں آنے کے بعد جرم کی امید رکھنا خود کو دھوکا دینے
کے برابر تھا اس لیے زبان پر بڑا قتل عمل گیا۔

”اس فرشتے کو بھی ہم ڈھونڈ لگائیں گے لیکن پہلے ان
زباںوں کو تو بند کر دیں جو ہمارے خلاف بیوقوفی رشتی
ہیں۔“ اس نے رائل کی نال جارحانہ انداز میں پریوش کی
ماں کے منہ میں گھسی اور گولی چلا دی۔ گولی کا زوہ کچھ ایسا
بنا کہ وہ تالو کو بھاڑتی ہوئی کھوپڑی سے باہر نکل گئی اور نشانہ

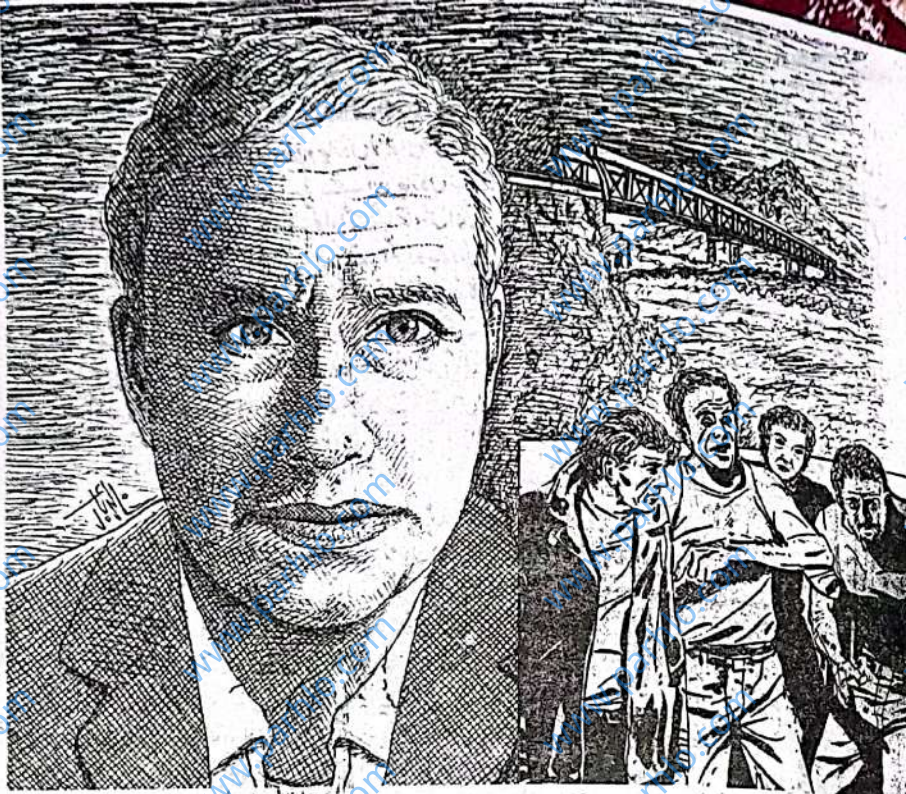
ہوں۔“ اس نے بہرام کو دائیں جانب دھکیلا اور خود جس
راستے پر چل کر یہاں آئی تھی، اسی راہ میں دوڑ گئی۔ سب وہ
وقت تھا جب ایک بڑی گاڑی نے گزری کے پھاٹک کو کر
ماری۔ کمزور سا پھاٹک پہلی ہی گزریں اپنے قبضوں سے اکھڑ
کر زمین پر ہی گویا۔ گاڑی غرائی ہوئی اندر داخل ہوئی اور
اس کی طاقتور ہیڈ لائٹس کی روشنی نے قوراعی دوڑتی ہوئی
پریوش کو چالیا۔ ایک ساتھ ہی گولیاں چلیں اور اس کے
دائیں بائیں سے سنسناتی ہوئی گزریں۔ گھبراہٹ میں
اسے ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر زمین پر گر گئی۔ گولیاں چلانے
والے اس منظر کو دیکھ کر وحشتانہ انداز میں قہقہے لگنے لگے۔
وہ چپا کو دبوچنے سے پہلے اس کے پھر پھڑانے سے لطف
اندوز ہو رہے تھے۔

”مرا جانا ہے مگر ان کے ہاتھ نہیں آتا۔“ نیچے گری
پریوش کے سامنے بربریت کی بے شمار داستانیں تھیں اس
لیے اسے فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ وہ گاڑی کے
اپنے قریب پہنچ کر کتے سے نکل ہی آئی اور ایک جانب دوڑ
پڑی۔ فوراً ہی ایک بار پھر گولیاں برسیں اور اس کے آس
پاس سے گزریں۔ وہ جانتی تھی کہ بھارتی سپاہیوں کا نشانہ
انتخاب کیا نہیں کہ اسے نشانہ نہیں بنائیں۔ وہ صرف اسے
ڈرمارے تھے اور اس کے ڈر سے لطف اندوز ہو رہے
تھے۔ انہیں اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ ایک آبرو مند لڑکی
کے لیے اس کی آبرو زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ
بھی موت کے ڈر سے بے نیاز اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے
سر پٹ دوڑ رہی تھی۔ یہ باغ اس کے بہنوئی کا تھا۔ وہ یہاں
بے شمار بار آئی تھی اس لیے اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس
وقت باغ کا کون سا گوشہ اسے پناہ دے سکتا ہے۔

”بھڑوسالی کوہ بھانجے نہ پائے۔“ گاڑی رک چکی
تھی اور اس میں سے بھارتی سپاہی اچھل اچھل کر باہر نکل
رہے تھے۔ یہ شرانے جو چلائی گئی گولیوں کو بے اثر جاتا دیکھ
کر زور سے چلایا تھا۔ اس کے سامنے اس کا جملہ پورا ہونے
سے پہلے ہی پریوش کے پیچھے دوڑ گئے۔

گولیوں کی آوازوں نے دھانے میں سوئے ہوئے
حاجی شیر خان اور اس کی بیوی کو بھی نیند سے جگا دیا تھا۔ وہ
ہڑبڑا کر اٹھے تھے اور فوراً ہی انہیں اپنے بچوں کی غیر
موجودگی کا ادراک ہو گیا تھا۔

”بہرام نہیں ہے، بہرام کی ماں!“
”پری بھی غائب ہے۔“ ماں کی آواز اندیشوں سے
لرز رہی تھی۔



بات سنو

عیق بختاری

اکثر بے حالات میں کم ہمتی اچھا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیتی ہے۔ وہ بھی فالج زدہ بیوی کے حامل لوگ... زندگی سے مایوس ہو کر موت کی طرف بڑھتے جا رہے تھے... ایسے میں کسی کے مہربان ساتھ میں موت کے منہ سے کھینچ کر زندگی کی طرف لوٹایا تو اچھا ہے لیکن کہ زندگی اتنی حقیر شے نہیں کہ اتنی آسانی سے ہاتھ سے دھکیل دی جائے۔

چند ٹھکرائے ہوئے بد قسمت لوگوں کی خوش آمدید

دن کے اجالے پر رات کی تاریکی چھانے کو تھی کہ ایک لوجوان اس نئی کے قریب آیا جو شور مچاتے، تیزی سے بچنے پانی کے اوپر بنا ہوا تھا۔ اس کے آنے کے بعد محض چند منٹ کے وقفے سے اسی کی عمر کے تین اور لوجوان وہاں آ گئے۔ تھے۔ ان چاروں کا ایک منہ تھا... خوشی کرنا۔ یہ نئی تھا

مارچ 2024

سپنس ڈائجسٹ 69

نہیں ہے۔" کل کی سولی اپنی جگہ لگی تھی۔ "چارہ ہے لہذا تاہم اس کے پاس۔ ان شاء اللہ کے آپریٹ سے پہلے ہی اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔" بارعام نے بحث کرنے کے بجائے رسالہ سے جواب دیا۔ انہیں بہت اچانک ہی مولیٰ کی بیماری کی خبر ملی تھی اس کے پتے میں پھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کا عرصہ سے تھا لیکن مولیٰ نے سب سے یہ بات چھپا رکھی اور دواؤں کی مدد سے اپنی تکلیف کو دبا رہی۔ شاید حوصلے میں پھٹی فٹش کی وجہ سے اس نے ایسا کیا تھا۔ اسے خیال ہو گا کہ اتنی پریشانی میں ماں باپ کے لیے ایک اور پریشانی پیدا نہ کرے لیکن اس کے اس طرز عمل کا نتیجہ اس طور سامنے آیا تھا کہ ڈاکٹرز نے فوری آپریشن کو ناگزیر قرار دے دیا تھا۔ اتنا بڑا کام ملازمین کے سہارے انجام نہیں پاسکتا تھا اس لیے اطلاع ان لوگوں تک پہنچا دی گئی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر صداقت شاہ نے کہا تھا۔

"میں اور تمہاری اماں سائون پاکستان واپس چلے جاتے ہیں۔ تم دونوں بہن بھائی، نیلی اور اعظم کے ساتھ رہو۔ کل شیک ہو جائے تو پھر وطن واپسی کا پروگرام بنالیا۔" لیکن اس موقع پر کل مضمر پڑاؤ لگی تھی اور بہن کے پاس واپس جانے کی رٹ لگا لی تھی۔ ہمیشہ کی مفاہمت پسند کل کا یہ انداز سب کے لیے ناپسندیدہ تھا لیکن پھر کوئی اس سے رک جانے پر زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت نازک وقت سے گزرتی تھی اور اب بھی معذوری کا بوہڑا اٹھائے تھیں طور پر شدید ہنسی دباؤ سے گزرتی تھی اس لیے اس کو کسی ایسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا جس سے اس کے ذہنی دباؤ میں اضافہ ہو جائے۔ مجبوراً ہی کسی، اس کی بات مان لی گئی تھی اور وہ سب وطن جانے والی فلائٹ میں سوار تھے۔

کل کی حالت کے پیش نظر عالم شاہ بطور خاص اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کی اضطرابی حالت کو دیکھ کر اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ ہی اسے مولیٰ کے سوا کچھ بھائی دے رہا ہے۔ "گنتی دیر اور لگے گی؟" وہ ڈوگر ہی بہن کے پاس جاری تھی لیکن چاہتی تھی کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ پلک جھپکنے میں اس تک پہنچ جائے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیں

میرا نام بھی سٹرائیکس۔" جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا، بری وٹ کے پیچھے دوڑنے والے اس کے سپاہی پری کے سر پر کھینچے تھے اور یوں لگتا تھا کہ لگے ہی ملے وہ ان کی گرفت میں ہوئی لیکن پھر مل میں ہی بازی پلٹ گئی۔ سپاہیوں کے ہاتھ اس کے جسم کو چھو پاتے، اس سے کہیں وہ بار کی پری جانب اس کو بھی کی سٹرائیکس پر رہ جاسکتی تھی جسے اپنی آخری پناہ گاہ تصور کر کے اس طرف دوڑی آئی تھی۔

"موت کرو، سب شیک ہو جائے گا۔" عالم شاہ نے مسلسل قہقہے کھاتی کل کی قلاب سے جھانکی ٹھمرند آگے بڑھ کر ایک ٹھڑائی اور اسے لگی دی۔ "ان شاء اللہ!" جواب میں وہ دل کی گہرائیوں سے یوں پھر اپنی پریشانی کی وضاحت دے پئے ہوئے ہوئی۔ "مولیٰ چھوٹی ہے۔ اس پر کبھی کوئی بڑے داری نہیں رہی اس لیے مجھے گھر ہر ہی ہے کہ وہ تھا اس مشکل اور تکلیف دہ وقت سے کیسے گزر رہی ہوگی۔ اسے تھا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ آپ، اماں یا بابا سامنے میں سے کوئی ایک تو اس کے پاس رک جاتا۔"

"ہاں لیکن مولیٰ..." "تم مولیٰ کو انٹرا سٹیٹ کر رہی ہو۔" عالم نے اسے بات نہیں کرنے دی۔ "اگر اعظم شاہ کی وفات سے لے کر اب تک بے شمار مشکلات آئی ہیں اور ہر مشکل وقت میں یہ مولیٰ ہی تھی جس نے بہت خوصلے سے کام لیا ہے۔ اماں سائون کو پر سکون رکھتا۔ انہیں سنبھالنا، حویلی کا نظم و نسق دیکھنا اور بابا سامنے کو مل اور حوصلہ دینا۔ یہ ساری وہ بڑے داریاں تھیں جو مولیٰ کی عمر سے بہت بڑی تھیں لیکن اس نے انہیں ایسے سنبھالا کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ کوئی بڑا مشکل کام انجام دے رہی ہے۔"

"لیکن اس وقت وہ مشکل اور تکلیف میں ہے تو ہم میں سے کوئی اسے سنبھالنے کے لیے اس کے قریب موجود

ی خود کشیوں کے لیے مشہور آئے روز کوئی نہ کوئی بد نصیب اپنی پریشانیوں سے تنگ آکر وہاں چلا گیا۔ وہاں کئی چائیں کھ چکا تھا اور آج وہ چاروں نوجوان بھی اسی محسوسیت کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ ان چاروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ایک گوارا نہیں لیا تھا، بس اپنی اپنی سوچوں میں مگن ہو کر رہے تھے۔ اگر وہ چاروں خود کشی کرتے تو اس کی ایک پر ایک وقت خارجہ کشیاں کرنے کا ایک ریکارڈ بن جاتا لیکن قدرت کو ان کی زندگی منکوحہ نہ ہل پر آئے کے محسوس نہیں کیجئے بعد جب ان میں کوئی ایک یا شاید چاروں چلا گیا لگنے ہی والے تھے اس اور اس و محسوس ماحول میں ایک آواز گونجی۔

”روا“
وہ چاروں چونک گئے اور اس تقریباً سنا سن کر اس کے پاس ایک شخص کو دیکھا جو بچپن سے ساتھ کے درمیان کی عمر کا تھا۔ اس انداز سے اس کی شکل اتنی واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔ دیکھ ہی وہ ان چاروں سے قدرے قائل پر سڑک کنارے کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیا تھا کہ وہ واقعی رک گئے اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو اور پھر اسے دیکھنے لگے۔ وہ شخص درخت کے نیچے سے نکل کر ان کے قریب آ گیا اور پھر کوئی تمہید باغ سے بولنے لگا۔

”تم یقیناً خود کشی کرنے آئے ہو۔ میرا خیال درست ہے نا؟“ ان چاروں نے اس کی اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں۔ ”ارے، تم بھی خود کشی کرنے آئے تھے؟“ وہ شخص پھر بولنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے، کرو خود کشی۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ بس میرا ایک چھوٹا سا کام کرو پھر میں نے ایک ضروری کام کرنا ہے۔ تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ پھر امیری ہیپل کرو پھر شوق سے مر جانا، پلیز۔“

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ ان میں سے ایک بولا۔ اس کی آواز مری مری سی تھی۔

”کیوں نہیں پریشان کر رہے ہو؟ جاؤ اور کھانا کھاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میں سب سہتا تھا۔ اسی دوران مجھے اور میں اپنے شوق میں سب سہتا تھا۔ اسی دوران مجھے اور میرے چار دوستوں کو ایک پارٹی میں گنار بجانے کے لیے کہا گیا۔ وہاں میری بڑی پڑی برائی ہوئی اور معاوضہ بھی ملا۔ بس اس بات سے میں اتنا نڈر ہو گیا کہ گھر اور ماں باپ کو چھوڑ دیا۔ میں نے سوچا کہ میں اب خود خوب ہنس سکتا ہوں۔ شہرت بھی مل جائے گی تو پھر کیوں گھر میں رہ کر ڈانٹ ڈپٹ سہوں اور اپنے شوق کی وجہ سے بار بار ملنے سنوں۔“ چہرہ کچھ دیر کے لیے رک گیا۔ وہ کچھ کھوسا حکما تھا جیسے پرانے دن اس کے سامنے پھرنے لگے ہوں۔ سب نہایت خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔

وہ بھی افریقہ کے علاوہ باقی تین ایسی پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ کوئی روئل دے سکے۔ وہ خالی خالی نظروں سے گویا سننے کی ڈیوٹی سر انجام دے رہے تھے۔ ”بولتے رہو۔“ افریقہ نے نرمی سے بولتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔ اسے لگا تھا کہ ماضی کے دنوں میں جا کر چہرہ شاید دھمی ہو گیا ہے۔ چہرہ ہلکا سا چونکا اور پھر بولنا شروع کیا۔

”میں واقعی آگے بڑھنے لگا، کئی فنکشن کیے۔ جو کمانا، اپنے گروپ کے ساتھ ہلا گلا کرتے ہوئے لڑا دیتا۔ میں بے فکر تھا کہ میرا فن مجھے ہمیشہ دولت دیتا رہے گا اور میں خوبصورت زندگی گزاروں گا۔ کچھ عرصہ تو ایسا ہی چلتا رہا پھر ایک روز ایک پارٹی میں ایک اور گنار سٹ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس کی عزت دیکھ کر مجھے جلن سی ہوئی۔ میری اور اس کی تو ٹھکان ہو گئی اور ایک دن لوہیت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں نے اس کے سر پر بول دے ماری۔ وہ زخمی ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے ساتھ ہمدردی دکھائی اور مجھے نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے مخالف نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے شدید مالی نقصان پہنچایا۔ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اسے معصوم اور مجھے ظالم کہا گیا۔ ٹھنڈے دل سے سوچا تو معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ احساس تو ہو گیا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ مختصر سے عروج کے بعد میرا عبرتناک زوال شروع ہو گیا۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، معروف ہوئے، ریٹائرمنٹ کے ساتھ ساتھ غیر معروف بچہوں اور لوگوں سے کام مانگا لیکن اب انکار اور بھوک میری قسمت میں گویا لکھ دی گئی تھی۔ بڑے کردار سے گھر چھوڑا تھا۔ واپس جاتے شرم آ رہی تھی پھر

”سبس ڈائجسٹ“ 70 مارج 2024

میں نے دو تین بار گھر رابطہ کیا لیکن ادھر سے سردمہری کا اظہار کیا گیا۔ اب حال یہ ہے کہ تقریباً تین سال ہو گئے ہیں مجھے خوار ہوتے ہوئے۔ تھوڑا بہت کام ملتا ہے اور میٹروں کام کے لیے ترستا ہوں۔ کوئی اور کام کرنا چاہا تو اس میں مجھے کامیابی نہیں ملی۔ میں اب اپنی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ ایک طرف یہ دکھ ہے کہ میرا شوق بری طرح ڈھیل ہو کر تقریباً مر چکا ہے اور دوسری طرف بھوک کا رونا اور ہاں، سب سے تکلیف دہ بات یہ کہ میں اپنے ہی ڈیڑی کے پیار اور توجہ کو ٹھکرا کر گھر چھوڑ کر انہوں کو گھونچا ہوں۔

”تم بھوکے ہو اس وقت؟“ افریقہ نے اچانک اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ چہرہ آہستہ سے بولا۔ افریقہ کو اس کی آواز میں بھوک کا درد اور تھابت محسوس ہوئی۔ ”ادو، رو۔“ میں ابھی آیا پھر تمہاری باقی بات سن رہا ہوں۔“ افریقہ کھڑا ہو کر بولا۔ محسوس چند قدم چل کر رک گیا۔ ”میں بس تین چار منٹ میں آ رہا ہوں۔ یاد رکھنا تم نے..... یعنی تم چاروں نے مجھے اپنی اپنی کہانی سنانے کے بعد ہی خود کشی کرنی ہے۔“ افریقہ مگر ان سے اس کے واپس آنے تک زندہ رہنے کی یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

”یاد ہے ہمیں۔ بس تم ذرا جلدی کرو۔“ ایک زندگی و جذبات سے عاری آواز نے کہا۔ افریقہ دس بارہ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چند بے تھے۔ ان میں برگرز، سیٹو، چارو، جوسز تھے۔ ”لو، یہ تم چاروں کے لیے ہے، کھاؤ۔“ چہرہ آہستہ باقی کہانی اس کے بعد ہی سنانا۔“ افریقہ نے ایک برگر لیتے ہوئے باقی سامان ان کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ چاروں انکار کر رہے اور پھر اسے ان کی منت ساجت کر کے کھانا پڑے گا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان سب نے بڑی جلدی کھانے کی چیزوں کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ وہ جو چند منٹ پہلے زندگی ختم کرنے والے تھے، بڑی رغبت سے کھانا کھانے لگے۔ افریقہ ان کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے محسوس ایک برگر ختم کرنے کے دوران وہ ساری چیزیں ختم کر چکے تھے۔

”لگتا ہے تم سب ہی نے صبح سے یا شاید کل سے کچھ نہیں کھایا۔“ افریقہ بولا۔ جواب میں وہ کچھ نہیں بولے۔ افریقہ نے غور کیا کہ جذبات و احساسات سے عاری چہروں پر تھوڑی تھوڑی سی زندگی کی رتس پیدا ہو گئی تھی۔

”سبس ڈائجسٹ“ 71 مارج 2024

پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ تو کیا نہیں کرنا چاہیے تھا؟“ جیمز نے کہا۔

میرا وقت ضائع ہرگز نہیں ہو رہا، بتایا تو ہے کہ میں
راست رہوں، مجھے تو کہا تھا میں لال رہی ہیں اور تم اپنا وقت ضائع
کر کے بھی تھوڑی دیر بعد خودکشی کر گئے ہو..... اور ہاں،
مجھے اس بات میں کوئی دو شبہ نہیں کہ تم اپنے ارادے پر قائم
ہو یا بدلو، ”الفریڈ نے نوراجواب دیا۔
”چلو، پھر میں اپنی جہاں نہیں سنا دیتا ہوں۔“ نیلی
آنکھوں والے نے گویا بے فکر ہو کر کہا۔ الفریڈ اس کی
بجانب متوجہ ہو کر دیکھنے لگا۔

پہلے دیکھیں

ساری چٹا سناٹی۔“
بچل کچھ نہیں بولا۔ وہ اپنے آنسو صاف کر رہا تھا۔
الفریڈ نے اسے اپنے پاس پڑی پانی کی بوتل پکڑائی۔
”میرا خیال ہے اب تم شروع ہو جاؤ۔“ بچل کو پانی
پکڑا کر الفریڈ اس شخص سے مخاطب ہوا جو سر جھکائے بیٹھا
اپنی اگلیوں سے اپنی پیشانی سے پہلا بلکہ رگڑ رہا تھا۔ اس نے
الفریڈ کی بات سنی ہی نہیں تھی حالانکہ اس سے قبل وہ بچل کو غور
سے سن رہا تھا۔
”میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“ الفریڈ نے اس کا گھٹنا
پکڑ کر اسے ہلایا۔

مارچ 2024ء

ڈانٹ پڑتی۔ میں روز روز کی اس معصیت سے نجات حاصل کرنے کے طریقے سوچنے لگا۔ ایک طرف بزنس کی کرنسی بگڑتی صورت حال، دوسری جانب گھریلو جھگڑے۔ میں تقریباً ڈپریشن کا مریض بن گیا اور انہی دنوں میری بیوی نے بے وفائی اور موطا چشمی کی انتہا کرتے ہوئے مجھ سے طلاق لے لی۔ اس نے دکھائی سے کہا کہ وہ کسی کو کمال شخص اور ایسے بے وقوف کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی جس نے باپ کا اتنا بڑا کاروبار برباد کر کے رکھ دیا۔ میں طلاق کے صدمے سے ابھی نکلنا تھا کہ ایک اور جھکا مجھے میری ماں نے زیا۔ اس نے مجھے جانکارد سے عاق کر دیا اور حکم جاری کیا کہ میں آفس میں قدم بھی نہ رکھوں۔ گھر میں بی سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ میرے شوہر کا کاروبار تباہ کرنے والا اسی سلوک کا سحق ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ براہ کرم تم میرے کام میں دخل مت دو۔ جو جیب خرچ چاہیے ہوگا، میں دے دیا کروں گی۔ میں نے ممی کو منانے اور سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ ممی نے بتایا کہ وہ ایک بہت سمجھ دار اور ذریک انسان کی خدمات لینے والی ہیں جو سارا بزنس سنبھالے گا اور ان کا کھویا ہوا وقار، مقام دوبارہ حاصل کرنے میں مدد دے گا۔

سینس دائجسٹ

مگر کون سے..... وہی جواب میرے ساتھ
کاروباری معاملات دیکھے گا۔ وہ بھی طلاق یافتہ ہے۔ کچھ
رقم ہے اس کے پاس، وہ ہمارے بزنس کو کافی سہارا دے گی
اور.....“ وہ میری جانب پورا اتر گئیں۔ “اور کیوں کا جواب
یہ ہے کہ مجھے میری لائف جس طرح میں چاہوں، گزارنے کا
حق ہے۔“ مئی بہت اجنبیت سے بولیں۔
”میرا ایک دم حاق کر دیا جانا، مئی کی رکھائی اور
بدلے بدلے انداز، سب سمجھ میں آگیا۔ میں سچ دہاب کہتا
ہوا مگر چھوڑ کر آ گیا کیونکہ مجھے دور تھا کہ گزشتہ بیویوں کے
برے حالات کی ڈپریشن سے زیادہ دلکشی کی ہماری زندگی
میں مداخلت نیچے اس بات پر مجبور کر دے گی کہ میں اسے
شوٹ کر دوں۔ اس واقعے کو اڑھائی ماہ ہو چکے ہیں۔ مگر
سے لائی رقم ختم ہو چکی ہے اور اب لگتا ہے زندہ رہنے کے
لیے کوئی وجہ نہیں بنی۔ اس لیے.....!“ کلارک نے آخر میں
بات ادھوری چھوڑ دی۔
”تو اس لیے تم نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا؟“
الفریڈ نے کہا۔

الفریڈ نے سوال کیا۔
 ”ایڈی!“ مختصر جواب دیا گیا۔
 ”تم بتاؤ کس نے ہمیں ستایا ہے؟“ الفریڈ نے پوچھا۔

”سب نے..... سب نے ستایا ہے۔“ ایڈی کی جواب دے کر خاموش ہو گیا۔

”تم وہ درجہ تفصیل سے بتاؤ..... جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا۔“ الفریڈ گہرا سہاوا سے یاد دل رہا تھا کہ عمل کہاں کی بات لے ہوئی ہے۔

”ان تینوں کے دکھن کر اعزازہ ہوا ہے کہ ہمارے ارد گرد کے لوگ کیسے رفتہ رفتہ اپنے رویے اور باتوں سے ہمیں موت کی جانب دھکیلے ہیں۔“ اپنی بات کہنے کے بجائے ایڈی نے جمل، جیمز اور کلاڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ خلاف معمول تھا۔ الفریڈ چونک اٹھا کہ بجائے کھوئے کھوئے اعزازے اپنی خودکشی کے فیصلے کی وجہ بتانے کے اس نے پانی تین کہانیوں کا خصوصی فوٹس لیا ہے۔

”اس کا مطلب ہے تمہارے ہمایا تک فیصلے کے پیچھے بھی ارد گرد کے لوگ ہی ہیں۔“ الفریڈ نے اسے آگے بولنے کا کہا۔

”ہاں، ایسا ہی ہے۔ ان تینوں کی طرح مجھ پر بھی برا وقت آیا تو نہ صرف معاشی مسئلہ بنا، ساتھ ہی انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا، وہاں فراڈ ہو گیا۔ جب انٹیش کی کئی تو اصل جرم قتل کیونکہ اس کے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے جبکہ مجھ پر سارا الزام ڈال کر مجھے اور میرے دو داد دوستوں کو پھنسا دیا گیا۔ ہمارے گرد ایسا جال بنا گیا کہ جھوٹا کس لوگوں کو کچا لگنے لگا۔ جو جمع ہوئی تھی، عزت تھی، اس کیس کی نذر ہو گئی۔ جان تو جیسے تیسے چھوٹ گئی لیکن سوسائٹی میں بہت بدنامی ہوئی۔ مجھے لوگوں نے عجیب نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں جس کلب کا ممبر تھا، انہوں نے میری ممبر شپ ختم کر دی، یہ کہہ کر کہ تمہارے یہاں آنے سے کلب کی ساکھ متاثر ہوئی ہے۔“

”تو تم نے انہیں بتایا کہ یہ جھوٹا کیس تھا؟“ جمل نے اچانک اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔ الفریڈ پھر چونکا۔

”بتایا تھا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا اور یقین تو.....“

ایڈی نے رک کر کمری سانس لی۔

”یقین تو میری فیملی بھی کرنے کو تیار نہ تھی۔ میرے وکیل باب کو غصہ تھا کہ میں نے اس کا نام ڈیو نے میں کوئی کمر نہیں چھوڑی۔ میری سوشل درکاروں نے مجھ سے ناراض رہنا شروع کر دیا۔ میری لاکھ صفائیوں کے بعد بھی وہ یہ کہتے رہے کہ آخر انہوں نے تم پر اور تمہارے گروپ پر ہی کیوں الزام لگایا۔ کچھ تو ہو گا ہی۔“

جواب، جمع ہوئی، عزت، سب ختم ہو گئے۔ ارد گرد والوں کی طنزیہ نگاہیں اور جملوں نے توڑ

مجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے گھر چھوڑا اور پندرہ دنوں بعد واپس آ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا جائے۔

”یعنی تم نے بھی انہوں کے رویے سے تنگ آ کر فیصلہ کر لیا؟“ جیمز اٹھ کر ایک اور خالی بیچ پر جاتے ہوئے بولا۔

”وہ میرے اپنے تھے ہی نہیں۔ وہ تب تک میرے ساتھ تھے جب تک میں گاڑی اور ہینڈل نہ خواہ دلاتا تھا۔ چونکہ یہ چھٹا، وہ مجھ سے دور ہو گئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تمہارے می ڈیڈی کی تم سے لاتعلقی ہو گئے۔ جیسے کلاڑک کی بد قسمتی اس کا قصور ٹھہرا کر بیوی اور ماں نے الگ پیچیدگیاں دیاں اور جمل کی گرل فرینڈ نے امیر دوست کے ملتے ہی اس سے آنکھیں پھیر لیں۔“ ایڈی دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

”یہ دراصل قسمت کا چکر ہے۔ جب خراب ہوئی ہے، کچھ بھی ٹھیک نہیں رہتا۔“ جمل نے آہ بھری۔

”میں کہتا ہوں، لعنت ہے ان سب پر جنہوں نے ہمیں اس آج تک پہنچا دیا۔“ کلاڑک نے غصے سے کہا۔

الفریڈ بڑے غور سے ان کی گفتگوں پر رہا تھا۔ ان سب نے آپس میں بات کرتا شروع کر دی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلتا شروع ہوئی۔ الفریڈ نے پل کی سائڈ پر گئے درختوں کے پتوں کی جانب دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔

”تم چاروں کا شکر ہے..... تم نے میری بات مانی اور مجھے اپنی اپنی کہانی سنائی۔ اب میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“ الفریڈ بات کرتے ہوئے جیمز کی جانب دیکھ رہا تھا جو بیچ پر لیٹ کر ستاروں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔

”کون سی بات؟“ کلاڑک نے سوال کیا۔

”بات کیا..... بس ایک درخواست ہے۔“ الفریڈ تھوڑا سا ہچکچا کر بولا۔

”درخواست..... کیا مطلب؟“ جمل نے پوچھا۔

”وہ..... تم اب بھی خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ میرا مطلب ہے کہ میرا کام تو ہو گیا..... کیا اب تم پانی میں کودنے والے ہو؟“ الفریڈ تھوڑا رک رک کر بولا تو وہ چاروں یوں جو گئے جیسے انہیں کافی دیر سے کچھ بھولا ہوا تھا اور اب کسی نے یاد دلوا دیا۔ چاروں نے ایک دوسرے کو اور الفریڈ نے ان چاروں کو بڑے غور سے دیکھا۔

”ہاں، میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ میں ضرور خودکشی کروں گا۔“ جمل نے حتیٰ الجسہ میں کہا تو لیکن..... وہ اپنی جگہ پر جمنا بیٹھا تھا۔ اس نے ناگہم سمیت کھینچ کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔

”اب اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“ جیمز

دھیرے سے بولا۔ وہ بدستور بیچ پر لیٹا آسمان کو کھنک رہا تھا۔

”ہم تو تمہارے رویے پر کے ہوئے تھے ورنہ اب تک تو.....“ کلاڑک بولا۔

”میرا خیال ہے اب اس دنیا کو چھوڑ ہی دیں۔“ ایڈی نے کہا۔ وہ دور سے بول پر روشنیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ الفریڈ ہلکا سا ہلکین کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

”اچھا تو اب میری درخواست سنو۔“ الفریڈ کا لہجہ بہت نرم اور ملجیلا تھا۔ وہ چاروں بولے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”دیکھو، تم چاروں جوان ہو۔ ابھی زندگی میں کچھ خاص نہیں دیکھا۔ میرے پاس تمہارے مسائل کا حل ہے۔ اگر تم اس سلسلے میں میری کچھ تجاویز سن لو تو مجھے یقین ہے کہ تم خودکشی کرنے سے رک جاؤ گے۔“

”تم ہمیں خودکشی کرنے سے روک رہے ہو؟“ ایڈی نے سناٹ لے کر پوچھا۔

”ہاں، لیکن فی الحال تین دن کے لیے۔“ الفریڈ نے کلاڑک کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب، تین دن کے لیے؟“ کلاڑک نے چونک کر پوچھا۔

”دیکھو، تم صرف تین دن کے لیے خودکشی کرنے کو ملتوی کر دو۔ اگر میں تمہارے مسائل کا حل دے کر تین دن میں تمہیں زندگی کی طرف مائل نہ کر سکا تو میں خود تمہیں اس بل پر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ایک بار..... ذرا میری بات پر غور کرو۔“ الفریڈ ایک بیچ کی پشت پر ہاتھ جمائے کھڑا یوں بول رہا تھا جیسے پھر دے رہا ہو۔ وہ چاروں سوچ میں پڑ گئے۔ پل کے نیچے سے بہتے پانی کا شور بڑا واضح سنائی دے رہا تھا۔ الفریڈ بڑے تحمل سے ان کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

”میں تو جینا چاہتا تھا لیکن مجھے مجبور کیا گیا۔“ جمل بولنے لگا۔

”میں صرف تین دن..... صرف تین دن کے لیے رک رہا ہوں۔“ الفریڈ جلدی سے بولا۔

”ان تین دنوں میں ہم کہاں رہیں گے..... کہاں سے کھا کھیں گے؟“ جیمز نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

الفریڈ کھل کر مسکرایا۔

”میرے گھر دے سکتے ہو کھانا پیانا سب فری..... تو کیا چلیں؟“ وہ چاروں ایک دوسرے کو چہرے دیکھتے رہے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہاں سے کچھ ہی دور میرا گھر ہے۔ ہم پیدل چل کر جا سکتے ہیں۔“ الفریڈ گہرے چلنے ہوئے کہا۔ وہ چاروں بھی اس کے ساتھ چلنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد سڑک سے نیچے اترنے کے بعد وہ ایک بڑے سے پرانی طرز کے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ الفریڈ نے گیٹ کھولا تو وہ سب اندر داخل ہو گئے۔

”کیا تم اکیلے رہتے ہو؟“ کلاڑک نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں، بالکل اکیلا۔“ الفریڈ ہلکا سا مسکرایا۔

”تمہاری فیملی کا کوئی فرد تمہارے ساتھ نہیں رہتا؟“

جمل نے پوچھا۔

”نہیں..... چلو آؤ، میں تمہیں تمہارا کمر دکھا دوں۔“ رات کا کافی ہو گئی ہے، اب سونا چاہیے۔“ الفریڈ نے مختصر سا جواب دے کر بات بدل دی اور انہیں لے کر ایک بڑے سے کمرے میں بیچ کر گیا۔

”تم چاروں یہاں اکٹھے سو جاؤ، تم اس وقت ایسی ذہنی حالت میں ہو کہ وہاں ہے اچانک پھر کسی پرفریشن کا ایک ہو اور وہ پھر کوئی غلط قدم اٹھانے کے بارے میں سوچے تو باتیں تین اسے سنجال سکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تین دن سے پہلے کچھ ایسا ہو۔“ الفریڈ نے انہیں ایک کمرے میں ٹھہرانے کی وجہ بتائی۔

”سٹر الفریڈ! ٹھیک کہا تم نے۔ واقعی یہ اچھا خیال ہے۔“ ایڈی نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تم سب میرے ساتھ آؤ۔ تھوڑا سا سامان لانا ہو گا یعنی دوسرے کمرے سے یہاں بیڈ اور کمرے وغیرہ لانے ہوں گے۔ آؤ، میری مدد کرو۔“ الفریڈ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ جمل، کلاڑک اور جیمز اس کے پیچھے چل دیے۔

”میں تو اب لیٹ چکا ہوں، اٹھنے کی ہمت نہیں، تم جاؤ۔“ جیمز ہنسا، میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔“ ایڈی نے بیڈ پر پھیلے ہوئے فٹس کر کہا۔

الفریڈ نے غور کیا، مسلسل پیچکی مسکراہٹ والے چہرے پر جاندار مسکراہٹ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے میں چار لوگوں کے سونے کا انتظام ہو گیا۔ الفریڈ نے انہیں لینے کا کہا اور باہر نکل گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ مکمل وغیرہ اٹھائے کمرے میں واپس آ گیا۔ کمرے کی ایک جانب جیمز اور جمل کے اور دوسری جانب کلاڑک اور ایڈی کے بستر تھے۔ درمیان میں خالی جگہ تھی۔ الفریڈ نے مکمل کارپٹ پر

رکھا اور بڑے آرام سے چلے لیٹ گیا۔
 ”میں نے سوچا میں کسی سوجاؤں، یہ زیادہ بہتر ہو جائے گا۔ میری فکر مت کرنا، میں نے چلے کر سونے کا عادی ہوں۔ اس طرح مجھے زیادہ اچھی نیند آتی ہے۔“ ان کے کوئی سوال کرنے سے پہلے انفریڈ نے خود ہی ساری بات کر دی پھر جاگ کچھ یاد آجائے پراٹھ بیٹھا۔
 ”تم لوگ کچھ کھانا چاہتے ہو تو لے آؤں؟“ اس نے چاروں سے سوال کیا۔
 ”نہیں۔“ ان کی نیند میں ڈوبی آواز میں جواب ملا۔
 انفریڈ مطمئن ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔

☆ ☆ ☆
 ”مستر انفریڈ! گلے ہے بہت اچھی کلنگ کر لیتے ہو۔“ انفریڈ کے کانوں سے جھل کی آواز گھرائی۔ وہ صبح جلدی اٹھ کر سب کا ناشا تیار کرنے لگا تھا۔ وہ جلدی سے جھل کی جانب مڑا۔
 ”اے اٹھ گئے تم۔ باقی تینوں کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے فکر مند سے پوچھا۔ جیسے ڈر ہو کہ ان دونوں کی عدم موجودگی میں وہ تینوں خود ہی کر لیں گے۔
 ”وہ بھی ادھر ہی آ رہے ہیں۔ تمہارے ناشتے کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایڈی کہہ رہا تھا مسٹر انفریڈ سے کہو میرے لیے ذیل ناشا بنائے۔ یقیناً کمال کے ملک ہو۔“ جھل فرنگ بچن اور پاس پڑی ڈش کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ انفریڈ مسکرا دیا۔
 ”چلو پھر بیٹھیں اور کپ ٹال کر ٹیبل پر رکھو۔“ انفریڈ نے جھل سے کہا اور ایڈی، جھو، کلاک کو بھی آواز دی۔ چیریکٹل میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ انفریڈ نے جھل کی مدد سے ناشا ٹیبل پر رکھا اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب ناشا کرنے لگے۔

”کافی بہت شاندار بنی ہے، گلد!“ کلاک نے گھونٹ بھرے ہی تعریف کی۔
 ”میں تمہیں بھی بنانا سکھا دوں گا، اب تم بنانا۔“ انفریڈ نے جھو کی طرف دیکھتے ہوئے کلاک کو جواب دیا۔
 ”جھو میری سلاسل اٹھا کر ان پر کھن گارہا تھا۔“
 ”اچھا؟“ کلاک ہنسا۔
 ”ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اب تو میں نے ناشا کیلے بنالیا ہے لیکن ناشے کے بعد سے کہ تمہیں دن ختم ہونے تک ہم باہم مل کر کام کریں اور خوب مصروف رہیں گے۔“ انفریڈ نے اپنی پلیٹ میں آلیٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل ٹھیک، ہم ایسا ہی کریں گے۔ چلیں، اس ناشے کے بعد کے کام ہانٹ لیں۔“ ایڈی خوش سا دکھائی دیا۔
 ”میں ذرا زیادہ مقدار میں ناشا کر چکا ہوں۔ مجھے کام بھی ذرا زیادہ ہی دیتا۔“ جھو نے ہنس کر کہا۔ وہ اپنے کمرے میں انفریڈ کے ہاتھوں کی بنی مزید کافی انڈیل رہا تھا۔
 ”چلیں جی ناشا ہو گیا۔ اب سب اپنی ڈیوٹی سن لیں۔“ انفریڈ نے ٹیپکین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔
 وہ چاروں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”جھل! تم ناشے کے برتن دھو گے، اس کے بعد ڈائنگ ٹیبل، چیئر اور کچن کی ایسے طریقے سے ڈسٹنگ کرنی ہے اور کچن کا فرش اچھے سے صاف کر دینا اور..... کلاک! تم کچن کے سامنے موجود لاؤنج کی صفائی کرو گے اور لاؤنج میں موجود ہر چیز کی جھاڑ پونچھ اس طرح کرنا ہے کہ ہر چیز چمکنے لگے۔“ جھل اور کلاک نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”بہت اہم بات سنو۔“ انفریڈ نے ذرا آگے کو جھکنے ہوئے کہا۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”ہاتھ کے ساتھ ذہن اور زبان کو بھی مصروف رکھنا ہے۔ جھل اور کلاک، تم دونوں کیونکہ ایک دوسرے کے قریب ہو گے اس لیے کام کے دوران تم دونوں مسلسل آپس میں کپ شپ بھی کرتے رہو گے اور تمہاری گفتگو کا موضوع ہوگا فنٹ بال میچز اور فنٹ بالرز۔“ انفریڈ نے دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھایا۔
 ”مستر انفریڈ! ہم سمجھ گئے۔ بالکل ویسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا ہے۔“ کلاک نے جلدی سے کہا۔ جھل نے اپنی آستینیں سینٹا شروع کر دیں۔ دونوں اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے لیے بے چین وچڑجوش لگ رہے تھے۔

”میں، جھو اور ایڈی بیلے روم، اسٹور روم، گیلری وغیرہ کی صفائی کریں گے۔ ہر جگہ مل کر کام کرتے ہوئے ہم شوہر اسٹارز اور ان کی گیسٹس لائف پر گفتگو کریں گے۔ بڑا گھر ہے، ہمارے ذمے کافی کام ہے۔ جھو! تم ہماری نسبت زیادہ کام کر لینا، تمہاری یہی خواہش تھی نا؟“ تینوں کو کام بتاتے ہوئے انفریڈ نے جھو سے سوال کیا۔
 ”بالکل..... بالکل، میں یہی چاہتا تھا۔ تو کیا اب شروع ہو جائیں؟“ جھو نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں، کام شروع کرتے ہیں اور تم سب کے لیے ایک خوشخبری لانا آؤں گے۔ تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ تم چاروں میرے ڈریسز استعمال کر سکتے ہو۔ میں تم چاروں

کی نسبت لڑ رہا ہوں اس لیے میرے ڈریسز تم چاروں کے کام آئیں گے۔ کسی کے کم ڈھیلے اور کسی کے زیادہ ڈھیلے..... لیکن تیار ہو جائے گا۔“ انفریڈ نے مسکرا کر کہا۔
 اب وہ باہم لپٹ اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ پہلے تو سب نے گفتگو کا آغاز ایسے کیا جیسے وہ کسی کوئی ڈیوٹی ہو لیکن جلد ہی بات چیت میں شدت اور جوش آ گیا۔ پسندیدہ فنٹ بالر کی زندگی پر سیر حاصل بحث ہونے لگی، اپنے اپنے پسندیدہ اور پسندیدہ شوہر اسٹارز کی خوبیاں و خامیوں پر تبصرے ہونے لگے۔ گزشتہ رات کی یاد کو یاد پوچھ چکی تھی۔ تیزی سے ہاتھ اور زبان چل رہی تھی، کراس ٹانگ، ہور ہی تھی، آوازوں سے بڑا سا گھر کو بچنے لگا تھا۔

”ایڈی! تم میرے فیورٹ اداکار کو اور ایکٹنگ کرنے والا کیوں کہہ رہے ہو؟ تم کیا جانو ایکٹنگ کیا ہے، ہاں سلیس!“ کلاک لاؤنج کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے چنچا۔
 ”تمہارا موضوع فنٹ بال ہے، شوہر نہیں۔ تم مجھے سننے کے بجائے اپنے کام پر دھیان دو بیوقوف آدمی۔“ جواباً ایڈی بچلا ہوا۔

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم جو چاہے بولتے رہو۔“ جھل کچن سے نکل آیا۔ اتفاق سے جھل اور کلاک ایک ہی اداکار کے فنٹ تھے۔ اور جھو اور ایڈی اپنی بات پڑھتے گئے۔ انفریڈ بھی ریفری بن رہا تھا، یہی سائڈ پر کھڑا ہو کر ان کی باتوں سے مخطوط ہو رہا تھا۔ لڑائی، ٹوک جھوک میں صفائی ہوئی، برتن دھل گئے، ڈسٹنگ کے بعد ہر چیز چمکنے لگی اور وہ باہم خوب جھگڑ گئے۔ شاور لینے کے بعد سب لاؤنج میں صوفے، ٹالین پر تقریباً گر گئے۔ کچھ نیند لینے اور تازہ دم ہونے کے بعد دوپہر کا کھانا مل کر بنایا اور کھایا گیا۔ ٹیبل پر بھی کچھ ڈیرگ شپ کے بعد انفریڈ نے انہیں گھر کے پچھلے حصے میں چلنے کا کہا۔ وہاں پر چھوٹا سا کچن گارڈن بنایا گیا تھا لیکن اس وقت اس کی حالت یہ تھی جیسے کافی دنوں سے اس پر تو جھینس دی گئی ہو اور پانی نہیں دیا گیا ہو۔

”گارڈن تو اچھا ہے لیکن قریب المرگ لگ رہا ہے۔“ جھو نے دیکھتے ہی تبصرہ کیا۔
 ”تو..... تمہیں دن تک کوئی بھی موت، خود کشی جیسے الفاظ زبان پر نہیں لائے گا۔“ انفریڈ نے اونچی آواز میں بری طرح ٹوکا۔
 ”اوہ..... مجھے یاد نہیں رہا۔“ جھو نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔
 ”مجھے اپنے پودوں کا خیال رکھنا، ان کے ساتھ وقت

ماہنامہ جاسوسی لٹریچر

ماہروری کی ہلکی ہلکی مروری
 جاسوسی کی ہر مروجہ ہر ایک انوکھی کہانی

آبی قیامت

جیتے جاگے انسان و حیوان قیامت خیزی کے آغاز و اختتام تک موت سے خیر و آزار تھے۔ چند منٹ اور لاکھوں انسانوں کی جان بچانے کا امتحان.....

احمد رانجیس کے قلم سے سنسنی خیز داستان

قاتل مسیحا

پسندیدہ کردار عمران جوہر کے کشتی کا راز.....
 میجاؤں کے میس میں سفاک قاتلوں کا گھناؤنا کھیل
 طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دبیر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا معیت بلبل کرنے والے ایک دبیر نو جوان کی کوہِ گردی
 حسام بیٹ کے قلم سے سلسلے دار کہانی

سردق کی رنگ

پہلارنگ

حالات و واقعات کی سنگینی کا شکار ہو جانے والے ایک نو جوان کی کھٹا

دوسرا رنگ

محنت کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور دل میں بسی کدورتیں..... وفا و جفا کی نزاکتیں

چھٹی لٹریچر

آپ کے تبصرے..... شوریے..... محبتیں.....
 دکائیں..... اونٹنی کی دلچسپ باتیں..... کھائیں.....

بتائے۔ ضرور کسی کی بات سنو۔ مسئلہ سناؤ گے، سنو گے تو مسئلے کا حل بھی مل آئے گا۔“ الفرید نے تسلی سے بڑا اہم جھگڑے ڈالا۔

”ایک بات کہوں؟ حقیقت میں تم بھی خود ہی نہیں کرنا چاہتے تھے ایسے تو فوراً مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ آپ مجھے سنانے لگے، درہنہ پانی میں پھلکا تو سینکڑوں لگائی جاسکتی ہے۔ دراصل تمہیں کوئی روکنے، ٹوکنے والا، باتوں میں لگنے والا نہیں تھا۔ جو نئی سلاہ، تم رک گئے۔“ اس نے کہا تو چاروں سر ہلانے لگے۔

”مسٹر الفرید! اب ہمیں اپنی ذات میں کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی، نہ ہی کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم زندگی کا ہی خاتمہ کر ڈالیں۔“ چلنے سے سکر کر کہا۔

”اوہ، خوب یاد دلایا۔ آج سے تم چاروں بس اسی بات پر فکس کرو گے کہ کوئی تم میں کوئی کمی نہیں۔ چل کر گرل فرینڈ سے نہیں بلکہ اس نے گرل فرینڈ کو چھوڑا ہے کیونکہ وہ بے وفائی کر رہی تھی۔“

”بھروسہ بہت اچھا لگتا رہا جیسا کہ ہے۔ وہ بیٹھ سٹارٹ ہے۔ اس کے فن کی قدر ہم کریں گے۔ کلارک اچھا بڑا فن کر سکتا ہے۔ یہ بیوقوف ہے نہ نا اہل، بس بد قسمتی سے کاروبار ہوا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ ایڈی بروجو الزام لگے، وہ جوئے تھے اور الزام لگانے والے اسی مجرم تھے۔ یہ بے قصور اور معصوم ہے۔ اس طرح تمہارا مورال تیز ہر بڑھے گا، اوکے؟“ الفرید نے ایک اور خوبصورت بات سمجھائی۔

”اوکے ہاں!“ ایڈی ہنسا، باقی اس کا ساتھ دینے لگے۔

”ایک اہم سوال مسٹر الفرید! تمہیں ہمیں بچانے کا خیال کیوں آیا کہ تم نے دور سے آکر، کوئی بھی رشتہ نہ ہونے ہوئے ہمارے ساتھ اتنا اچھا سلوک کر ڈالا؟“ اچانک جھوٹے پوچھا۔ الفرید مسکرایا، اس کی مسکراہٹ پھٹکی سی تھی۔

”میں وہاں اپنے ایک ضروری کام کے سلسلے میں گیا تھا۔ اچانک تم چاروں پر نظر پڑی۔ یقیناً ایسا ہونا تقدیر میں لکھا ہوا تھا کہ میرے دل میں بس یونی خیال آیا کہ اپنا کام کرنے سے پہلے تم سے بات کروں۔“ یہ کہہ کر الفرید رک گیا۔ چاروں اس کی جانب دیکھ رہے تھے کہ وہ جلدی سے دوبارہ بات شروع کرے۔

”ایک بات بتاؤں پہلے؟“ وہ میں۔۔۔۔۔۔ رائٹر نہیں ہوں۔ میں نے بھوت بولا تھا۔“ الفرید نے رک رک کر کہا۔ وہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”بھوت کیوں بولا؟“ چلنے سے سوال کیا۔

”بتایا کہ میں یونی تم سے بات کرنے کو دل کیا تو رائٹر ہونے کا بہانہ بکھڑے تمہیں کہا میں سنانے کا کہا۔“

میرا خیال تھا کہ بات سن کر تمہیں تمہارا کام کرنے والوں کا اور خود اپنا کام کرلوں گا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ تمہاری باتیں سن کر ایک دم میرا جی چاہنے لگا کہ تمہیں جیتا چاہیے۔ پھر تم بھی ایک دوسرے کو رد عمل دینے لگے، جذباتی ہونے لگے تو میں نے سوچا کہ اگر ان میں زندگی کی رشتہ باقی ہے ہی تو اپنے کام کو نظر انداز کروں اور زندگیاں بچاؤں۔“

”مسٹر الفرید! تو تم اب اپنا ضروری کام کرلو۔ اب تو تم ہماری طرف سے بے فکر ہو۔“ ایڈی نے تجزی سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔ بس وہ اسی دن ہو سکتا تھا۔ نہیں ہوا تو بس اب نہیں ہو سکتا۔“ الفرید دھیرے سے بولا۔

”ایسا کون سا کام تھا جو اب نہیں ہو سکتا؟“ چلنے نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں واقعی، ایسا کیا کام تھا؟ کیا کرنے گئے تھے تم وہاں مسٹر الفرید؟“ کلارک بھی حیران تھا۔

”خود کشی۔۔۔۔۔۔ خود کشی کرنے گیا تھا۔“ الفرید گہرے دھماکا خیز انکشاف کیا تو چاروں کے منہ جاوڑا نہیں، ہچکچاتا کھل گئے۔ چہلے خاموشی کے گزر گئے۔ وہ چاروں کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی الفرید کو دیکھ رہے تھے۔

”خود کشی۔۔۔۔۔۔ یعنی تم بھی؟“ جھیر کے گلے میں الفاظ پھنسنے ہوئے تھے۔

”میرے دوستو! ایچ ہے کہ میں اس روز خود کشی ہی کرنے گیا تھا۔“ الفرید نے دھیرے سے کہا۔ سب الفرید کو خاموشی سے سننے لگے۔

”میں نے تم چاروں کی کہانی سنی تھی کہ بتاؤ کیا وجہ ہے جو تم اپنے آپ کو ختم کر لینا چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے اب یہ کام کرنے کی میری باری ہے۔“ الفرید دہکی انداز میں ہلکا سا سانس کر بولا۔ وہ چاروں صرف سر ہلایا۔

”میری بیوی جین بھوکے مرے ہوئے آج دو ہفتے ہو گئے ہیں۔“ الفرید نے افسوسناک خبر سنائی اور جو کہ ان چاروں کے لیے بہت بڑا انکشاف تھی۔

”دو ہفتے۔۔۔۔۔۔ یعنی صرف دو ہفتے ہوئے ہیں تمہیں مدد دے جھیلے ہوئے۔“ جھوک کی آواز میں لرزش تھی۔ کلارک نے بے اختیار الفرید کا ہاتھ تھام لیا جو ہلکا ہلکا کانپ رہا تھا۔

”میرا انتقال امیر فلی سے تھا۔ میں نے اپنی مرضی کرتے ہوئے عرب لڑکی جین سے شادی کر لی۔ اس بات

مشتعل ہو کر میرے باپ نے مجھے جاندار جو کئی ایک بار بھی اور فارم چھوڑنے سے قانع کر دیا۔ میں نے اور جین نے غلط سمجھ کر اس کے گزراوقات شروع کی۔ جین نے کئی دن گزرنے لگے۔ کئی برس بیت گئے، ہمارے بڑی بھئی میں دن گزرنے لگے۔ میں اور جین اس کے باوجود ایک ہاں اولاد بھی نہ ہوئی۔ جین سال مل میرے والد کا دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ جین سال مل میرے والد کا انتقال ہوا تو میرے بھائیوں نے مجھے آخری رسومات میں شامل ہونے کے لیے اطلاع دی۔ وہیں پر مجھے بتایا گیا کہ میرے والد نے مرنے سے پہلے شاید مجھ پر ترس کھا کر چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا میرے نام کر دیا تھا جو میرے بھائیوں کو ملنے والے حصے سے کئی گنا کم تھا لیکن میں پھر بھی خوش تھا کہ دو افراد کے گزراوے کے لیے مناسب انتظام ہو گیا ہے۔ جین سال پک چھپتے میں گزر گئے۔ دو ہفتے کل میں اور جین مارکیٹ سے آرہے تھے کہ ایک کار اچانک بے قابو ہو کر جین سے ٹکرائی اور وہ ہوا میں اچھلے ہوئے بڑے زور سے گری۔ اس کا سر زمین سے بری طرح گرایا۔ وہ لمحوں میں میری آنکھوں کے سامنے گر گئی اور میں۔۔۔۔۔۔ میں کچھ بھی نہ کر پایا۔ مجھے گاڑی یا گاڑی کے ڈرائیور سے کچھ نہیں لینا دینا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔ محض ایک حادثہ تھا جو میری لائف برباد کر گیا۔ جین نے کچھ ہی عرصہ تو سکون سے جیتا تھا کہ۔۔۔۔۔۔ کہ موت نے۔۔۔۔۔۔ اسے مجھ سے جدا کر دیا۔ میں پاگل سا ہو گیا اور سوچا کہ جین کے بغیر جی کر کیا کرتا۔ یہی سوچ کر اس روز ٹی پر پہنچا۔ تمہیں دیکھا تو پتا نہیں کیوں تم سے بات کرنے کو دل کیا۔ آگے کی کہانی تم جانتے ہو۔۔۔۔۔۔ تمہاری باتیں سن کر میرا بھی دل جینے کو کرنے لگا پھر تم نے میرے گھر آکر رونق لگا دی۔ میرا گھر پہلے کی طرح صاف کر دیا، میرا گاڑن کھیلے جیسا ہو گیا اور تنہائی دور ہونے سے غم جتنے سال کا۔ اب مجھے کافی سکون ہے۔ مجھے بھی تم لوگوں کا شکر ہے ادا کرنا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے میں زندگی کی جانب واپس آیا ہوں۔“

الفرید آنسو صاف کر رہا تھا۔

”بہت بڑا غم ہے تمہارا مسٹر الفرید! مجھے بہت افسوس ہے۔“ ایڈی نے الفرید کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”اور آخر میں تم پر کہ اس بڑے صدمے کے باوجود تم نے خود کو سنبھال کر ہمیں زندہ رہنے پر مائل کر دیا۔“ چلنے نے آنکھوں کی نمی کو گڑھے ہوئے کہا۔

”دراصل تم لوگوں سے باتیں کر کے کئی حقیقتیں مجھ پر کھلیں۔ وہ یہ کہ ہم باپچوں تنہائی، اپنوں کی بے وفائی، غربت، میر دزدگاری، رشتوں کے دور ہو جانے جیسی پرالمن کا

شکار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف ہوا کہ بے شمار انسان ایسے ہیں جو غربت زدہ زندگی گزار رہے ہیں، کئی لوگوں کی بیویاں ان سے طلاق لے چکی ہیں، لوگوں پر جھوٹے کیسز بھی بننے لگے ہیں۔ اکثر لوگوں کی ملازمتوں کا لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔ بہت سے بد نصیب ایسے ہیں جن کے شوہر یا بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ کاروبار بھی بہت سوں کے تباہ ہوئے ہیں۔ جیسا کہ تمہاری کئی لوگوں کا مقدر ہے۔ چنوکو چھوڑ کر یہ مسئلے تو ساری دنیا کو ہیں تو کیا ساری دنیا خود کشی کرے؟ نہیں، دکھوں کو برداشت کرنا اور مٹی باتوں کو اتور کر کے لائف کو آگے بڑھانا ہوگا۔“ الفرید گہرے بات مکمل کر لی تھی۔

☆☆☆

اگلا دن بہت معصوف گزارا۔ جھو اور کلارک کو ریسٹورنٹ میں کام مل گیا۔ چلنے کاڑیوں کا تھوڑا بہت کام جانتا تھا۔ اس نے درکشاپ پر جاب کر لی اور ایڈی نے کوئی کام ملنے تک الفرید کے گھر کی صفائی اپنے ذمے لے لی۔ الفرید نے کہا تھا کہ وہ اسے اس کام کا معاوضہ دے گا۔ ایڈی نے معاوضے کے طور پر رہائش اور کھانے کا مطالبہ کیا۔

رات کا وقت تھا، سب کھانا کھا کر مشرکہ بیڈروم میں آچکے تھے۔

”اب تم اپنے اپنے کمرے سیٹ کرلو۔ اب ہم الگ سو سکتے ہیں۔“ الفرید نے گویا اجازت دی۔ ویلے بھی وہ ریٹ دینے پر بندھتے تھے تو انہیں الگ الگ کمراتو دینا ہی تھا۔

”اوکے۔۔۔۔۔۔ اوکے۔۔۔۔۔۔ کر لیں گے جب جی چاہے گا۔ فی الحال جیسا چل رہا ہے، چلے دو۔“ کلارک نے بے فکری سے بیڈ پر پھیلے ہوئے کہا۔

”مسٹر الفرید! آج کا دن بہت معصوف، بھرپور اور زندگی سے بھرا ہوا تھا۔ ہماری بات سن کر تم نے ہمیں علاج کر کے بچالیا۔“ ایڈی نے جھوک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو حسب معمول کنار بچانے کے لیے اٹھا رہا تھا۔

”اور تم نے مجھے بچالیا۔ تم بات سنانے اور میں سننے کی وجہ سے جرنے سے بچ گیا۔“ الفرید ہنسا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔

جھوک کنار بچا رہا تھا۔ سب مسکراتے چہروں کے ساتھ نئی زندگی کو جیک کر رہے تھے۔

خاطر داری

ملک مسدود حیات

چند متکبر لوگ بھول جاتے ہیں کہ چودھریوں کے اصول اور ملکی قوانین میں کوئی یکسانیت اور برابری نہیں ہوتی... لیکن انصاف کے ٹھیکیدار اپنی عینک سے معاملے کی سنگینی یا رنگینی کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں... جبکہ قوانین اور اصولوں پر عادتوں کے نہیں بلکہ حقیقتوں کے تقاضے پورے کرنا پڑتے ہیں... اس چودھری کو بھی یہی زعم تھا کہ اس کا اٹھایا ہوا ہر قدم انتہائی درست ہے... مگر صنفدر حیات نے اس کی غلط سمت کی نشاندہی کرتے ہوئے خوب اچھے سے بتا دیا کہ درست سمت کون سی ہے...

حسانے کی حدود میں محرموں کی خاطر داری کا

عبرت اثر ماجرا

دولت کدہ دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدہ بن گیا تھا۔ پچھلے دو ماہ میں موضع فرید پور کے دیکھنے والے لیے یہ دوسرا بڑا جھکا تھا جس نے ان کے دل و دماغ کو مری طرح متاثر کیا تھا۔ سب سے زیادہ حسانے اور گرونگا راہی حویلی میں رہنے والے لوگ یعنی چودھری حنیف اللہ اور اس کے خاندان کے دیگر افراد تھے کیونکہ صرف وہاں کے وقفے سے یہ ہوش و خرد کے پرچے اڑا دیے والا دوسرا بھی اسی حویلی پر گرا تھا۔

آپنی (ادنی) حویلی کے اندر اگر کمرام چاہا تو باہر پورے فرید پور کی حالت بھی دیکھ سکتا تھا۔ سننے والوں نے اس خبر کو اپنی ساعت کا دھوکا سمجھا اور دیکھنے والے اس خبر چچاں اور دھڑاں حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے مگر وہی بات کہ جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا تھا اور لوگ محفوظ پر موقوف الفاظ کو لا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے تبدیل کرنا ممکن ہے۔ وہ ماٹھل چورہ راسن دوزیر بنگم چل بسی تھی اور اب آپنی حویلی کی بیہودہ عروج کو بے دردی سے تسلیم کر دیا گیا تھا۔ میں اس وقت جانے دوڑے ہوئے تھا۔

ان دنوں میری تعلیماتی مشل لاکس پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک خانے میں تھی۔ فرید پور نامی وہ گاؤں میرے خانے کے شمال مشرق میں صرف ایک میل کے



رہے تھے کہ وہ لوگ بخیریت اپنی منزل پر پہنچ گئے ہوں گے لیکن اس وقت ان کا اطمینان غارت ہو گیا جب کھیتوں میں کام کرنے والے کرامت علی نامی ایک مزدور نے آکر اس سنگین واردات کی اطلاع دی۔ کرامت علی فرید پور سے کا رہنے والا تھا اسی لیے وہ حویلی کے مالیشان تانگے اور ان تین لاشوں کو برآمد آسانی کیجوان کیا تھا۔

عروج، مشتاق اور اللہ دہا کی لاشیں سپہری کی حالت میں کپے رات کے کنارے پر پڑی تھیں۔ ان کے اہل ان بھرپور ہو رہے تھے۔ انہیں کسی تیز دھار برہمے پانچنے سے گل کیا گیا تھا۔ ان آلات غارت گری کو ایسی سفاکی سے استعمال کیا گیا تھا کہ وہ تینوں بد نصیب اپنا قمار نہیں کر سکتے تھے اور حملہ آوروں نے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے ساتھ ہی برچھوں اور تیزوں کی اینٹوں سے ان کے جسموں کو گودا لگا تھا۔ میں نے ”حملہ آوروں“ کے الفاظ اس لیے استعمال کیے کہ محتوین کی لاشوں کی ناقص بیان حالت کو دیکھ کر مجھے خوبی اعزاز ہو گیا تھا کہ اس روئے کرے کر دینے والی واردات کے ذمے دار ایک سے زیادہ افراد تھے۔

جس تانگے پر سوار ہو کر وہ تینوں اپنی حویلی سے روانہ ہوئے تھے وہ لگ بھگ ایک فرلانک کے فاصلے پر کھیتوں کے ”کھڑا“ تھا۔ گھوڑا انہیں تک تانگے میں جتا ہوا تھا۔ میں نے محتوین کی لاشوں کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد مذکورہ تانگے کا بغور جائزہ لیا۔ تانگے کی اگلی اور پچھلی دونوں سیمیں خون آلود تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ عروج، مشتاق اور اللہ دہا کون تانگے پر ہی گرا کر کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی لاشوں کو کپے رات کے کنارے سپرک کر تانگے کو کھیتوں کے اندر پہنچا دیا گیا تھا۔ شقی القلب قاتلوں کی یہ حکمت عملی فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اگر وہ بدعت تانگے کو قودعہ پر ہی ٹھارہ ہے ہے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔

اچھی نے موع کی کارروائی مکمل کی تو سورج مغرب ہوا اچھی پر ہنک چکا تھا۔ میرے علم پر ایک تانگے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ چودھری حفیظ اللہ اور اس کا بیٹا چودھری ساجی اللہ بھی وہاں موجود تھے۔ محتولہ عروج، ساجی اللہ کی بیوی کا شیل مہم کی گھرائی میں غلطی اسپتال بھیجوانے کا نو چودھری حفیظ اللہ نے مجھ سے کہا۔

”لگ صاحب! کیا یہ ضروری ہے؟“

”بہت ضروری چودھری صاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ قانونی کارروائی کا حصہ ہے۔“

”مگر اسپتال میں تو مردوں کی چھ پھاڑی جاتی ہے۔“ چوڑے چودھری ساجی اللہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ابھی چار ماہ پہلے ہی تو عروج سے میری شادی ہوئی تھی۔“ وہاں پر تین انسانوں کی لاشیں دھکی ہوئی تھیں جنہیں بے رحمی سے تانگے کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن چوڑے چودھری کو صرف اپنی بیوی کی لاش کے پوسٹ مارٹم کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایسا موع نہیں تھا کہ پیش اس سے کوئی سخت بات کرتا۔

”سجی اللہ! مجھے تمہارے دکھ اور اس عظیم تر نقصان کا احساس ہے۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”جس طرح جانے واردات کی کارروائی ضروری ہے، بالکل ویسے ہی ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم بھی قانون کا تقاضا ہے اور میں اپنے اس فرض سے بھجور ہوں کیونکہ یہ تین انسانوں کی طبی موت کا معاملہ نہیں بلکہ ایک لرزہ خیز واردات کا قصہ ہے۔ کسی شیطان مفت نہیں نے بلکہ اشخاص نے آپ کی بیوی، سائے اور کوچوان کو بھاننا انداز میں موت کے منہ میں دھکیلا ہے لہذا پوسٹ مارٹم تو بہر صورت ہوگا۔“ لگائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بڑے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”چودھری صاحب! کیا آپ نے شیر گڑھ والوں کو اس سانحے کی خبر دی ہے؟“

”جی ہاں قانیدار صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے پڑمردہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے اپنے دو بندوں کو گھوڑوں پر ادھر بھیجا ہے۔ اب تک وہ لوگ شیر گڑھ پہنچے ہوں گے۔ چودھری یعقوب احمد کے تو صرف دو ہی بچے تھے۔ عروج اور مشتاق۔“ بولتے بولتے اس کی آواز رنڈھ گئی۔ ”پہ سوچ کر میرا کلیجا کانپ جاتا ہے کہ شیر گڑھ کی بڑی حویلی میں اس خبر سے جو قیامت ٹوٹنے کی، وہ یعقوب احمد اور اس کی بیوی ممتاز کا کیا حشر کرے گی۔ وہ بے چارے تو ایک لمبے میں بے اولاد ہو گئے ہیں۔“

”چودھری صاحب!“ میں نے حفیظ اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے اہانت بھرے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت اپنی حویلی میں آپ کی موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ آپ دونوں باپ بیٹا ٹھہر جائیں۔ میں یہاں کے معاملات کو نمٹانے کے بعد آپ کے پاس آتا ہوں پھر اس سانحے کا اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“

میں کوئی نہ کوئی صحت پوشیدہ ہوتی ہے جسے سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں قانیدار صاحب!“ وہ آنکھوں میں آنسو آنے والی نمی کو صاف کرتے ہوئے گوگیر آواز میں بولا۔ ”اب تو مجھے ساری زندگی اسی دکھ اور بچپن یادے کے ساتھ جینا ہوگا۔“

”حاصل سے کام لیں چودھری صاحب!“ میں نے یقینی بھرے لہجے میں کہا پھر دوسرے لوگوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جانے قودعہ کے نزدیک لگ بھگ دو درجن مردوزن جمع تھے۔ میں نے ان میں سے آٹھ دس افراد سے پوچھنا چاہی کہ مگر کوئی بھی ایسی بات سامنے نہیں آئی جس کے ذریعے میں اس خونی واردات کے ذمے داروں تک رسائی حاصل کر سکوں تھی کہ اپنی حویلی والوں کو اس خوشحال واقعے سے آگاہ کرنے والا کرامت علی بھی تین انسانوں کے قاتلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

”تم نے کتنے بچے ان لاشوں کو کپے رات کے کنارے پر پڑے دیکھا تھا؟“ میں نے کرامت علی کے چہرے پر نگاہ بجا کر سوال کیا۔

”کرامت علی کھیتوں میں کام کرنے والا ایک مزدور پیشہ شخص تھا۔ اس کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور ساتویں رتھ کا کالا لک ایک دبلا پتلا انسان تھا۔“ میں نے سب سے پہلے تانگے اور گھوڑے کو دیکھا تھا قانیدار صاحب اور مجھے اس پر خاصی حیرت بھی ہوئی تھی کہ کرامت علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”میں اس وقت کھیتوں کی دوسری طرف کپے رات کے قریب پہنچا تو میں نے تین انسانوں کو مردہ حالت میں پڑے پایا۔ میں نے انہیں اور تانگے کو گھورا پچان لیا۔ اس کے بعد میں بھاگتے ہوئے اپنی حویلی پہنچا اور چوڑے چودھری صاحب کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو چودھری صاحب سے پوچھ لیں۔“ بات کے اختتام پر اس نے چودھری ساجی اللہ کی طرف دیکھا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کرامت علی!“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم اچھی طرح اپنے ذہن پر زور دے کر مجھے بتاؤ کہ جب تم اس طرف آرہے تھے تو تم نے یہاں کوئی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھی تھی؟“

”کیا دیکھی تھی؟“ وہ ابھرنے لگا لیکن میں مسخرہ ہوا۔

میری بات چودھری حفیظ اللہ کی سمجھ میں آگئی۔ سچ اللہ نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے میری بات کی توثیق کر دی۔

”ابا بانی! قانیدار صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے۔“

آپ کی طبیعت بھی آج کل نرم گرم ہی چلی رہی ہے۔ آپ کو حویلی کا آرام کرنا چاہیے۔ میں ہوں نا یہاں پر۔“

چودھری حفیظ اللہ اپنے نمک خواروں کی معیت میں اپنی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا تو میں اپنے کام میں لگ گیا۔ سب سے پہلے میں نے کاشیل مارٹم کو لاشوں کے ساتھ سرکاری اسپتال جانے کا حکم دیا پھر وہاں موجود افراد سے پوچھنا چاہنے میں نے پہلے میں نے چوڑے چودھری ساجی اللہ سے استفسار کیا۔

”چودھری صاحب! آپ کی شادی کو صرف چار ماہ ہوئے ہیں۔ اگر عروج کو شیر گڑھ جانا ہی تھا تو آپ کو اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ آپ نے اپنی بیوی کو کیسے کیوں بھیج دیا؟“

”عروج اکیلا نہیں، اپنے بڑے بھائی مشتاق کے ساتھ میری قنیدار صاحب! وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”مشتاق کل ہی یہاں آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ عروج کے باپ یعنی میرے سر چودھری یعقوب کو اپنی بیٹی کی بہت یاد آ رہی ہے اس لیے ہفتہ دس دن کے لیے عروج کو شیر گڑھ بھیج دیا جائے۔ آگے ویسے بھی انکسٹن کا سیزن شروع ہونے والا ہے۔ چودھری یعقوب صاحب سیاست کے پرانے کھلاڑی ہیں اور احتیاط بات میں نہ صرف حسد لیتا بلکہ جینا ان کی عادت ہے اور اس عادت کو وہ اپنا مان کہتے ہیں۔“ وہ لمبے بھر کو تھکا پھرا ایک پوچھل سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

”مشتاق اپنی اکلوتی بہن عروج کو لینے ہی آیا تھا۔ میں گزشتہ روز سے بیمار ہوں۔ رات بھر تیز بخار رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی دست کا معاملہ بھی ہے۔ میں تو ان لوگوں کے ساتھ شیر گڑھ جانا چاہتا تھا لیکن ابا بانی نے سختی سے منع کر دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں لہذا مجھے گھر میں آرام کرنا چاہیے۔ مجھے کیا بتا تھا کہ ہم پر اتنی بڑی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔“

بات کے اختتام پر اس کی آواز جھجک گئی۔ میں نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چودھری صاحب! ابھی تو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ آپ کی زندگی باقی تھی اس لیے قدرت نے آپ کی طبیعت خراب کر دی اور آپ ان کے ساتھ نہ جاسکے۔ مالک کے ہر کام

میں میری تعیناتی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے یعقوب احمد اور اس کی سیاست کے حوالے سے بہت سی باتیں میرے لیے نئی اور پرانہ دہک چکی تھیں۔

میری بھی انسان کی مسلسل کامیابی جہاں اس کی شہرت، مقبولیت اور عزت کا باعث بنتی ہے، وہیں پر اس کے حاسدین کی تعداد میں بھی اضافہ کرتی ہے اور اگر کوئی حاسد طاقتور بھی ہو تو وہ دشمنی سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عروج، مشاقق اور اللہ و تائید کی موت کا ذمہ دار چودھری یعقوب احمد ہی کا کوئی بدخواہ یا سیاسی حریف ہو۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ گزشتہ دو ماہ میں اپنی خوبی میں نیچے والے چودھری خاندان کو یہ دوسرا جھکا سہنا پڑا تھا۔ دو ماہ پہلے چودھری سجاد اللہ کی ماں دارالغالی سے دارالافتادہ ہوتی تھی۔ وزیر بنیم کے چہلم کو چھ روز ہی گزر رہے تھے کہ آج یہ دوسرا سناخورد ہوا گیا تھا۔ چودھری حفیظ اللہ اور اس کے فرزند واحد چودھری سجاد اللہ کے دکھ کو سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی نہیں، بس احساس کے زور سے ہونے کی ضرورت تھی۔ حاشائیں کے لیے یہ ایک قیامت مفری، ایک صدمہ جانکا ہوا تھا۔

ہمارے درمیان افسردہ اور دل گرفتہ ماحول میں گفتگو کا عمل جاری ہی تھا کہ ایک ملازم نے وہاں آکر چودھری حفیظ اللہ کو اطلاع دی۔

”چودھری صاحب! نصیر اور منظور واپس آ گئے ہیں اور وہ فوراً آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ انہیں بھیجو اندر۔“ چودھری سجاد اللہ نے سپاٹ آواز میں کہا۔

ملازم کے جانے کے بعد چودھری حفیظ اللہ نے مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب! نصیر اور منظور وہی دو بندے ہیں جنہیں میں نے شیر گڑھ دودھ دیا تھا۔“

”اوہ اچھا۔“ میں نے چونکے ہوئے لمحے میں کہا پھر پوچھا۔ ”اس ملازم کی بات سے تو یہی لگتا ہے کہ عروج اور مشاقق کا باپ چودھری یعقوب احمد نہیں آیا۔“

”سو بہادر خیر کرے۔“ چودھری حفیظ اللہ توشیں بھرے لہجے میں بولا۔ ”میرے دماغ میں بڑے بڑے خیال آ رہے ہیں ملک صاحب!“

”اللہ کرم کرے گا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ایک منٹ کے بعد نصیر اور منظور، چودھری حفیظ اللہ کے در پر دست بٹہ کھڑے تھے۔ چودھری کے استفسار پر

انہوں نے شیر گڑھ کا جو احوال بیان کیا وہ اس حویلی کے سر میں عظیم اٹھانے کا موجب تھا۔ اس سستی خیر بیان کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

جب نصیر اور منظور نے شیر گڑھ کی بڑی حویلی میں پہنچ کر چودھری یعقوب احمد کو فرید پور واسے احمد ہٹاک سامنے کے بارے میں بتایا تو حویلی میں موجود ہر شخص کے ہوش اڑ گئے۔ مشاقق شادی شدہ تھا اور اس کی تین سال کی ایک بیٹی بھی تھا۔ نام عابدہ تھا۔ عابدہ کا شعور ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے باپ کی المیہ کی موت کی اذیت ناک شدت کو صحیح معنوں میں محسوس کر سکے لیکن مشاقق کی بیوی عالیہ اس دلدوز خبر کو سننے ہی زار و قطار رونے لگی تھی۔ چودھری یعقوب احمد اور اس کی بیٹی چودھری آمنہ متاثر نہ ہو سکی کہ دل و دماغ میں گویا بارودی دھماکے ہو رہے تھے۔ چند لمحات اسی افراتفری اور بے سروسامانی میں گزر گئے۔ چودھری یعقوب کی سمجھ بوجھ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں ابھی نہیں تھا کہ یوں اچانک اپنے دونوں بچوں کو کھو بیٹھے گا۔ جب وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو اس نے فی الفور فرید پور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نصیر اور منظور کے ساتھ ہی اس طرف آنا چاہتا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایک ملازم کو کھینچ کر اپنے چوتھے بھائی اسحاق کو بلا لیا۔ اسحاق احمد شیر گڑھ ہی میں رہتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ ”چھوٹی حویلی“ کہلاتی تھی۔ وہ شیر گڑھ سے نکلنے سے پہلے چودھری اسحاق احمد کو فرید پور والے سامنے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا مگر تیرہ فروری کا دن ان لوگوں کے لیے ایسا ننھس ثابت ہوا کہ ایک کے بعد ایک بری خبر ان پر ایسے وارڈ ہو رہی تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس کو بچا اور سلامت رکھنے میں کئی طور پر ناکام ہو چکے تھے۔ چودھری اسحاق احمد اپنے بڑے بھائی کے بلاوے پر چھوٹی حویلی سے بڑی حویلی تو پہنچا مگر ایک دھڑکنے اور لڑنے خیر خبر کے ساتھ۔ چودھری اسحاق کے اکلوتے بیٹے چھپیں سالہ سلیم احمد کو کسی نے سنا کا انداز میں لے کر کے اس کی لاش کو کچھوں میں چھپک دیا تھا۔

”یہ تم لوگ کیا بکواس کر رہے ہو؟“ چودھری حفیظ اللہ نے قطع کلائی کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔ ”سلیم تو بہت اچھا لڑکا ہے۔ اسے کوئی کیوں مارے گا؟“

”چودھری صاحب! ہم نے شیر گڑھ میں جو سنا اور جو دیکھا، وہی آپ کو بتا رہے ہیں۔“ نصیر نے حاجت بھرے انداز میں کہا۔ ”یہ ایک غویں حقیقت ہے کہ چودھری اسحاق احمد کے اکلوتے بیٹے سلیم کو کسی ظالم شخص نے بے دردی سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔“

”اس لیے چودھری یعقوب صاحب ہمارے ساتھ یہاں آنے کے بجائے قاتلے گئے ہیں۔“ منظور نے مقتل اعزاز میں بتایا۔ ”انہوں نے ہم سے یہی کہا ہے کہ وہ قاتلے میں سلیم کے قتل کی رپورٹ درج کرانے کے بعد یہاں آئیں گے۔“

”یہ کیا ہو گیا ملک صاحب!“ چودھری حفیظ اللہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو کھاتے ہوئے دل گیر لہجے میں کراہ اٹھا۔ ”ان دونوں بھائیوں کی تو دنیا ہی الجھن کی۔ ایک ہی دن میں وہ اولاد کی نعمت سے اتھوڑ دیئے۔ انسان اگر بے اولاد ہو تو کسی نہ کسی طرح میرا آئی جاتا ہے۔ وہ دونوں بھائی تو اپنی جوان اولاد کو کھو کر بڑھاپے میں بے اولاد ہو گئے ہیں۔ یہ صدمہ انہیں جیسے دے گا اور تہ ہی مرنے۔“

چودھری حفیظ اللہ کی آہ دیکھا اور گریہ و زاری کے دوران میں ہی چودھری سجاد اللہ کے خاموش اشارے پر نصیر اور منظور چپ چاپ وہاں سے کھسک لیے تھے اور میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ملک صاحب! آپ کیوں اچانک کھڑے ہو گئے؟“ چودھری حفیظ اللہ نے مجھ سے پوچھا۔

”مجھے اس وقت یہاں نہیں، قاتلے میں ہونا چاہیے چودھری صاحب!“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”آپ نے مجھے جس کام کے لیے بلایا تھا، وہ مکمل ہو چکا۔ اب قاتلے میں دوسرے فریادیوں کو قاتل کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ چودھری یعقوب کو قاتلے میں بیٹھ کر میرا انتظار کرنا پڑے۔ امید ہے آپ میری پیشہ ورانہ مجبوری کو سمجھ گئے ہوں گے۔“

”آپ نے بھائی یا ملک صاحب!“ چودھری سجاد اللہ نے سمجھ انداز میں کہا۔ ”مشاقق کی طرح میں سلیم کو بھی اپنا بڑا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے ان دونوں کی عبرت ناک موت کا حد درجہ دکھ ہے۔ یہ ساری اموات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی لگ رہی ہیں اور ان خوریز واقعات میں اول آخر نقصان ہوا ہے شیر گڑھ کے چودھریوں کا۔“ پھر وہ بھی میری دیکھا دیکھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔

”ملک صاحب! ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں تاکہ چاچا یعقوب کو ایسا محسوس نہ ہو کہ مصیبت کی اس گھڑی میں وہ تنہا کھڑا ہے۔“

”بیٹا جی! میں تمہارے اس جذبے کو سلام کرتا ہوں۔“ بڑے چودھری نے چھوٹے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے سادگی انداز میں کہا۔ ”لیکن نقصان صرف شیر

گڑھ والوں ہی کا نہیں، ہمارا بھی ہوا ہے۔ عروج کی دردناک موت کے ساتھ ہی تمہارا گھر بھی توجڑا ہے۔ کیا یہ ہمارے لیے قیامت کی گھڑی نہیں ہے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”ملک صاحب! مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ آپ میری حویلی میں تشریف لائے اور بغیر کچھ کھائے بے رخصت ہو گئے۔ کاش، میں جی جان سے آپ کی خاطر داری کر پاتا۔“

”مل بیٹھے اور خاطر داری کے ہزاروں مواقع آئیں گے چودھری صاحب!“ میں نے اس سے الوداعی معافی کرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ آرام کریں۔ میں کل کی وقت آپ سے ملاقات کرنے آؤں گا۔“

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں چودھری سجاد اللہ کے ساتھ ایک تانگے پر سوار ہوا اور مذکورہ تانگہ میرے قاتلے کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

وہ رات کے آٹھ بجے کا مکمل تھا۔ میں اس وقت کانسٹیبل واحد حسین کے ساتھ موضع شیر گڑھ کے آخری کنارے پر واقع چھلی والے کھوہ سے چند قدم آگے کھیتوں کے بیچ موجود تھا۔ فضا میں ٹپکی نہیں بلکہ باقاعدہ ٹھنڈک کا راج تھا۔ فروری کا مہینا آدھا گزر چکا تھا لیکن موسم سرما کی رخصت کے امکانات ابھی ظاہر ہونا شروع نہیں ہوئے تھے۔

ہمارے چاروں طرف تاریکی نے سیرا کر رکھا تھا مگر میں اور دیگر لوگ کھیتوں کے جس حصے میں تھے، وہ اچھا خاصا روشن تھا۔ لگ بھگ دو درجن لائینوں سے خارج ہونے والی روشنی نے ہمارے مخصوص ماحول کو مناسب انداز میں آجیل دیا تھا اور میں اس زرد بجالے میں سلیم احمد کی گردن کی لاش کو واضح طور پر دیکھ پا رہا تھا۔ سلیم کی عمر چھپیس سال بتائی جا رہی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک گہرے جوان تھا۔ ”قاتل“ اس لیے کہ اب اس کے لیے حال کا صیغہ استعمال کرنا ٹھیک اعتبار سے درست نہیں تھا۔ وہ ماضی تریب کا حصہ بن کر قصہ پارینہ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ کسی سنگدل شخص نے گلا کاٹ کر اسے فٹاکے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کا لباس خصوصاً لباس کا بالائی حصہ اس کے اپنے ہی خون میں تھپڑا ہوا تھا۔ کئی ہوئی گردن سے خارج ہونے والے ہونے اس کے لباس کو پوری طرح بھگو دیا تھا۔ وہ ایک انسانی قتل کی لڑہ خیر واردات تھی۔ شہرگ بری طرح کٹ جانے کے بعد

گردن کا مڑوہ مقام ورم کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ سلیم کی لاش کا منظر بلاشبہ روکنے کھڑے کر دینے والا تھا۔

میں نے ان کو دیکھ کر لاشوں کی روشنی میں مذکورہ لاش کا جسمی جائے کیا تھا اور اس کو کش میں کام کی ایک بات میرے ہاتھ لگ گئی تھی اور وہ یہ کہ سلیم کو کسی اور جگہ موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد یہاں لاکر پھینک دیا گیا تھا کیونکہ اس وقت جسمی مقام پر اس کی لاش پڑی تھی وہاں زمین پر مجھے خون کا نام و نشان دکھائی نہیں دیا تھا اور اس کا لباس اس امر کا گواہ تھا کہ اس کی گئی ہوئی گردن میں سے کسی قدر خون نکلا تھا۔

جب میں انفرانٹری کے عالم میں چودھری ساجد اللہ کے ساتھ تھا تو پہنچا تھا وہاں چودھری یعقوب احمد و انفرانٹری کے ساتھ بیٹے سے موجود تھا۔ ہمارے درمیان نہایت ہی مختصر سنجیدہ بات چیت ہوئی تھی اور ہم سب فی الفور جانے دوے کی سمت چل پڑے تھے۔ اس شینے سڑکے دوران میں میرے، ساجد اللہ اور یعقوب احمد کے ساتھ آج کے دن کی غصہ اور تنگی کے حوالے سے مکمل کرکٹ ہوئی تھی۔ سیرکف، میں نے واحد حسین کی مدد سے جانے دوے کی ضروری کارروائی مکمل کر لی تو چودھری یعقوب احمد نے مجھے سے کہا۔

”ملک صاحب! آپ میرے ساتھ بڑی حویلی چلیں۔ باقی کی باتیں وہیں بیچ کر کریں گے۔“

”مردود۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ایک آخری کام؟“ اس نے پوچھا۔

”سلیم کی لاش کو فوری طور پر سرکاری اسپتال بھجوا دوگا۔“ میں نے غصے سے بولے تھے۔

”یہ تو شکر کریں کہ موسم خنڈا ہے ورنہ ابھی تک اس لاش میں سے بدبو کے پھپھکاٹے شروع ہو چکے ہوتے۔“

سلیم کا باپ چودھری اسحاق احمد بھی موقع پر موجود تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے مجھے بخوبی اندازہ ہوا کہ میری بات اچھے سے ان کے سمجھ میں نہیں گئی تھی۔ انہوں نے کوئی سوال کیا اور نہ ہی اعتراض۔ میں نے سلیم کی لاش کو تانے میں دیکھا تو اس کے بعد کا نہیں واحد حسین کی فیس واری میں ملتی اسپتال روانہ کر دیا۔ واحد حسین کے علاوہ میں نے دو اور بندوں کو بھی تانے پر سوار کر دیا تھا تاکہ انہیں کوئی کام نہ ہو۔ وہ رات کا وقت تھا اور ایک مردان کی لاش کے ہمراہ کا شعلہ کا سیکر سفر کرتا مجھے ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ یہ اجماع میں نے اپنی اس عاجزگی سے

نظر کیا تھا۔ ان تمام قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد میں اور ساجد اللہ، چودھری برادران کے ہمراہ شیر گڑھ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔

گاؤں کے کم و بیش وسط میں دو عالیشان حویلیاں پہلو بہ پہلو بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک ساجد کے اعتبار سے دوسری سے بڑی تھی اور وہ ”بڑی حویلی“ کہلاتی تھی جبکہ دوسری کو لوگ ”چھوٹی حویلی“ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان دونوں حویلیوں میں یعقوب احمد اور اسحاق احمد رہتے تھے۔ میں اس وقت بڑے چودھری کی رہائش گاہ یعنی بڑی حویلی میں موجود تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے علاوہ چودھری یعقوب کا داماد بھی وہاں حاضر تھا۔ میں نے مناسب، موزوں اور ہمدردی میرے الفاظ میں پہلے تو ان تینوں کو ان واقعات کے حوالے سے مکمل دلاسا دیا پھر ضرورت حال کی غشی کی طرف آگیا۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کو دیکھنے کے بعد کہا۔

”ایک بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ دونوں لرزہ خیز وارداتیں کسی اتفاقی کارروائی کا نتیجہ ہیں اور ان کے پیچھے کسی ایک ہی شخص کا ہاتھ ہے اور وہ شخص طاقت و اختیار میں اگر آپ لوگوں کے ہم پل نہیں تو آپ سے کم بھی نہیں ہے کیونکہ راجن اور لیر نے ایسی منظم کارروائی نہیں کر سکتے۔ متوکلین کی جانوں کے سوا کچھ بھی نہیں گیا۔ اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ قاتلوں کو صرف سلیم، مشتاق اور عروج کوئی موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ آپ دونوں بھائیوں کی پوری اولاد کا صفایا ہو جائے اور شیر گڑھ کی دونوں حویلیاں اپنے مستحقین کے وارثوں سے محروم ہو جائیں اور آپ کے دشمن کی یہ ناپاک چال بدقسمتی سے کامیاب رہی ہے۔ اس وقت آپ دونوں بھائی اپنی اولاد کو نبیث کے لیے کھینچے ہیں۔“

توقف کر کے میں نے ایک پوچھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”اگر میرا اندازہ غلط ہے تو آپ لوگ میری تصحیح کر دیں لیکن اگر آپ میرے خیال سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر آپ مجھے اپنے تمام دشمنوں کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کریں تاکہ میں جلد از جلد ان تین انسانوں کی اسوالت کے حقیقی ذمے داروں تک رسائی حاصل کر کے انہیں قرار دے کر ماروا لوں۔“

مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔

”ملک صاحب! یہی بات تو یہ ہے کہ اسحاق احمد سے کسی کی براہ راست کوئی دشمنی نہیں۔“ چودھری یعقوب نے غصے سے پوچھل آواز میں جواب دیا۔ ”البتہ میرے کسی ایک سیاسی دشمن ضرور ہیں۔ میں اللہ کے فضل سے ہمیشہ ان بات

میں کامیابی حاصل کرتا رہا ہوں اور ظاہر ہے یہ بات بہت سے لوگوں کو بھی نہیں گئی۔ اس وقت بھی اس شخص کی روایتی سرگرمیاں شروع ہو چکی ہیں اور اس بار میرے مقابلے میں ہندو گندلاں والا کا ایک زمیندار احمد نواز گوندل لکیشن لورہا ہے۔ میرے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ میں دعوے سے کہہ سکوں کہ قتل و غارتگری کی ان وارداتوں کا ذمہ دار احمد نواز گوندل ہی ہے لیکن ظاہر ہے ان حالات میں میرا دھیان سب سے پہلے اسی کی طرف جانے لگا۔“

”میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا چودھری صاحب! میں نے رسایت بھرے لہجے میں کہا۔“ مجھے اپنی تفتیش کے آغاز کے لیے ایک نام مل گیا ہے۔ میں آپ کے باپا حریف احمد نواز گوندل کو اپنے طریقے سے چپک کر لوں گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور اہم بات آپ لوگوں کے علم میں ہوتی مجھے ضرور بتائیں تاکہ مجھے اپنے کام میں مدد مل سکے۔“

چودھری اسحاق احمد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کرنی نوٹ کا ایک ٹکڑا برآمد کیا اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ہو سکتا ہے آپ اس نوٹ کے ذریعے ان سفاک جانکوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

میں نے کرنی نوٹ کے اس ٹکڑے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ سو روپے مالیت کے نوٹ کا ادعا حد تھا یعنی نوٹ کو درمیان سے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن میں سے ایک حصہ اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے مذکورہ سو روپے کے نوٹ کے ذیل میں ”کاٹ“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اسے اور بچنے ہوئے نوٹ کی حالت میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق میری عتائی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ نوٹ کے ”مقام علیحدگی“ پر کی تیز دھارتی یا چھری کے آثار واضح طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ اگر اس نوٹ کو پھاڑ کر دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہوتا تو اس کی سطح اتنی ہموار ”شارپ“ نہ ہوتی۔

”آپ کو سو روپے والے نوٹ کا پتلا کچھ کہاں سے ملا ہے چودھری صاحب؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں چودھری اسحاق سے استفسار کیا۔

”یہ مجھے نہیں، فریڈا جی کو ملا ہے ملک صاحب!“

چھوٹے چودھری نے مجھے بتایا۔ ”یہ وہی بندہ ہے جس نے حویلی آکر ہمیں اس سانپ کی اطلاع دی تھی۔ سو روپے کا یہ آدھا نوٹ سلیم کی لاش کے قریب ہی ایک پتھر کے نیچے اس طرح دبکا کر رکھا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر اسی پر پڑے۔“

”یہ کارستانی یا جادو اسی قاتل کی ہے جس نے آپ کے

بڑے سلیم کو گھٹ کے گھاٹ اتارا ہے۔“ میں نے نوٹ کے اس ٹکڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد پرجوش انداز میں کہا۔ ”یہ ایک طرح سے اس کا کوئی خفیہ پیغام ہے۔ میں بہت جلد اس پیغام کو سمجھ جاؤں گا۔“ میں نے بھرے لیے تھا پھر مذکورہ نوٹ کے ٹکڑے کو اپنی جیب میں رکھنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”اندر میرے کے باعث میں جانے دوے اور اس کے گرد و نواح کا تسلی بخش جائزہ نہیں لے سکا۔ آپ لوگوں سے میری استدعا ہے کہ اس طرف لوگوں کے جانے پر پابندی عائد کر دیں۔ میں کل صبح اپنے بندوں کو یہاں بھیجوں گا۔ وہ محکم پھر کر اچھی طرح موقع و واردات کو کھنگالیں گے۔ عین ممکن ہے کہ اس نوٹ کے ٹکڑے کے علاوہ بھی کوئی اہم سراغ ہاتھ لگ جائے۔“

”ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے ملک صاحب!“

بڑے چودھری نے منسلک انداز میں کہا اور پوچھا۔ ”کیا آپ کو فریڈا پور والے دعوے سے بھی سو روپے والے نوٹ کا کوئی ٹکڑا ملا ہے۔“

”میں چودھری صاحب!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”فریڈا پور والے دعوے کی کارروائی کے وقت تو دن کی روشنی موجود تھی لیکن اس کے راتے کے آس پاس یا پھر پتھروں کے اندر ہمیں ایسی کوئی شے نہیں ملی البتہ ان دونوں خوشیں وارداتوں میں سے کسی ایک چیزوں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔“

”مٹاکو کی چیز؟“ چھوٹے چودھری نے سوال اٹھایا۔

”فریڈا پور والی واردات میں عروج، مشتاق اور کہو ان اللہ دتا کو تانے پر ہی موت کے گھاٹ اتارا گیا لیکن ان کی لاشوں کو کچے راستے کے کنارے چپک کر گئے کوکھٹوں کے اندر پھنسا دیا گیا۔“ میں نے بے تحاشے الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”سلیم احمد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حال ہوا ہے یعنی اسے کسی اور جگہ لے کر گئے بعد اس کی گردن کی لاش کو کھنڈی والے کھوکھو کے نزدیک پھینک دیا گیا۔ کل میرے اسٹاف کے لوگ اس مقام کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے جہاں سلیم کی جان لی گئی ہے۔ ان شاء اللہ!“

”میں نے کئی توقف کر کے ان تینوں چودھریوں کے چہروں پر مسئلہ لائے مگر دائرہ کے بادلوں کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”فریڈا پور اور شیر گڑھ کے سماعتات کا کوئی بھی شاہد ہے اور نہ ہی کسی نے دعوامت کے آس پاس کسی قسم کی کوئی

موضع شیر گڑھ کے لیے روانہ ہو رہا تھا جب تک ہاشم سرکاری ہسپتال سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
 ”ہاشم! کیا تمہارے بچے میں بہت زیادہ گرمی
 بھر گئی ہے جو اس سردی میں تھانے کے سامنے چھلک رہی
 کر رہے ہو؟“

”ایسا نہیں ہے ملک صاحب!“ وہ میرے ساتھ
 چلتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے سوال کیا۔ ”تو پھر کیسی بات ہے؟“
 ”مجھے آپ کو کچھ دکھانا اور کچھ بتانا ہے۔“ وہ الجھن زدہ

انداز میں بولا۔ ”اور..... آپ سے معافی بھی مانگتا ہے۔“
 ”وہ کیوں؟“ میں نے تھانے کے اندر داخل ہوتے

ہوئے پوچھا۔ ”تم نے ایسا کیا کر دیا ہے جس کے لیے معافی
 مانگنے کی ضرورت پیش آئی؟“

”مجھ سے ایک بھول ہو گئی ہے ملک صاحب!“ وہ
 عداوت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں دراصل لالچ میں آ گیا

تھانے میں نے آپ سے کچھ چھپایا تھا۔“
 ”بھارت میں کیوں ڈال رہے ہو ہاشم!“ میں نے اسے

گھورا۔ ”جو بھی کہنا ہے، سیدھے اور صاف الفاظ میں کہہ
 ڈالو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے بھی اور کھری بات پسند ہے؟“

”میں آپ کی اس عادت سے واقف ہوں ملک صاحب
 اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ میری خطا کو معاف کر دیں گے۔“

اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”جب آپ اپنے کمرے میں
 جا کر بیٹھیں گے تو دوسرے لوگ آپ کو گھیر لیں گے اس لیے میں

چاہتا ہوں کہ آپ یہاں پر میری بات سن لیں۔“
 ہاشم کے جذبہ اصرار میں کچھ ایسا موجود تھا کہ

میں نے اس کی بات مان لی اور معتدل انداز میں کہا۔
 ”ٹھیک ہے، میں سن رہا ہوں۔ تم یوں شروع کرو۔“

”آج سہرے میں جب میں فریڈ پور والے دعوے کا
 جائزہ لے رہا تھا تو مجھے تانگے کے اندر سے سو روپے والے

نوٹ کا آدھا حصہ ملا تھا۔“ اس نے نہایت ہی سادگی سے
 بتانا شروع کیا تو میرے دماغ کو گیارہ ہزار روٹ کا جھٹکا

لگا۔ ”میں نے اس خیال سے وہ آدھا نوٹ اٹھا کر اپنی جیب
 میں رکھ لیا کہ کل میں کسی وقت ادھر جاؤں گا وہاں اس نوٹ کے

دوسرے حصے کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ جانتے
 ہیں یہ تم میری دوا کی تنخواہ کے برابر ہے اسی لیے میرے

دل میں لالچ آ گیا تھا لیکن جب میں تین لاشوں کے ساتھ
 جانے واردات سے ہسپتال کی طرف جا رہا تھا تو میرے ضمیر

نے ملامت کی کہ میں نے یہ بات آپ سے کیوں چھپائی۔

سکھو کہ گرمی نوٹ کی۔ فریڈ پور والی لاشیں ایک کھیت مزدور
 کرامت ملی نے دریافت کیں اور سیدھا ڈپٹی جرنل پہنچ کر اس
 سانچے کی اطلاع دی۔ کرامت ملی ہی کی طرح کا کردار شیر گڑھ

میں فریڈ پور والے ادا کیا ہے۔ علاوہ ان کے ان دونوں گزیر
 وارداتوں میں تیز دھار پرچوں، بمالوں، بھڑوں اور بیڑوں

وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن حملہ آور اسے تیز کار اور پیشور
 فائنل سے کہیں بھی کسی آکر ٹکڑ کو چھوڑ کر نہیں گئے۔ یہ میں کڑ

موجودہ کی تفتیش کی بات کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کل دن کی
 روشنی میں شیر گڑھ والے دعوے سے کوئی آکر ٹکڑ پولیس کے ہاتھ

لگ جائے اور سب سے اہم نکتہ.....! میں نے ڈرامائی انداز
 میں توقف کر کے ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات

مکمل کرتے ہوئے پُر دھوکہ الفاظ میں کہا۔
 ”ان دونوں وارداتوں میں ایک ہی خاندان کو

جہاز کر کے اس کی آئندہ نسل کا خاتمہ کر دیا گیا ہے جس
 سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قاتلوں کا تعلق آپ ہی کے

دشمنوں سے ہے۔“
 میں اپنی کہہ کر خاموش ہوا تو چودھری برادران گہری

اور پُر فکیر سوچ میں ڈوب گئے۔ چودھری سید علی کے
 چہرے پر بھی ہر جگہ تشویش اور دکھ کی ہی عکاسی تھی۔ چہ

لمحات کی تکصیر خاموشی کے بعد چودھری یعقوب احمد نے
 غصے سے لہجے میں کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب! میں بھی
 اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ہمارا جو نقصان ہو چکا، اس کی جانی یا مارا

تو کسی بھی قیمت پر ممکن نہیں ہے لیکن آپ کم از کم اتنا تو کر سکتے
 ہیں کہ اس دانتے کے ذمے داروں کو انصاف کے ٹھہرے میں

لا کر انہیں میرے تانگے میں لٹا دیں۔ ان کی جگہ سے ہلکی مڑا
 بھی بھیاں موت کی صورت ہونا چاہیے تاکہ ہمارے بیٹوں

میں بڑی ہوئی آگ کی چش میں کسی قدر کمی واقع ہو۔“
 ”یہ میرا آپ لوگوں سے وعدہ ہے کہ مجرم بہت جلد

میرے تھانے کی حرالت میں بند ہوں گے۔“ میں نے
 پُر غم لہجے میں کہا۔ ”وہ سفاک درندے کسی بھی حال میں

میرے تانگے سے نہیں بچ سکیں گے۔“
 ان لوگوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں انہیں

انصاف کی قوی امید دلا کر وہاں سے واپس آ گیا۔ جب میں
 تھانے پہنچا تو تھوڑی تاخیر کے گیارہ بج رہے تھے۔

تھانے کا مملہ میری راہ دیکھ رہا تھا۔ کاشیہل محمد ہاشم تو
 تھانے کے باہر ہی مل گیا۔ مجھے تانگے سے اتار دیکھ کر وہ فوراً

میرے نزدیک آ گیا۔ جب میں چودھری یعقوب کے ساتھ

بہر حال جب میں ان لاشوں کو ہسپتال پہنچا کر واپس تھانے
 آیا تو آپ شیر گڑھ کے لیے نکل چکے تھے۔ جب سے میں
 ادھر ادھر کر رہا ہوں اس کا انتظار کر رہا تھا۔“

ادھر ادھر کر رہا ہوں اس کے لیے اپنی معافی کی
 ہاشم کو خبر نہیں تھی کہ اس نے اپنی معافی کی

”درخواست“ میں مجھے سختی بڑی خوشخبری سنائی تھی۔ اس
 سے خاموش ہونے پر میں نے سات آواز میں استفسار کیا۔

”نوٹ کا وہ کون سا وقت کہاں ہے؟“
 ”میرے پاس ہے جناب!“ وہ اپنی چٹلون کی جیب

میں اچھڑا لے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی اس آدھے نوٹ کو
 آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔“

آئندہ پندرہ سیکنڈ میں سو روپے والے نوٹ کا وہ
 آدھا حصہ میرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ جو آدھا نوٹ

چودھری اسحاق نے بڑی حوصلے میں مجھے دیا تھا، اس کا نمبر
 میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ میں نے ہاشم کے دیے

ہوئے آدھے نوٹ پر نگاہ ڈالی تو اس امر کی تصدیق ہو گئی،
 یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی نوٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں

نے اس ٹکڑے کو بھی اپنی جیب کے اندر اس سے بچھڑے
 ہوئے ٹکڑے کے پاس پہنچانے کے بعد ہاشم کی طرف

دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔
 ”میں تمہارے اس لالچ کو ایک بشری کمزوری جان

کر نہیں دل سے معاف کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے
 اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان دیا اور مجھے سب کچھ سچ

بتا دیا۔ یہ عمل تمہیں ایک اچھا انسان ثابت کرتا ہے۔“
 وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے اضطرابی آواز

میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”ملک صاحب! کیا آپ نے واقعی
 مجھے معاف کر دیا ہے؟“

”ہاں، بالکل۔“ میں نے دونوں انداز میں جواب
 دیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تمہیں چند ایک باتوں کا

خیال رکھنا ہے۔“
 وہ بہت نرم گوشہ ہوتے ہوئے نڈباندہ انداز میں بولا۔

”آپ حکم کریں ملک صاحب!“
 ”تم پچھلے دس منٹ سے مجھے گہرے کھڑے ہو۔“

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تھانے میں موجود
 ٹکڑے کے دوسرے افراد کے ذہنوں میں یقیناً کھلی چکی ہوگی

کہ آخر ہمارے درمیان کون سے راز و نیاز چل رہے ہیں۔
 اپنے دماغ میں بٹھا لو کہ وہ راز و نیاز کچھ اس طرح

ہیں.....! میں نے نہایتی توقف کر کے ادھر ادھر دیکھا پھر
 ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”آج فریڈ پور والے دعوے سے تمہیں سو روپے
 والے نوٹ کا آدھا حصہ ملا تھا تم نے اپنی جیب میں رکھ
 لیا پھر میں نے تمہیں لاشوں کے ساتھ ہسپتال روانہ کر دیا اور

تم مجھے اس آدھے نوٹ کے بارے میں بتانا بھول گئے۔
 اس وقت تم نے بے حد معذرت کے ساتھ وہی آدھا نوٹ

میرے حوالے کیا ہے۔ بس، اتنی ہی بات ہے۔“
 ”یہ سب تو مہم نمد سچائی پر مبنی ہے ملک صاحب!“

وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”بس، آپ نے میرے
 لالچ اور ضمیر کی ملامت کو اس کہانی سے نکال دیا ہے۔“

”تم بھی اپنے من میں سے لالچ کے جذبے کو نکال
 باہر کرو ہاشم!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس طرح

ضمیر کو ملامت کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی اور
 تمہارا دل و دماغ ہر وقت اس دانش کا گہوارہ بن رہا ہے۔“

وہ ممنونیت بھری آواز میں بولا۔ ”ملک صاحب!
 میں آپ کی اس کلمہ کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”شباباش!“ میں نے سادہ انداز میں کہا۔ ”آپ تم
 جا کر میرے لیے گرم کھانے کا بندوبست کرو۔ مجھے

بہت زوری کی بھوک محسوس ہو رہی ہے اور ہاں..... میں نے
 نہایتی توقف کر کے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”میرے

کوارٹر کے اندر ایلیٹیم کے ایک ڈبے میں گاجر کا پاداموں
 والا صلوا رکھا ہوا ہے، ذرا اسے بھی گرم کر لیں۔ اس وقت مجھے

اضافی توانائی کی ضرورت ہے اور یہ صلوا اس مقصد کے لیے
 رسان کن کا درجہ رکھتا ہے۔“

”میں چند منٹ کے اندر آپ کے حکم کی تعمیل کر دوں
 گا ملک صاحب!“ وہ توانا لہجے میں بولا۔

اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا اور حوالدارنی
 بخش اور اسے اس کی قادری کو بھی واپس بلا لیا۔ فریڈ پور سے

واپس پر میری ان سے تفصیلی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں
 میرے بعد اس تھانے میں بیٹھ گئے۔ میں نے نہایت ہی مختصر

الفاظ میں انہیں دونوں دعوے جات کی صورت حال سے آگاہ
 کرنے کے بعد سو روپے والے نوٹ کے دونوں حصوں کو

ان کے سامنے رکھتے ہوئے پھر انداز میں سوال کیا۔
 ”آپ لوگ قاتلوں کی اس ”پالیسی“ کے بارے

میں کیا کہتے ہیں؟“
 ”ایک بات تو ہے ملک صاحب!“ حوالدار نے سوچ

میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ مجرم بہت بالدار ہیں اسی لیے
 سو روپے والے نوٹ کو دے دیتی ہے مجاز کر ادھر ادھر پھینک

دیتے ہیں ورنہ ان چٹلوں کی کوئی وجہ مجھ میں نہیں آتی۔“

”میرا وہاں چار سال پہلے والے ایک واقعے کی طرف جاتا ہے۔“ اسے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ان دنوں میں خانیہ وال کے ایک قاتل نے قیادت کیا۔ اس علاقے میں ایک خطرناک گروہ کا قاتل ہنسٹ عرف یوسی ہوا کرتا تھا۔ وہ ہماری سوار نے پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر تھکا اور جانے تو ہر گز نہیں لڑا۔ ایک حصہ چھوڑ جاتا تھا۔ اس کی یہ ادا کسی کی کچھ میں نہیں آتی تھی۔ حتیٰ کہ پولیس والے بھی اس سے اس قدر بٹالانے تھے کہ اس کے حرام موت مرنے کی دعا میں مانگا کرتے تھے کیونکہ ہزاروں کوشش کے باوجود وہی وہ ان کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ وہ کڑے سے کڑے جہرے میں بھی اپنے مظہر بندے کا شکار کر کے غائب ہو جاتا تھا پھر ایک روز وہ بالکل ہی غائب ہو گیا۔ وہ کہاں چلا گیا؟ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جان سکا۔ رفتہ رفتہ پولیس والے اور دوسرے لوگ کانٹے یوسی کو بھول گئے۔ یہی سوچ لیا گیا کہ وہ کسی اندھی قبر میں جا سوا ہے۔“

”تم نے ابھی یوسی (یوسف) کے نام کے ساتھ لفظ ”کایا“ بھی استعمال کیا ہے۔“ اسے ایس آئی کے خاصوش ہونے پر میں نے سوال اٹھایا۔ ”کیا اس سفاک اور بے رحم قاتل کی ایک آنکھ میں کوئی خرابی تھی؟“

”جی ہاں، ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کی ایک آنکھ بے نور تھی اسی لیے اسے ”کانا یوسی“ بھی کہا جاتا تھا۔“

”کیا کبھی تمہارا اس سے سامنا ہوا؟“ میں پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔ ”میرا مطلب ہے تم نے اسے رو رو دیکھا تھا؟“

”نہیں ملک صاحب!“ اس نے نفی میں جواب دیا۔ ”میں نے صرف اس کے بارے میں سنا ہی تھا۔ اسے دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔“

”اور تم یہ سمجھتے ہو کہ وہی کانا یوسی اب ہمارے علاقے میں سرگرم عمل ہو گیا ہے؟“ حوالدار نے اسے ایس آئی کی طرف دیکھتے ہوئے غم خیزہ انداز میں کہا۔ ”اور ان دونوں وارداتوں میں اس کا ہاتھ ہے؟“

”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ وہ حوالدار کی چوٹ پر برا سامنا نہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ملک صاحب کے سناتے ہوئے آدمیوں کو لوٹنے والے واقعے کے حوالے سے یوسی کا ذکر کیا ہے۔ مجھے نہیں امید کہ وہ اب زندہ بھی ہو نہ سکتا ہے۔ وہ چپ بیٹھے والا نہیں تھا۔“

میں اسے ایس آئی اور حوالدار کی باہمی چپقلش اور مسابقت سے ابھی طرح واقف تھا۔ وہ خود کو دوسرے سے

برتر ثابت کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے بڑے کیڑے نکال کر نکال رہا تھا۔ اس کے ان کے چاق کوئی نیا حوالہ نہیں دیتا تھا۔ ”تم لوگ آپس میں الجھنے کے بجائے میری بات دھیان سے سنو۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ تم دونوں نے کون کون سا کام انجام دینا ہے۔“

وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”قادر علی!“ میں نے اسے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کل صبح کسی کانسٹیبل کو ساتھ لے کر شیر گڑھ والے وقوعہ پر جا گئے اور وہاں سے کوئی اہم سراغ تلاش کرنے کی کوشش کرو گے۔ تمہاری خصوصی کمپنیز آگے نکلنے کے حوالے سے ہوگی۔“

”مجھے کیا ملک صاحب!“ وہ سر کو اٹھاتی جھٹک دیتے ہوئے فرمانبرداری سے بولا۔ ”میں آپ کی امید پر پورا اتروں گا۔۔۔ ان شاء اللہ!“

”اور تم۔۔۔!“ میں نے روئے سخن حوالدار کی جانب موڑتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”کل کا پورا دن تم نے یہاں موجود رہ کر تمہاری داری کرنا ہے۔ مکمل چوکی اور ذمے داری کے ساتھ۔“

”جو آپ کا حکم ملک صاحب!“ وہ ہشاش بشاش لہجے میں بولا اور پوچھا۔ ”کیا آپ کل کہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”ہاں، بالکل۔“ میں نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ”میں آپ لوگوں کو اس کیس کے تمام پہلوؤں سے مکمل طور پر آگاہ کر چکا ہوں۔ میں کل صبح ”پنڈ کونڈلاں والا“ جا رہا ہوں، چودھری یعقوب احمد کے سیاسی حریف احمد نواز کونڈل کا ”انٹرویو“ کرنے۔ ہر دست ہمارے شک کے دائرے میں اس بندے کے سوا اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کانسٹیبل محمد ہاشم نے کمرے میں داخل ہو کر اطلاع دی۔ ”ملک صاحب! میں نے آپ کے کوارٹر میں گرہم لکھا ناگہا دیا ہے۔“

”تم لوگ آرام کرو کیونکہ کل کا دن بہت لمبا ہونے والا ہے۔“ میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”پیٹ نال پیٹیاں روٹیاں، تے بنے گلاس کھوٹیاں!“

☆☆☆

شیر گڑھ، فرید پور، جمال نگر اور منگور کوٹ کی طرح پنڈ کونڈلاں والا ابھی میرے قہقہے کی حدود میں آتا تھا۔ یہ گاؤں

شاہکار داری

شیر گڑھ میں ملک صاحب احمد کیل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ علاقہ ہے اس کی سب سے انتہائی شمال مغرب اور وہاں کی آمد میں اس کیل میں کانسٹیبل جاوے کی معیت میں رہتا تھا۔ پنڈ کونڈلاں والا پنچا تو وہ چہرہ ہو سکتی تھی اور میرا مطلب یہ ہے کہ کونڈلاں کہیں جانے کے لیے پرتول رہا تھا۔

پنڈ کونڈلاں کونڈل کے لیے میرا استقبال کیا اور مجھے عزت و احترام کے ساتھ اپنی چوکی کے اندر لے گیا۔ رکی علیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”کونڈل صاحب! کہاں جانے کی تیاری ہے؟“

”ملک صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انتہائی گم کام آواز ہو چکا ہے۔“ وہ سناہت بھرے لہجے میں بولا۔ ”اسی لیے میں آج کل کہیں نہ کہیں جانا لگا ہی رہا ہے۔ ویسے اس وقت میرا موقع شیر گڑھ جانے کا ارادہ تھا۔ مجھے پتا چلا ہے وہاں کے دو چودھری برادران کے ساتھ کوئی افسوسناک واقعہ پیش آ گیا ہے۔ میں ان دونوں کے بچوں کی الناک اموات کی تعزیت کے لیے وہاں جا رہا تھا۔“

اس نے دانستہ یا نادانستہ چودھری یعقوب اور اس کے چھوٹے بھائی چودھری اسحاق کا نام نہیں لیا تھا۔ میں درست کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا کہ یہ ایک اتفاقی عمل تھا یا اس میں احمد نواز کونڈل کی بددینی بھی ہوئی تھی۔

”کونڈل صاحب! ان چودھری برادران میں سے ایک اس الیکشن میں آپ کا سیاسی حریف بھی ہے۔“ میں نے ال کے چہرے پر نگاہ جما کر سختی خیر انداز میں کہا۔ ”میں چودھری یعقوب احمد کی بات کر رہا ہوں جناب جس کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ وہ بھی الیکشن ہارائیں ہے۔“

”ملک صاحب! ہار جیت تو مقدر کا کھیل ہے۔“ اس نے ہنس مچھکے انداز میں کہا۔ ”کسی انسان کا تعین کس وقت چمک اٹھے یا کب دغا دے جائے، اس کے بارے میں میں ازلت کچھ نہیں کہہ جاسکتا۔ یہ کوئی فارمولہ نہیں کہ ایک شخص ہر میدان میں زندگی بھر جیت ہی حاصل کرتا رہے گا اور کسی بندے کے بارے میں دعوے سے یہ بھی نہیں کہہ جاسکتا کہ وہ اپنے مقدر میں ازلی ابدی شکست ہی کھو کر اس دنیا میں آیا ہے۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں سرکار اور اللہ تو ان لوگوں کا بھی ہے جو اس کی ذات پر یقین نہیں رکھتے۔“

احمد نواز کونڈل فربہ اندام ہونے کے باوجود بھی ہڈاڑ اور جنگ شخصیت کا مالک تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ گفتگو طلب، معقول اور مہذب گفتگو کے فن سے آشنا تھا۔ یہ اس سے میری پہلی ملاقات تھی اور اس کی بات چیت

نے مجھے حیران کیا تھا۔

”آپ نے درست فرمایا کونڈل صاحب!“ میں نے تاثراتی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اللہ ہی کا ہے اور یہی اس کے بندے اور اس کی حقوں ہیں۔ وہ اس بنا پر کیسے نہیں کرتا کہ کون اسے سکتا مانا ہے اور کون اس کے وجود سے انکاری ہے۔ یہ دنیا بھر کو کوشش ہے۔ جو شخص جتنی کوشش کرتا ہے، اسے اس کی محنت کا اتنا پل ضرور ملتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائگاں نہیں جانے دیتا۔ انسانی اس کی شان کے خلاف ہے۔ بے شک وہ عزت اور زلت کا مالک ہے۔“

”ہیں، سرکار! میں بھی محنت اور کوشش ہی تو کر رہا ہوں۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”بائی جو مالک کی مرضی، نتیجہ تو اس کے ہاتھ میں ہے مالک صاحب!“

”بے شک۔“ میں نے دو لوگ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کونڈل صاحب! ابھی تو یودی دیر پہلے آپ نے ”اس وقت میرا موقع شیر گڑھ جانے کا ارادہ تھا“ اور ”میں چودھری برادران کے بچوں کی الناک اموات کی تعزیت کے لیے وہاں جا رہا تھا“ جیسے جملے ادا کیے تھے۔ ابھی کا صیغہ ”تھا“ تو یہ بتاتا ہے کہ اب آپ نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہے۔“

”آپ پولیس والے ہیں نا اس لیے آپ الفاظ کو اس طرح گرفت میں لیتے ہیں جیسے کسی خطرناک مجرم کی گردن ناپ لی ہو۔“ وہ زرب زب میرے سختی خیر انداز میں بولا۔ ”خیر، میں نے ابھی تک شیر گڑھ جانے کا ارادہ نہیں بدلا۔ گنگا بات تو یہ ہے کہ آپ پہلی بار میری چوکی پر تشریف لائے ہیں اس لیے آپ کو پروڈکٹ دینا بھی تو ضروری ہے نا۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ آپ یہاں ان دونوں خونریز واقعات کی تحقیق کرنے آئے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے آپ کی سماعت میں میرے خلاف بہت زہر اندھا بٹا ہوگا۔“

”ایسی بات نہیں ہے کونڈل صاحب!“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”چودھری یعقوب احمد اور اس کے چھوٹے بھائی چودھری اسحاق احمد نے اپنے کسی دشمن کی نشاندہی کی ہے اور وہی کسی شخص پر الزام لگا رہا ہے۔ میں روٹین کی پوچھ تاچھ کے لیے ہر اس جگہ جاؤں گا جہاں سے کوئی ایسا سراغ ہاتھ لگے کہ امید ہو جو مجھے چار افراد کے قاتلوں تک پہنچا دے۔ یقیناً آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کے پاس بھی اسی ملے میں حاضر ہوا ہوں۔“

ہوں۔۔۔۔۔! اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تو آپ نے یہ طے کر لیا ہے کہ شیر گڑھ اور فرید پور میں پیش آنے والے دونوں افسوسناک واقعات کا ذمہ دار کوئی ایک ہی شخص یا ایک ہی گروہ ہے اسی لیے آپ نے ”چار افراد کے قاتلوں“ کی بات کی ہے؟“

اسی دوران میں گونڈل صاحب کے ملازمین انے ہمارے سامنے انواع و اقسام کا سامان خورد و نوش چن دیا تھا۔ کھٹکے کے بیچوں بیچ ان اشیائے نعمت سے بھی خاطر خواہ انصاف کیا جا رہا تھا۔

”یہ نہیں، حالات و واقعات اور شواہد نے طے کیا ہے گونڈل صاحب کہ ان دونوں وارداتوں کے پیچھے کی ایک ہی پارٹی کا ہاتھ ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں مفروضوں پر اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کا قائل نہیں ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے ملک۔ صاحب! وہ سبھی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ”آپ کن حالات و واقعات اور شواہد کی بات کر رہے ہیں؟ کیا میں ان کے بارے میں جان سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں گونڈل صاحب!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں آپ کے تعاون سے اس کیس کو حل کرنے کی نیت لے کر پتھر گونڈلاں والا آیا ہوں۔ آپ سے کچھ چنپانے کا توسل ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!“

”یہ آپ کا بڑا اپن اور میری عزت افزائی ہے ملک صاحب! وہ منوبیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ بتائیں، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔“

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے آلات قتل و قاتل گری، قاتلوں کی سفاکی و بے رحمی کے بارے میں بتانے کے بعد سو روپے والے کڑی نوٹ کے دونوں حصوں کو اس کے سامنے رکھتے ہوئے غصوں انداز میں کہا۔

”ان میں سے ایک کلوا فرید پور والے وقوعہ پر اور دوسرا کلوا شیر گڑھ کے موقع واردات سے ملتا ہے گونڈل صاحب!“

کڑی نوٹ کے دو ٹکڑوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک چمکیں اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ”یہ تو کانے ہوئی کی واردات کا انداز ہے ملک صاحب!“

”کیا آپ یوسف عرف پوی نامی اس قاتل کو جانتے ہیں؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

”صرف نام کی حد تک۔“ اس نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”برسوں پہلے میں نے اس کا نام سنا تھا۔“

خانیوال اور اس کے گرد و نواح میں اس کی بڑی عمر بھاری معاوضہ لے کر لوگوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ سوال پہلے مرکب چکا۔ اب اگر اس کے انداز میں اس کا آدھا حصہ جائے وقوعہ پر چھوڑ کر قتل و قاتل گری کر دی گئی ہے تو میں ان خوش نکال واقعات کے بارے میں دے داران کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!“

ابھرنواز گونڈل کے چہرے کے تاثرات اور لہجے میں موجود اعتماد کو دیکھتے ہوئے میرا پیشہ ورانہ تجربہ بتاتا تھا کہ قتل کی حالیہ دو وارداتوں میں اس کا کوئی ہاتھ اور نہ ہی وہ اس حوالے سے کسی قسم کی معلومات رکھتا ہے۔

”ٹھیک ہو گیا گونڈل صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”اپنے آپ اس سلسلے میں میری راہنمائی فرما سکتے ہیں۔“

کے چودھریوں سے ہزار اختلافات اور سیاسی رجحانوں کے وجود میری طرح آپ کی بھی خواہش ہوگی کہ چار افراد کی اذیت ناک اموات کے ذمے داروں کو کوئی سے کڑی سزا ملے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا؟“

”بالکل نہیں جناب! آپ سولہ آنے درست فرما رہے ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ کئی معمولی واقعات نہیں ہیں۔ میں آپ کی آسانی کے لیے چار اشارے دے سکتا ہوں۔ اگر آپ نے تھانیدارانہ سرکاری رساں داغ کا استعمال کیا تو یہ بہت کم کسی کارآمد نتیجے تک پہنچ جائیں گے، اتنا مجھے یقین ہے۔“

”میں بہت گوش ہوں گونڈل صاحب!“ میں نے کہا۔ ”یہ بات پورا شیر گڑھ جانتا ہے کہ چودھری اسحاق کا اکلوتا بیٹا سلیم ایک عیاش لٹیچ جوان تھا اسی لیے چودھری یعقوب نے اپنی بیٹی عروج کا رشتہ اسے نہیں دیا تھا اور اس کی شادی فرید پور کے چودھری خاندان میں کر دی تھی۔“

ابھرنواز گونڈل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے معتدل انداز میں بتایا۔ ”یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ چودھری یعقوب کا بیٹا مشتاق اپنے کزن سلیم کا گہرا دوست تھا۔ ان کے درمیان کوئی بھی راز راز نہیں تھا کیونکہ بہت ساری بد نظمیوں میں وہ دونوں ایک ساتھ ہوا کرتے تھے۔ یہی مشتاق اپنی اکلوتی بہن عروج سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ عروج جو فرید پور کے چودھری سید اللہ کی بیوی تھی۔ ان کی شادی صرف چار ماہ ہی چل سکی۔“

میں انکے بیان کے بعد وہ لکھت خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے اظہارِ ری لہجے میں استفسار کیا۔

”اس سے کیا سمجھ میں آتا ہے؟“

”سمجھ میں تو اس وقت آنے کا جب آپ میری بات سمجھ میں لیں گے ملک صاحب!“ وہ معنی خیز انداز میں بے غور ذرا رہا۔ ”ان چار کرداروں پر توجہ دی تو بہت جلد ”اگر آپ نے ان چار کرداروں پر توجہ دی تو بہت جلد“ میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!“

”مگر آپ نے جن چار کرداروں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے میں سلیم احمد اور عروج سید اللہ تو تقریباً جانتا ہوں۔“ میں نے انھیں زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن چوتھا کردار ابھی بقید حیات ہے ملک صاحب!“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اور اس کا نام قتل ہونے والے ایک کردار کے ساتھ تھی بھی ہے جیسا کہ آپ نے ابھی میرے سامنے ”عروج سید اللہ“ کا نام لیا ہے۔“

”آپ کے ان دو معنی اور سنسنی خیز اشاروں سے میری سمجھ میں بھی آ گیا ہے کہ۔۔۔۔۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”مگر میں اپنی تفتیش فرید پور کی آہنی حویلی تک محدود کر دوں تو کامیابی کے امکانات روشن ہیں؟“

”میں ایسا سمجھتا ہوں۔ بانی اللہ بھتر جانتا ہے ملک صاحب!“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”دیوے میں ہر مال میں آپ کی سرخروئی کے لیے دعا گو ہوں۔“

”آپ کے اس خلوص اور اپنابت کے لیے میں بہت دل سے مشکور ہوں گونڈل صاحب!“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”ان شاء اللہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔“

”ان شاء اللہ!“ وہ اتنا لہجے میں بولا۔ ”اگر مجھے شیر گڑھ کی طرف نہیں جانا ہوتا تو میں آپ کو شام تک ضرور یہاں روک لیتا۔“

”بہت شکریہ گونڈل صاحب!“ میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور حویلی سے نکل آیا۔

ابھرنواز گونڈل نے اشاروں، کنایوں میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران میں، میں اس کی معنی خیز باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے مسلسل خاموشی اور کئی گھبراہٹیں ڈوبا دکھ کر کاشمیل جاوید نے کہا۔

”ملک صاحب! میں نے جیسا سوچا تھا، اس کے بالکل الٹ ہوا ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”جاوید! تم نے ایسا کیا سوچ لیا تھا؟“

”میرا خیال تھا کہ آپ گونڈل صاحب کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آئیں گے۔“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں

بولا۔ ”لیکن آپ نے تو اس سے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھ گچھ کی ہے۔“

”میری ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو جاوید!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”قانون ہر چھوٹے بڑے، طاقتور اور کمزور، اعلیٰ و ادنیٰ کے ساتھ مساوات کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ قانون کی نظر میں تمام انسانوں کے حقوق اور فرائض مساوی ہیں اور اسی قانون کا تقاضا ہے کہ بغیر ٹھوس ثبوت کے شخص شک کی بنیاد پر کسی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ بانی جہاں تک گونڈل صاحب سے میرے دوستانہ رویے کی بات ہے تو۔۔۔۔۔“ کھاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اسی دوستانہ رویے اور اپنابت بھرے انداز کی بدولت میں نے اس کی زبان سے بڑی کارآمد باتیں اگولی ہیں جو آگے چل کر میرے بہت کام آئیں گی۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہر پولیس والا آپ کے انداز میں نہیں سوچتا۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہم بے بس، لاچار اور کمزور لوگوں کو بغیر کسی سن یا وارنٹ کے ہی شخص شک کی بنیاد پر گرفتار کر کے نہ صرف حوالات میں بند کر دیتے ہیں بلکہ ان کی زبان کھولنے کے لیے سوسو تفتیشی ”جتن“ بھی کرتے ہیں۔“

”چند عاقبت نا اہلیوں کے اس غیر ذمے دارانہ فعل کے باعث پورے ڈیپارٹمنٹ کو بدور انداز میں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ کالی بیچریں تو ہر جگہ میں پائی جاتی ہیں۔“ میں نے دو لوگ انداز میں کہا۔ ”بہر کیف، تم نے پولیس کے جس عمومی رویے کا ذکر کیا ہے، وہ میرے نزدیک بہت افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔“

وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔ ”ملک صاحب! آپ کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھے گئے ہیں۔“

میں نے کاشمیل جاوید کی بات پر دھیان نہیں دیا اور دوبارہ ابھرنواز گونڈل کی باتوں پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

بعد وہ فردوسی کا آغاز بڑے سنسنی خیز انداز میں ہوا تھا۔ پچھلی رات جب میں پتھر گونڈلاں والے سے واپس آیا تو میرا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا۔ ابھرنواز گونڈل کی کہیں، مہمل اور گول مول باتوں کے اندر کئی ایک سرسرتہ راز چھپے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جو بھی کہا تھا، میں نے اسے ہلکا نہیں لیا تھا اور رات سوئے وقت بھی اس کے

اشارے اور کتابے میری سوچ کے اندر گردش کرتے رہے تھے اور جب متعلقین کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں اسپتال سے تھانے پہنچیں تو ایک نیا سلسلہ کھڑا ہو گیا۔

میں نے فریڈ پور اور شیر گڑھ اپنے بندوں کو بھیج کر دوہلی سٹارو خانہ اولوں کو تھانے بلالیا تھا۔ مذکورہ لاشیں تھانے کے کمن میں دھکی رکھی تھیں اور چودھری صاحبان میرے کمرے میں موجود ایک جی بٹ بجڑے پیٹھے تھے۔

چودھری یعقوب احمد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ملک صاحب! سلیم، اسحاق کا پیٹا ہے اور مشتاق و عروج دونوں میری اولاد ہیں لیکن ان تینوں کی لاشیں ہم دونوں بھائی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ ان کی تدفین شیر گڑھ کے قبرستان میں ہوگی۔“

چودھری اسحاق نے بڑے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے دونوں اعزاز میں کہا۔ ”بھائی جان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں خاندانہ صاحب! آپ یہ تینوں لاشیں ہمارے حوالے کر دیں تو بہت مہربانی ہوگی جناب کی۔“

”ہم نے کب کہا کہ عروج آپ کی بیٹی نہیں ہے یعقوب چاچا!“ چودھری سحیح اللہ نے اپنے سر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ آپ کی بیٹی ہونے کے علاوہ میری سگھو بھی تھی۔ عروج کی لاش تو فریڈ پور کے قبرستان ہی میں دفن ہوگی۔ آپ سلیم اور مشتاق کی لاشوں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ ہم عروج اور اللہ اللہ کی لاشیں اٹھا لیتے ہیں۔“

چودھری یعقوب احمد نے برہمی بھرے لہجے میں کہا۔

”برخوردار! میں نے عروج کو پورے تیس سال تک اپنے جگر کا حصہ بنا کر پالنا تھا اور چھ ماہ کی عمر میں چار ماہ ہوئے ہیں۔ تم میری بیٹی کی لاش کے دعویدار نہ بنو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ ہم ہر قیمت پر اس کی لاش کو شیر گڑھ لے کر ہی جائیں گے۔“

”میرا دعویٰ قطعی یا مجبور نہیں ہے چاچا جان!“ سحیح اللہ نے کھلی آواز میں کہا۔ ”وہ ہر صورت میں میری بیوی کی اور یہ حق مجھے قانون اور شریعت نے دیا ہے۔ اس کی لاش کا واحد وارث صرف اور صرف میں ہی ہوں۔“

”میں اور بھائی جان تو اپنی اولادوں سے بے سرحرم ہو چکے ہیں۔“ چودھری اسحاق نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چچا! میں کی انتہے مجھے کسی قتلہ کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر تم اپنی منہ پر اڑے رہے تو میرا خونریز وقوعہ اس

تھانے کے گرد و نواح میں بھی رونا ہوسکتا ہے۔“

چودھری اسحاق احمد نے تھانے میں بیٹھ کر میرے سامنے چودھری سحیح اللہ کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی۔

یہ سیدھی سیدھی میرے معاملات میں دخل اندازی کی۔ اس کے کہ میں اپنے اختیارات کا استعمال کر کے چودھری اسحاق کے دباؤ کے کیزے جھڑتا ہوں چودھری حفیظ اللہ نے پہلی بار اس تلخ وترش بلکہ فساد برپا ہونے کو جس حد لیتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔

”سحیح اللہ! بڑوں کے ساتھ زبان نہیں لڑاؤ۔ تمہارے چاچا چودھری یعقوب احمد بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عروج کی لاش پر انہی کا حق جتا ہے۔“ پھر وہ براہ راست اپنے سگھو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”چودھری صاحب! آپ دونوں بھائیوں نے اپنی جوان اولاد کو گھویا ہے۔ میں آپ لوگوں کے دکھ درد کو سمجھا رہا ہوں۔ عروج کی لاش کو اپنے ساتھ شیر گڑھ لے جائیں۔ ہمیں جب بھی عروج بیٹی کی یاد آئے گی، ہم شیر گڑھ جا کر اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کر لیا کریں گے۔ اسی بھانے آپ لوگوں سے بھی ملاقات ہو جائی کرے گی۔“

چودھری حفیظ اللہ نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک متوقع اور سر پر منڈلاتی ہوئی خوریز جنگ کو شروع ہونے سے پہلے ہی روک لیا تھا۔ اس دانش مندی اور بردباری پر میں اسے ستائش نظر سے دیکھنے لگا۔ علاوہ ازیں چودھری سحیح اللہ کی فرمانبرداری بھی لائق تحسین تھی۔ اس نے اپنے باپ کے فیصلے کے سامنے ایک لفظ نہیں کہا اور خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ اگرچہ اپنے اندر غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن اس نے کسی جھجکا ہٹ یا کھلی کاٹھیا نہیں کیا تھا۔

آئندہ ایک گھنٹے کے اندر دونوں پارٹیاں اپنے اپنے حصے کی لاشیں اٹھا کر تھانے سے رخصت ہوئیں تو میں نے اسے ایس آئی قادی علی کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر مجھے سلام کیا اور میرے اشارے پر کمری سنبھال لی۔

”قادی علی! وہ لوگ تو اپنے چناؤں کی لاشیں اٹھا کر چلے گئے ہیں لیکن ہمارا اصل کام تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا ہے۔“ میں نے شہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے فریڈ پور والے وقوعہ سے کچھ خاص ملا اور یہی تم نے شیر گڑھ والے وقوعہ کے حوالے سے کوئی خوشخبری سنائی ہے۔ متاثر ہیں تو اپنی اولادوں کو دفنانے کے بعد ان کی منقبات اور ان کی زندگی

کی آسانی کے لیے دعاؤں اور قرآن خوانی وغیرہ میں مصروف ہوا میں نے لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ رکے بیٹھ نہیں بیٹھے۔ ہمارے واقعات کے ذمے داروں کو گرفتار کر کے ان کے ساتھ لانا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ذرا آبی سزا دلانا ہے کریں؟ سیر دست ہمارے ہاتھ میں آج بھی نہیں ہے۔“

”میں آپ کی بات کو سمجھ سکتا ہوں ملک صاحب!“

”میں سمجھتا ہوں ہم بالکل بھی غالی ہاتھ نہیں ہیں۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

”دونوں وقوعہ جات سے ہمیں سو روپے والے کرنسی نوٹ کے جوڑے ملے ہیں، ہم ان کی مدد سے تیش کا آغاز کر سکتے ہیں۔“ وہ رسالت بھرے لہجے میں بولا۔

”وہ ایک غلطی کے سوا کچھ نہیں ہے قادی علی!“ میں نے کہا۔ ”کسی نے ہماری تقشیر کو غلط رخ پر ڈالنے کے لیے وہ پائل جلی ہے اور وہ کسی“ یقیناً ان واقعات کا ذمہ دار ہی ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاتھ لوڑ کوئل ہے میری کل کر بات ہو چکی ہے۔“

”کیا یہی کام کا جو جاتا ہے اور اس کے مطابق مذکورہ خطرناک قاتل کو پکڑ لیں؟ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اس کے انداز کی پہچان کرنے والا چار افراد کی بیہوشانہ اموات کا ذمہ دار گروہ بہت ہی شاطر اور عیار ہے۔ اس نے ہمیں ایک بندگی میں لاکھڑا کر دیا ہے لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنا ابھی باقی ہے۔ مجھے جینے ہے کہ اس کے اندر سے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور نکلے گا جو ہماری تقشیر کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔“

”ان شاء اللہ ملک صاحب!“ وہ پھر دونوں اعزاز میں بولا۔

پھر ہمارے درمیان انہی خوشگیاں واقعات اور چودھری برادری کے رویوں کے حوالے سے بات ہونے لگی۔ جب قادی علی کو چودھری حفیظ اللہ کے فیصلے کا علم ہوا تو اس نے کہا۔

”ملک صاحب! یہ بندہ بہت گہرا لگتا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کے مطالبے کی حمایت نہ کر کے شیر گڑھ کے پتھر میں کادل جیت لیا ہے ورنہ آپ نے نہ کر مگر مگر کی جو صورت حال بنائی ہے، اس میں خون خرابا کولاڑی تھا۔“

”میں اپنے سامنے تو انہیں کسی بھی قیمت پر اس مسئلے کا قانون شکنی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔“ میں نے طعن لہجے میں کہا۔ ”اگر چودھری یعقوب احمد اس کا برادر خود انہوں نے اولاد کے حوالے سے کتنا بڑا مصدر اٹھایا ہے۔ میں انہیں پڑ کر خیالات میں بند کر دیتا۔ بندگی بندگی دیکھی جاتی۔ ویسے یہ ماننا پڑے گا کہ چودھری سحیح اللہ نے انتہائی جائز اور حق کی بات کی تھی۔ عروج کی لاش اسے ملنا چاہی تھی۔ اس لاش کا حقیقی وارث وہی تھا۔“

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!“

اے ایس آئی تانیڈی اعزاز میں سر ملاتے ہوئے بولا۔

”لیکن شکر گڑھ والے چودھری برادران، متغولہ عروج کی لاش اس کے سر چودھری حفیظ اللہ کے ایما اور اجازت سے لے کر گئے ہیں۔ اگر وہ کوئی زورور بدعتی کرتے تو وہی آپ والی بات..... ہم بھی انہیں بتا دیتے کہ تھانے کی حالت کیا ہوتی ہے۔ ہم یہاں پر قانون نافذ کرنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے یا اس کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ کسی رو رعایت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں نے اسے ایس آئی کے خیالات اور عزائم پر مباد کیا اور ان واقعات کے دیگر پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

اسی سہ پہر جب میں عصر کی نماز سے فارغ ہوا تو سرکاری اسپتال سے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح تھی۔

شیر گڑھ والے وقوعہ کے مطابق، متغولہ سلیم احمد کی موت تیرہ فروری کی سہ پہر تین سے چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اسے کی تیز دھار لے کر مدد سے گلا کاٹ کر فٹے گلاٹ اٹارا گیا تھا۔ کھیل اگریٹری رپورٹ میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ اس دنیا سے رخصت ہونے وقت اس نے شراب کی بھاری مقدار اپنے معدے میں اتار رکھی تھی۔ گویا احمد کوئل کی متغول کے بارے میں رائے غلط نہیں تھی۔ مرحوم بہت ساری عادات بکا حال تھا۔

فریڈ پور والے وقوعہ سے ملنے والی تینوں لاشوں کے وقت موت میں بیشکل پانچ سے دس منٹ کی کمی بیشی تھی۔ مجموعی طور پر عروج، مشتاق اور اللہ اللہ تانے تیرہ فروری کی صبح دس سے بارہ بجے کے درمیان اس دنیا کو خیر باد کہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹس کے ساتھ ہی ان کے لیے بارش کی ٹیسٹ وغیرہ کے تجزیے بھی موجود تھے۔ مشتاق اور اللہ اللہ کی ٹیسٹ رپورٹس میں تو مجھے کچھ خاص نظر نہ آیا لیکن عروج کی

لیبارٹری رپورٹ دیکھ کر میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا درجہ میں بھول گئے، پھر اکر رہ گیا۔ مذکورہ رپورٹ میں میرے ہوش اڑانے والی صرف ایک لائن تھی۔

عروج تین ماہ کی حاملہ تھی۔

گزشتہ تین روز میں چودھری سچا اللہ سے میری کئی بار بات ہوئی تھی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی عروج کے بیٹ سے ہونے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کی شادی کو صرف چار ماہ ہوئے تھے اور لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق عروج بچے میں باپ سے ایک زندگی کو اپنے رحم میں لیے گھوم پھر رہی تھی۔ یہ اتنی بڑی خوشخبری تھی کہ اسے سب سے پہلے اس بچے کے باپ کو آگاہ کرنا چاہیے تھا۔

اگر عروج نے اپنے حاملہ ہونے کے بارے میں سچا اللہ کو بتا رکھا تھا اور سچا اللہ یا حفیظ اللہ نے مجھ سے ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا تو اس میں خرابی یا پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر وہ دونوں باپ بچا اپنی حویلی کے اگلے وارث کی آمد سے بے خبر تھے تو اس کا ایک ہی مطلب نکلتا تھا اور وہ یہ کہ عروج نے دانستہ اس خبر کو ان سے چھپایا تھا۔ اگر عروج نے دانستہ ایسا کیا تھا تو اس کی پراسرار دور دراز گوئی کی وجہ سے رسائی حاصل کرنا مجھ پر واجب ہو گیا تھا اور اس مقصد کے لیے میرا اپنی حویلی جانا ضروری تھا۔

چودھری حفیظ اللہ اور چودھری سچا اللہ تو وہ گئے ایک طرف، مجھے تو شیر گڑھ کے چودھریوں خصوصاً چودھری محبوب احمد کے روئے پر شدید حسرت ہو رہی تھی۔ جب بھی کوئی موت امید سے ہو جاتی ہے تو وہ یہ خوشخبری سب سے پہلے دو افراد کو سناتی ہے۔ نمبر ایک، اپنے شوہر اور اس کے بچے کے باپ کو۔ نمبر دو، اپنی ماں کو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ عروج کی ماں ممتاز بی بی کو اپنی بیٹی کے حاملہ ہونے کی خبر ہو اور اس نے اپنے کد خدا کو نہ بتایا ہو۔ کد بالو اور کد خدا تو ایک گاڑی کے دو پہیے اور ایک دوسرے کے راز دار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

مولہ فردری کی صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اے ایس آئی کا درجہ لیا اور ہم دونوں تھانے سے اپنی حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ آج سردی قدرے کم اور موسم کھلا ہوا خوشگوار محسوس ہوا تھا۔ قادری علی کو اپنے ہمراہ لے کر جانے کا میرا ایک خاص مقصد تھا۔ اسے مجھ سے اکثر شکایت رہتی تھی کہ میں اسے کالینجیو وغیرہ کے ساتھ تو مختلف قسم کی نگرانی کر رہا ہوں لیکن میں نے اسے اپنے

ساتھ نہیں رکھا۔ سو اس کا درجہ یہ شکوہ دور کرنے اور اس کی ولی خواہش کو پورا کرنے کی نیت سے میں نے اسے اسلحہ ساتھ اپنی حویلی لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”قادری علی!“ میں نے راستے میں اس سے پوچھا۔

”اب تو تم خوش ہونا؟“

”جی ملکہ صاحب!“ وہ دے دے دے جوش کے ساتھ بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے جناب کہ جو نیئر اہلکاروں کے ساتھ کام کر کے کچھ نیا سیکھنے کو نہیں ملتا اور اس تھانے میں مجھ سے ستر صرف آپ ہی ہیں۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں۔“

”ہاں، بالکل۔ میں سمجھ گیا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اب اس فلسفے کا دوسرا پہلو بھی دیکھو۔ قادری علی اہم اتنا تو جانتے ہی ہو کہ ہر چیز کے کم از کم دو رخ یا دو مذاہب لازمی ہوتے ہیں۔ میں نے کم از کم کی بات کی ہے اور زیادہ سے زیادہ کا احصاء کرنے کے لیے اس معاملے کی نوعیت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔“

”ملکہ صاحب! آپ کہہ تو بالکل ٹھیک رہے ہیں۔“ وہ ابھمن زدہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کی نوازش ہوئی اگر یہ وضاحت بھی کر دیں کہ ہماری حالیہ گفتگو سے اس معاملے کا کیا تعلق ہے؟“

”تم نے کہا کہ خود سے جو نیئر کے ساتھ کام کر کے کچھ نیا سیکھنے کو نہیں ملتا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے، سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تو سیکھنے کے عمل کا دوسرا پہلو ہے سیکھانے کا عمل اور یہ دونوں مل ایک دوسرے کے لیے واجب و موجب ہیں۔ اگر تمہاری یہ تمنا ہے کہ اپنے سینئر کے ساتھ کام کر کے تم اپنے علم اور تجربے میں اضافہ کرو تو تم سے جو نیئر کو بھی اپنے دل و دماغ میں یہ جاہت رکھنے کا حق ہے کہ وہ تم سے یعنی خود سے سینئر اہلکار کی معیت میں کام کر کے کچھ نیا اور کچھ بڑا سیکھ سکیں۔“ لگاتی تو قوت کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے رسالت بھرے لہجے میں کہا۔

”اگر پولیس ڈیپارٹمنٹ میں سے سیکھنے سکھانے کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر کالینجیل بھرتی ہونے والا ایک نوجوان اپنی زندگی کے بہترین چالیں، پینتالیس سال تک کھلے کو دینے کے بعد بھی کالینجیل ہی رہنا پڑے گا۔ اب تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ اس صورت حال میں کوئی کالینجیل اسے ایس آئی کا درجہ ملے یا نہ ملے۔“

”تھانہ انچارج ملکہ مقدر حیات“ کیسے بن سکتا تھا؟

”آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے ملکہ

”مہاراج! وہ نہایت بھرے لہجے میں بولا۔“ اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی لگلی کا احساس بھی ہو گیا ہے۔“

”لگلی کا احساس ہو جانا اس خطا کا اخلاقی اور روحانی کنارہ ہوتا ہے۔“ قادری علی“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تھانہ بات سن کر مجھے خوش ہوئی ہے۔“

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

ہم اپنی حویلی کے نزدیک پہنچے تو میں نے قادری علی سے کہا۔ ”میں ان چودھری باپ بیٹے سے ایک انتہائی حساس اور اہم موضوع پر چند سوالات کرنے آیا ہوں۔ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کے الگ الگ کروں گا اور دونوں سیشن میں تم میرے ساتھ موجود رہو گے۔ اپنی آنکھوں، کانوں اور دماغ کی کڑکیاں دو روزانے کے کھلے رکھ کر۔ میری اس تقیص سے مجھے بہت کچھ نیا اور نتیجہ آدریکھنے کو ملے گا۔“

”بہت شکریہ ملکہ صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کروں گا۔ ایسے مواقع روز بروز تو ہوتے جاتے ہیں جناب!“

ہم فریڈ پور میں داخل ہو کر اپنی حویلی کی جانب بڑھنے لگے تو چھوٹا چودھری سچا اللہ ایک گھوڑے پر سوار اپنی ہی لڑائی آنا نظر آیا۔ اس نے بھی مجھے تانگے میں بیٹھا دیکھ لیا تھا چاندوہ ہمارے تانگے کے نزدیک آ کر رک گیا۔

”اسلام علیکم بلکہ صاحب!“ اس نے گھوڑے پر بیٹھنے مجھے سلام کیا اور پوچھا۔ ”مجھے امید ہے آپ خیریت پا رہے ہوں گے۔ اپنی حویلی اب اور کوئی صدمہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہتی تھانہ ادر صاحب!“

”فکر والی کوئی بات نہیں چودھری صاحب!“ میں نے ٹپکی آمیز انداز میں کہا۔ ”بس، میں ادھر سے گزر رہا تھا تو ہو جا آپ لوگوں سے بھی سلام دعا کر لوں۔“ پھر میں نے زارا دیر کھانے کے بعد سوال کیا۔ ”ویسے آپ اس وقت کہاں بارہے ہیں چودھری صاحب؟“

”میں ساتھ والے پنڈ میں ایک چھوٹے سے کام کے لیے جا رہا ہوں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تمیں سے چار گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ آپ حویلی میں تشریف لگیں۔ میں واپس آ کر آپ سے بات کرتا ہوں۔“

”چودھری صاحب! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، میں ایک ضروری کام سے نہیں جا رہا ہوں۔“ میں نے الہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں اتنی دیر تک حویلی میں رک نہیں سکوں گا۔ آپ اگر مجھے صرف دس منٹ دے دیں تو میں آپ کی مرحوم بیوی عروج کے حوالے سے

ایک اہم بات کی تصدیق یا تردید کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کے چہرے پر ابھمن کے آثار نمودار ہوئے۔

ایک لمحے کی گلی مدت تک حذب ذہن رہنے کے بعد وہ جلدی سے بولا۔ ”جی، کیوں نہیں ضرور۔“

میں ان دونوں باپ بیٹے سے الگ الگ ”میٹنگ“ کرنے کا سوچ کر ادھر آیا تھا اسی لیے میں نے چودھری سچا اللہ سے یہ غلط کہا تھا کہ میں کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ تو ایک آئینیل بھوشن ہی کہ وہ مجھے حویلی کے باہر اکیلا ہی بل گیا تھا۔ میں نے اسے موقع تقیص دینے ہوتے معتدل انداز میں کہا۔

”تو پھر آ جاؤں ادھر تانگے میں۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ میں نے تانگے کے کوچاں کو اشارہ کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ادھر ادھر ہو جائے۔ اس اللہ کے بندے نے فوراً سے چتر میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں اس وقت تانگے کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ اے ایس آئی کا درجہ علی نشست پر موجود تھا۔ چودھری سچا اللہ نے پچھلی نشست کا رخ کیا تو میں نے اپنے پہلو والی خالی جگہ کو تھپتھپاتے ہوئے دستاؤں انداز میں کہا۔

”یہاں چودھری صاحب!۔۔۔۔۔!“

وہ میرے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ابھانے غصہ شات اور نظرات کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

”چودھری صاحب! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل میں گزشتہ روز مقتولین کی پوسٹ مارٹم رپورٹس میرے پاس آگئی تھیں۔ آپ کی بیوی کے لیے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ میں ایک اہم چیز کا انکشاف ہوا ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کو ایسی کون سی اہم شے مل گئی ہے تھانہ ادر صاحب؟“ وہ اضطرابی لہجے میں مستفسر ہوا۔

”عروج کی رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ۔۔۔۔۔ میں نے چودھری سچا اللہ کی زبان سے سچا گواہی کی غرض سے دانستہ مذکورہ رپورٹ کو ”ایڈٹ“ کرتے ہوئے بتایا۔ کہ وہ موت کے وقت امید سے تھی۔ کیا آپ اس بات سے واقف تھے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔

”عروج نے اس سانحے سے دو تین دن پہلے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

اس کے جواب نے میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی

www.panhlo.com

بہاری تاجم اس کے باوجود میں نے اپنی قلی اور اطمینان کے لیے تصدیق کو ضروری جانا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔
 ”دو تین دن پہلے باد تین ماہ پہلے؟“
 ”میں نے دو تین دن کہا ہے ملک صاحب!“ وہ ہنسنے لگا۔
 ”کیا کوئی گزربڑ ہے؟“ اس نے اظہارِ یقین کے ساتھ کہا۔

میں تو دل میں کچھ کالا ہونے کی توقع کر رہا تھا مگر چودھری سچا اللہ کا واضح جواب تو جتنے چکا کہ اس طرح حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ بدقسمتی سے یہاں تو پوری دال ہی کالی تھی۔
 ”کوئی گزربڑ نہیں ہے چودھری صاحب!“ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو میں رکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”کیونکہ آپ کی بیوی کے حاملہ ہونے والی بات مجھے اس رپورٹ سے پہلے معلوم نہیں تھی اس لیے میں نے یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کے لیے یہ صدمہ کتنا جاں ناک ہے۔ آپ کی صحت اور حوصلے کو سلام ہے کہ ایسے حالات میں بھی زندہ ہیں۔“

میں نے موقع عمل کی مناسبت سے جو بات بنادی تھی، وہ تیرے ہدف موثر ثابت ہوئی۔ کسی قسم کے شک میں جتنا ہونے بغیر وہ اذیت آمیز لہجے میں بولا۔

”تیرا حال تو مہرود ہی جانتا ہے ملک صاحب! میں کسی زندہ لاش کی طرح چل پھر رہا ہوں۔ شاید اسی کا نام زندگی ہے ملک صاحب!“

”اللہ آپ کو صبر اور برداشت عطا فرمائے چودھری صاحب!“ میں نے اپنے ”کام“ کو غیر محسوس انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے یقیناً بڑے چودھری صاحب کو بھی عروج والی خوشخبری کے بارے میں بتایا ہوگا اور اب عروج کی موت کے بعد تو وہ آپ سے بھی زیادہ آزرده اور دل شکست ہو چکے ہوں گے۔“

”جب میں نے اباجی کو یہ بتایا کہ میں باب بننے والا ہوں تو وہ دادا دینے کی خوشی میں اتنے زیادہ پرجوش ہو گئے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں انہیں اس سے پہلے ہی اس قدر سرور اور شادان نہیں دیکھا تھا۔ نا تو وہ کئی بار بین چکے ہیں مگر اپنی دل کے آگے بڑھنے کی سیرت اور خوشی کچھ الگ ہی ہوتی ہے لیکن عروج کی موت کے ساتھ ہی سب ختم ہو گیا ملک صاحب!“ وہ حد درجہ افسردہ ہو گیا۔

”میں آپ کے غم اور صدمے کی شدت کو محسوس کر سکتا ہوں چودھری صاحب!“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں

کہا پھر اپنے ”کام“ کے آخری حصے کو بھی انجام دے ڈالا۔
 ”آپ نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ مرحومہ عروج نے اپنی موت سے دو تین دن پہلے ہی آپ کو باپ بننے کی خوشخبری دی تھی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تیرے گڑھ والے چودھری برادران عروج کے امید سے ہونے کے بارے میں ہم کو بھی نہیں جانتے تھے؟“

”جی ہاں!“ وہ قہقہے لہجے میں بولا۔ ”اگر عروج تیرا تاریخ کو صبح سلامت شیر گڑھ پہنچ جاتی تو پھر یہ خبر وہاں بھی پہنچ جاتی مگر قدرت سے لڑنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے ملک صاحب! اولیے میرا ارادہ تھا کہ کم از کم ایک بار یعقوب احمد کو اس حوالے سے آگاہ کر دوں مگر اباجی نے مجھے منع کر دیا تھا اور آپ نے اس روز تمہارے میں ان دونوں بھائیوں کا رویہ تو دیکھ ہی لیا تھا۔ ان کے انداز میں انہوں نے کوئی بات بھی نہیں تھی۔ عروج کی موت کے ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے ایسا غیریت کا برتاؤ کیا جیسے عروج سے میرا کوئی رشتہ نام نہاں رہا ہی نہیں تھا۔“

بات کے اختتام پر اس کے لہجے میں کڑواہٹ محسوس آئی تھی۔ میں نے اپنا کام مکمل کر چکنے کے بعد ہنسنے لگا۔

”ہاں، میں نے ان دونوں بھائیوں کے ہنسنے، خند اور تا معنویت کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بہر کیف.....!“ میں سانس بھرا کر کہنے کی غرض سے تمہارے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”آپ نے بالکل ٹھیک کیا چودھری صاحب! ایسے بد لحاظ اور گھمنڈی لوگوں سے دور رہنا ہی دانشمندی ہے۔ آپ اب اپنے کام سے جا میں۔ میں بھی بڑے چودھری صاحب کو سلام کر کے آگے نکل جاؤں گا۔“

”کیا چار افراد کے قاتلوں کے بارے میں کچھ بتا چلا ملک صاحب؟“ اس نے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

”تفتیش جاری ہے چودھری صاحب!“ میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ”اس سلسلے میں مصروف عمل ہوں۔ وہ درندے جو کوئی بھی ہیں، میں انہیں گرفتار کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔“

اس نے پتہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور تانگے سے اتر کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی کوچوان واپس تانگے میں آگیا اور ہمارا رخ اپنی حویلی کی سمت ہو گیا۔

میں نے عروج کی پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی

دہائی کو چار بار پڑھا تھا اور وہ بھی نہایت ہی باہر یک بینی سے اور بے زور پورس کی صحت پر زور سامنے نہیں تھا۔ یہ کہہ کر پھر ایک ایک ایئر انٹری کی فیصلہ کن آراء سے ملایا۔ پورس کے مندرجات بھی اس امر کی تصدیق کرتے تھے کہ اپنی موت کے وقت عروج تین ماہ کے پیٹ سے تھک چودھری سچا اللہ ہے اس کی شادی چار ماہ قبل یعنی سے تھی۔ چوتھریں ہوئی تھی۔ اس مدت کو ذہن میں رکھ کر وہ سالانہ طبی معائنے تک رسائی حاصل کرنے کے حساب لگا میں تو حقیقتی طور پر غور کرتا تھا۔ سیدھی سی لے گی رات سانس کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ سیدھی سی بات ہے، عروج کے رحم میں کم ریزی کا مکمل پچھلے سال نومبر کی کسی تاریخ کو پورا ہو چکا تھا۔ اگر وہ چودھری سچا اللہ کا قاتل تو پھر عروج نے تین ماہ کے بعد اسے یہ خوشخبری کیوں دی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس تاخیری غلطی کی بجائے عروج کی کون سی چال یا مصلحت پوشیدہ تھی، اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہ اب زندہ نہیں تھی۔

اس راز سے صرف عروج ہی واقف تھی کہ اس کی کوکھ میں سانس لیتی زندگی کا مادہ چودھری سچا اللہ تھا یا پھر کوئی اور۔ چودھری سچا اللہ تو اسے ایک ہی بیوہ جان کر اس کی آہل کار رہا تھا جبکہ عروج کی رپورٹ اسے غلطی ثابت کرنے لگی ہوئی تھی۔

چودھری حفیظ اللہ کے ملازمین نے عزت و احترام کے ساتھ میں حویلی کی بیٹھک میں پہنچا دیا۔ چند ہی منٹ میں پھر وہ دھیمی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ صاحب سلامت کے بعد اس نے اپنے ایک ملازم کو پاس بلا کر کچھ ہدایات دے کر ارادہ کیا کہ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”چودھری صاحب! کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں صرف منٹ آپ کے پاس رک کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ بس آپ سے ایک ضروری بات کہنا تھی اس لیے یہاں آ گیا۔“

آج وہ تین دن پہلے والے حفیظ اللہ سے بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ تیرہ فروری کی سہ پہر جب جائے وقوعہ پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ سر تانیا غم و اندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا مگر اس وقت وہ ایک دم بے فکر اور ہشاش بھاش نظر آ رہا تھا۔ ”ملک صاحب! یہ کیا بات ہوئی؟“ اس نے ٹانگیں نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس روز بھی آپ کو کھانے سے بغیر یہاں سے چلے گئے تھے۔ آج میں جی بھر کر آپ کی خاطر داری کروں گا۔“

”چودھری صاحب! میں آپ کی خاطر داری کی خواہش کو بہت جلد پورا کر دوں گا۔“ میں نے بے غلظت الفاظ

میں کہا۔ ”لی الحال صرف ایک گلاس پانی سے کام چل جائے گا۔ ہم کانی ٹانٹ ہانٹ کر کے تھانے سے نکلے ہیں اور آج کام بھی بہت زیادہ ہیں لہذا اس پندرہ منٹ کے بعد مجھے ہر صورت جانا ہوگا۔ امید ہے آپ میری پیشہ ورانہ عیوبوں کا احساس کریں گے۔“

میں نے اپنا مقدمہ ساقی سنجیدگی اور دونوں اعزاز میں پیش کیا تھا کہ اس سے مزید کوئی ضد بحث نہیں کی۔ اس نے اپنے ملازم کو چائے، بیکٹ اور پانی لانے کا حکم دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”آج کس طرف چڑھائی کا ارادہ ہے ملک صاحب اور آپ مجھ سے اس کی کون سی اہم بات کرنے آئے ہیں؟“

”جیسا کہ میں نے بتایا، میرا آج کا دن بہت مصروف گزرنے والا ہے۔ میں نے گول مول جواب دیا۔ ”دیگر کاموں کے علاوہ ایک چکر چڑھنے والا کام بھی لگتا ہے۔ وہاں کے چودھری احمد کو از گوندل سے ملاقات ضروری ہے۔ وہ بندہ چودھری یعقوب احمد کا سیاسی حریف بھی ہے۔ لیکن ممکن ہے اس سے ملنا اس کیس کو حل کرنے میں معاون ثابت ہو۔ باقی جہاں تک آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو.....“ ڈرامائی انداز میں توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سچا اللہ سے ہونے والی حالیہ بات چیت کے برعکس ایک نئے اور مختلف انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”ان دونوں خوربڑ وارداتوں کے حوالے سے میرے ہاتھ ایک ثبوت لگا ہے۔ ہو سکتا ہے اس ثبوت کو دیکھ کر آپ کے ذہن میں کچھ آجائے اور آپ میری مدد کر سکیں۔“

اس نے چونک کر مجھ سے دیکھا اور بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔ ”ملک صاحب! آپ کے ہاتھ ایسا کیا لگا گیا ہے؟“ میں نے اپنی جیب میں سے سو روپے والے کرنسی نوٹ کے دونوں گلوں کو نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”ان میں سے ایک کلٹرا فریڈ پور والے جائے وقوعہ سے اور دوسرا کلٹرا شیر گڑھ والے موقع واردات سے ملا ہے۔“

”یہ تو سیدھا سیدھا کانا پوسی کا طریقہ واردات ہے ملک صاحب!“ نوٹ کے گلوں پر نگاہ پڑتے ہی وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔

”مگر میں نے سنا ہے پوسی کا نا تو برسوں پہلے مرکب چکا ہے۔“ میں نے چودھری حفیظ اللہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر یہ سب اس سے کیسے منسوب کر سکتے ہیں؟“

”بھولک ایسا سمجھتے ہیں کہ کئی سال پہلے کا ناپوسی مارا جا چکا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ وہ خانیوال کو چھوڑ کر شیخوپورہ آ گیا تھا اور اب تک شکر ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لیجے میں بولا۔ ”مگر خانیوال اور شیخوپورہ کی بحث کو ایک طرف رکھ دوں اور کا ناپوسی کے زندہ یا مردہ ہونے کا بھی ذکر نہ کریں تو اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسی کے اعزاز میں کوئی اور مجرم ذہن بندہ یہ کام کر رہا ہو یا پھر مجرموں کے کسی گروہ نے اس کے طریقہ کار کو اپنایا ہو۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

اس نے سوال کی گیند میری کورٹ میں پیچک دی تھی۔ سو میں نے ٹھہرے ہوئے لیجے میں کہا۔ ”آپ کی بات میں وزن ہے چودھری صاحب۔ دیکھتے ہیں، آگے چل کر اس مسئلے کے اندر سے کیا نکلتا ہے۔“

اس دوران میں چائے بکٹس وغیرہ آچکے تھے۔ میں چودھری کو ادھر ادھر گھمانے کے بعد مطلب کی بات پر آ گیا۔ وہ بات جس کو کہنے کے لیے میں نے یہ گراؤ بنایا تھا۔

”چودھری صاحب!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جھانک کر ہمدردی بھرے لیجے میں کہا۔ ”میں آپ کے رجوع و من میں برابر کا شریک ہوں اور مجھے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ عروج چودھری سچ اللہ کو کئی اولاد کا تحفہ نہیں دے سکتی تھی، خیر، اب تو وہ اس دنیا ہی سے رخصت ہو گئی ہے۔“

”یہ آپ نے کیسی بات کر دی ملک صاحب؟“ چوتھے بھیر اس نے کرینے والے انداز میں سوال کیا۔ ”آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ عروج پچھلے پیدائش کے قابل نہیں تھی؟“

”اس کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ سے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس کی کرینے میں بدل گئی۔

”کل مشولین کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ وغیرہ مجھے موصول ہو گئی ہیں چودھری صاحب!“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے بتایا۔ ”عروج کی رپورٹ کو دیکھ کر ہتا چلتا ہے کہ وہ بابتھی تھی“

میں نے چودھری حنیف اللہ سے دانستہ دروغ کوئی کی تھی تاکہ چودھری سچ اللہ کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق یا تردید ہو سکے۔ یہ سب اس لیے بھی ضروری تھا کہ عروج کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ چودھری سچ اللہ کے چند منٹ پہلے والے بیان سے لگتی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ عروج کا سرسری، نر، نال اور راگ میں جواب دیتا ہے۔

”ملک صاحب! آپ سیانے بیانے انسان کو اس نے میرے کام کو سہل کرتے ہوئے بڑے اصرار سے سنجیدگی سے کہا۔“ ”سو بے رب کے ہر کام میں کوئی دخل نہ ملتا۔“

مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر آگے چل کر عروج کا کاروبار ظاہر ہوتا تو مجھے مجبوراً سچ اللہ کی دوسری شادی پر ہونی کیونکہ اولاد تو ہر انسان کے لیے اتنی ہی ضروری ہے کہ آسکین۔“ لچائی توقف کر کے اس نے ایک سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔“

میں نے اور اسے اس آئی نے بیک زبان کہا۔ ”امین“

چودھری حنیف اللہ کے جواب سے دو باتیں سامنے آئی تھیں۔ نمبر ایک، چودھری سچ اللہ نے اپنے باپ عروج کے حاملہ ہونے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ چوتھے چودھری نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ نمبر دو، چودھری حنیف اللہ نے دانستہ عروج کے ”پرائیویڈ“ ہونے چھپانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے چودھری حنیف اللہ پر یہی ظاہر کیا جیسے میں اس کے بیان پر یقین کر چکا ہوں کہ وہ اپنی سچ کے حاملہ ہونے واقف نہیں تھا۔ میں اس کیل کو جس انداز میں آگے بڑھا رہا تھا ارادہ رکھتا تھا، اس کے بنیادی تقاضے کی رو سے بڑے چودھری کوئی اوقات خوش فہمی میں رکھنا بہت ضروری تھا۔

میں نے چودھری حنیف اللہ کو لوہا کی سلام کیا اور اسے اس آئی قادر علی کے ساتھ آتی حویلی سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

کوئی بھی انسان جب جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو اس کی دروغ گوئی کے پیچھے عموماً چار وجوہ میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ نمبر ایک، وہ کوئی بڑا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نمبر دو، وہ کسی بڑے نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔ نمبر تین، وہ کسی خطرناک مصیبت کو ٹالنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ نمبر چار، وہ کسی دوسرے کو مشکل میں ڈالنے کا تئسی ہوتا ہے۔

یہ بات روز روشن کے مانند میرے دماغ کی آنکھوں کے سامنے کھل چکی تھی کہ اس کیس کو سہل کرنے کے لیے مجھے تین افراد کے جھوٹوں کی حقیقت کو جاننا تھا۔ مذکورہ تین افراد میں سے ایک عروج تو زمین اوڑھ کر سو چکی تھی۔ اب اس سے کسی نوعیت کا رابطہ ممکن نہیں تھا۔ باقی بچے چودھری سچ اللہ اور اس کا باپ چودھری حنیف اللہ۔ اور ان دونوں کی زبانوں کے نقل معلوم کرنے کے لیے میں نے جو انوکھی چال

چلی تھی، وہ لہجہ ہی موثر ثابت ہوئی۔ اگلی صبح چودھری سچ اللہ اپنے باپ کے ساتھ تھانے پہنچ گیا تھا۔ میں اس کی توقع بھی کر رہا تھا لہذا میں نے ان کی درخواست کے حوالے سے اپنے والد اور خصوصاً ”ہدایات“ کے حوالے سے سلام کر کے میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چودھری کے چہرے پر پشیمانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے جبکہ بڑا چودھری ابھی انظر آتا تھا۔

”چودھری صاحب!“ میں نے سچ اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے کھیل کا ”ڈراپ سین“ شروع کر دیا۔ ”آپ ہمارے بچے ٹھیک نہیں لگ رہا۔ سب خیریت تو ہے نا؟“

”نہیں صاحب! سچ اللہ کو آپ سے چند شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔“ چودھری حنیف اللہ نے اپنے لب کشائی سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میرا تو تھانے آنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ میں یہی ضرورتی مجھے اپنے ساتھ لے آیا ہے۔“

”چودھری صاحب! پولیس ڈیپارٹمنٹ نے مجھے یہاں لوگوں کی فریادیں اور شکایتیں سننے کے لیے بھی بٹھا رکھا ہے۔“ میں نے بڑے چودھری کی بات کے جواب میں ہرگز انداز میں کہا پھر چوتھے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”بتائیں چودھری صاحب! آپ کو مجھ سے کیا شکوہ اور کیا شکایت ہے؟ میں آپ کی شکایت کرنے کا ذمہ دار ہوں۔“

”صرف دو باتیں میرا دماغ خراب کر رہی ہیں ملک صاحب!“ سچ اللہ نے جھجکا ہٹ بھرے لیجے میں کہا۔ ”آپ نے مجھ سے سو روپے والے کرنسی نوٹ کے دو کٹڑوں کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا اور اباجی کو پوری کہانی سنا ڈالی۔ یہ تو بے مہر کی کھلی شکایت۔ آپ اس کا جواب دیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا پھر میں دوسری بات بتاتا ہوں۔“

”کہانی تو وہی ہے جو تم نے اپنے اباجی سے سنی ہے۔“ میں نے مذکورہ کرنسی نوٹ کے دونوں کٹڑے اس کے سامنے رکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”آپ کے اباجی کا کہنا ہے کہ ان دونوں خونیوں وارادوں کے پیچھے پوسی کا نا باجی کی طرز پر کام کرنے والے کسی جرائم پیشہ گروہ کا ہاتھ ہے۔ مجھے بتاؤ، آپ اس بارے میں کیا سوچتے ہو؟“

”میں کا پوسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ بے لگسے بولا۔ ”اس لیے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہو گیا۔ اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں جانتا تھا کہ...“

ایک لاکھ کا موضوع پر آپ سے بات کرنے سے کچھ حاصل

نہیں ہوگا چنانچہ میں نے اس کا ذکر ضروری نہیں جانا۔ اب آپ مجھے دوسری شکایت کے بارے میں بتائی۔

”آپ نے عروج کی رپورٹ کے حوالے سے بھی ہم دونوں کو دو الگ کہانیاں سنائی ہیں۔“ وہ برا سادہ بتاتے ہوئے بولا۔ ”اباجی کو آپ نے بتایا ہے کہ عروج بابتھی تھی اور مجھ سے کہا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ یہ تضاد کیوں چناب؟“

”یاد کریں۔۔۔۔۔ یہ بات تو عروج نے اپنی موت سے دو تین دن پہلے آپ کو بتائی تھی کہ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لیجے میں کہا۔ ”میں نے تو عروج کی رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس رپورٹ کے مطابق وہ حاملہ تھی۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا کہ اس کے پیٹ میں آپ کا بچہ ہے۔“

”ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ گڑبڑائے ہوئے لیجے میں بولا۔ ”مگر الفاظ کے بے رحم پھیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر عروج امید سے تھی تو ظاہر ہے اس کی کوکھ میں میرا ہی بچہ تھا۔“

”الفاظ کے بے رحم پھیر سے جو فرق پڑتا ہے، اسے سن کر تمہارا دماغ پھٹ جائے گا چودھری جی!“ میں نے ”آپ جناب“ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کرخت لیجے میں کہا۔

”آپ کا مطلب کیا ہے؟“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا۔

”مطلب یہ کہ اگر عروج کے بدن میں تمہارا بچہ پروان چڑھ رہا ہوتا تو وہ اپنی موت سے تین ماہ پہلے تمہیں باپ بننے کی خوشخبری سن چکی ہوتی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹیں سے پتا چلتا ہے کہ موت کے وقت عروج تین ماہ کی حاملہ تھی۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر بڑے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”آپ نے تو اگر بڑے زمانے میں ملل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ انگلش بآسانی لکھ پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔“ بات کے اختتام پر میں نے مذکورہ رپورٹس اپنی میز کی دراز میں سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیں۔

چودھری حنیف اللہ نے بخور ان رپورٹس کا مطالعہ کیا پھر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے مکمل انداز میں بولا۔

”سچ اللہ ملک صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”آپ نے ہم دونوں باپ بیٹے سے جھوٹ کیوں

ہوا تھا ملک صاحب؟“ چھوٹے چودھری نے گونے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ”آپ نے مجھ سے تین ماہ کے محل والی بات چھپائی اور ابائی کو بتایا کہ عروج باجھمی.....“ آخر کیوں؟“

”حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اور تم دونوں کے درمیان سچ اگوانے کے لیے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس امر میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ دونوں میں سے کوئی ایک ان خونریز واقعات کے راز سے واقف ہے اور..... یہ بھی ممکن ہے آپ دونوں ہی اس معاملے کے راز دان ہوں لیکن اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ یہ عید اب سرایت نہیں رہا۔ آپ قانون سے قتادہ کرتے ہوئے مجھے سب کچھ سچ بتادیں گے تو ہم سب کے لیے آسانی ہو جائے گی۔“

”ملک صاحب!“ سچ اللہ نے غصہ لاری لہجے میں کہا۔ ”میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر آپ کو یقین دلانے کے لیے تیار ہوں کہ میں اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”تمہارے قسم کھانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا سچ اللہ!“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے اور وہ بھی ابھی کے ابھی۔“

”ملک صاحب! میں آپ سے تمہاری میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ چودھری حفیظ اللہ نے سمجھ انداز میں کہا پھر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سچ اللہ! تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جاؤ۔“

”سچ اللہ! صبح زود انداز میں اٹھا اور چپ چاپ میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔“

”ملک صاحب!“ چودھری حفیظ اللہ آگے کوچک کر سمجھ انداز میں گویا ہوا۔ ”ہم عزت دار اور غیر متزلزل لوگ ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ پرایا خون اپنی حویلی کا اٹکا دارت قرار پائے لہذا مجھے جو خدشہ لگا، وہ میں نے کیا..... بلکہ میں نے کروایا۔ اس معاملے میں سچ اللہ کا کچھ لیا دینا نہیں ہے اسی لیے میں نے اس کے سامنے بات نہیں کی۔ آپ کچھ دار افشان ہیں۔ اس بکھیرے کو ہم دونوں مل کر سمیٹ سکتے ہیں۔ میں آپ کی ہر شرط اور ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہوں۔ بس آپ حکم کریں۔“

میں ایک گہری اور آسودہ سانس لے کر رہ گیا۔ ڈھکے جیسے نہیں بلکہ واضح الفاظ میں بڑے چودھری نے چار افراد کو قتل کروانے کا اقبال کر لیا تھا مگر میرے لیے کچھ اور جاننا بھی ضروری تھا۔

”چودھری صاحب! میں کن شرائط اور کن کن قواعد و ضوابط پر اس بکھیرے کو سنبھالنا چاہوں گا، اس کا فیصلہ میں ہوگا۔“ میں نے دو لوگ انداز میں کہا۔ ”پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو عروج کی اس سنگین غلطی کا کب پتا چلا تھا؟“

”لگ بھگ دو ماہ پہلے۔“ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

”چودھرا! ذرا دیر پر جس کے انتقال پر دوسرے لوگوں کے علاوہ شہر گڑھ والے دونوں چودھری بھائی اور ان کے بچے بھی یہاں آئے ہوئے تھے اور میں نے اتفاقاً عروج اور چودھری اسحاق کے بیٹے سلیم کو تنہائی میں باجھمی کرتے سن لیا تھا۔ سلیم کسی بات کے لیے عروج سے خفا نہ تھا اور جواب میں عروج نے جو کہا، ان الفاظ نے میرا دماغ کو مجازاً ڈالا تھا۔ وہ منت ریز لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا..... ”خدا کے لیے میرا اچھا چھوڑ دو سلیم! اب میں تمہارے لیے پرانی ہو چکی ہوں۔ تم میری جی بھائی زندگی کو برباد کرنے کی کوشش مت کرو۔ یہی کیا کم ہے کہ تمہاری محبت کی یادگار میرے پیٹ میں پل رہی ہے۔“

اتنا کہہ کر چودھری خاموش ہو گیا۔ اس کے کہنے کو بھی باقی نہیں بچا تھا۔ عروج کی لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹ اس کے اقبال جرم کی تصدیق کرتی تھی۔

”چودھری صاحب! آپ کو میری خاطر داری کرنے کی بڑی تمنائی تھی مگر افسوس کہ قدرت نے آپ کو اس کا مزہ نہیں دیا۔ ہاں، البتہ یہ سنہری موقع خوش قسمتی سے میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس بات کا یقین کر لیں کہ میں آپ کی ہر کہہ ”ایسی“ خاطر داری“ کروں گا جو آپ بدلتوں یا در نہیں گے۔“

بات کے اختتام پر میں نے بڑا آواز بلند اپنے حوالدار کو پکارا۔ ”نبی بخش! میں نے تمہیں جو خصوصی ہدایات دی تھیں، ان پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے۔ فوراً یہاں آ جاؤ۔“

میرے خطرناک تیور دیکھ کر چودھری حفیظ اللہ کی آنکھوں میں خوف کی چمچائیاں اُٹھنے لگیں۔ اس نے لاجبات بھرے انداز میں کہا۔ ”ملک صاحب! کوئی توراہت ہوگا؟“

”توراہت تو ہر حال میں ہوتا ہے چودھری صاحب!“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مگر اس وقت آپ کے سامنے جو واحد راستہ ہے، وہ میرے تھانے کی حوالات سے عدالت اور عدالت سے سیدھا جیل کی طرف جانا ہے۔ اس کے بعد آپ کی قسمت۔“

دو دھشت اور دو دھشت بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے جو راستہ بتایا تھا، وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

(تحریر: شام بٹ)

ایلی کے شہر کہیں اس انسانوں کی ایک بڑی منڈی لگتی تھی جہاں انسانی غلام خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ آج اس منڈی میں اسپارک بھی موجود تھا جسے کل رات ہی بحری ترقاٹ اٹھا کر یہاں پہنچنے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ پریشان حال اسپارک نے بہت مشکل سے اپنی گردن اٹھائی کیونکہ اس کا مضبوط کسرتی جسم بہت مشکل سے جکڑا ہوا تھا۔ اسپارک نے دیکھا دور دور تک زنجیروں سے جکڑا ہوا سندر سا نظر آ رہا تھا۔ ہر رنگ و نسل کا انسان جو جانتے کہاں کہاں سے پکڑ کر اس منڈی میں بیچنے کے لیے لایا گیا تھا۔ اس کی تلاش کا وہاں سبک رہی تھیں جنہیں اسپارک نے تلاش کیا تھا۔ اسپارک کی بیوی پامیلا بھی اس بحری جہاز میں ستر کر رہی تھی جس پر کل رات بحری ترقاٹوں نے حملہ کر کے تمام مسافروں کو زخمی بنالیا تھا پھر انہیں زنجیروں میں جکڑ کر اس انسانی منڈی میں بیچنے کے لیے لایا گیا تھا۔

”یہ تو بہت جاندار اور طاقت ور دکھائی دے رہا ہے۔“ اپنے قریب سے ابھرتی آواز سن کر اسپارک چونک گیا۔ کوئی ایسی مرد بہت اشتیاق سے اس کے زنجیروں میں بندھے جسم کو لپٹے ہاتھوں سے ٹھول کر چیک کر رہا تھا جو اسے بے حد باک و افسوس ہوا لیکن افسوس وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر عام حالات میں اسپارک اس وقت اپنے علاقے ٹریس میں موجود ہوتا تو کسی شخص میں اتنی جرأت نہ تھی جس کے جسم کو ایک انگلی سے بھی چھو کر دیکھنے کی ہمت کرتا۔ ٹریس کے لوگ اسپارک کی طاقت سے خوف زدہ رہتے تھے۔ وہ اپنے علاقے کا ایک نامور اور چمکے شخص تھا۔ اس کی بیوی پامیلا کو ٹریس میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ ٹریس کے لوگ پامیلا کو بتا دو جانی پیشوا ماننے لگے تھے۔ اس کے پاس ہر وقت دھاکے لیے آنے والوں کا نامہ بندہ جارہا تھا۔ لوگوں کا ماننا تھا پامیلا کی دعا میں بہت

زندگی کے انتظار میں موت کی سولی پر لٹے لوگوں کا حیرت انگیز قدم

سونے کے پنجرے میں رہنے سے انسان خود کو خوش قسمت نہیں سمجھ سکتا کیونکہ قید تو بہر حال قید ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا بھی یہی حال تھا جو ایک آن دیکھے حصار میں قید تھے اور..... ان کے خون سے ہولی کھیلنے والے شاید بھول گئے تھے کہ ایک دن موت کو بھی موت ہے

آزادی

نفسہ سعید



تاثير ہے۔ وہ مختلف بیماریوں کا علاج اپنے دم سے کرتی تھی۔ اکثر گھروں سے آسپ لگانے کے لیے بھی پامیلا کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ یہی وجہ تھی جو فرانس کے لوگ پامیلا سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان دونوں میاں بیوی کا شیر نشی کی معزز ترین شخصیات میں ہوتا تھا۔ دونوں پہلے پامیلا کو اپنے کسی درجانی کام سے روک جانا تھا جس کی وجہ سے وہ دونوں اپنا سفر بھری جہاز کے ذریعے طے کر رہے تھے جب اچانک اس جہاز پر قزاقوں نے حملہ کر کے اندر موجود تمام افراد کو گرفتار لے لیا۔ اب اسپارک نہ جانتا تھا کہ پامیلا کہاں تھی؟ اس کا سواٹے پا گیا تھا۔ دم کی لین دین کے بعد اسے مالک کے حوالے کر دیا گیا۔ اس وقت جب اسے بڑے سے ٹرک میں بٹھایا جا رہا تھا تب اس نے پامیلا کو دیکھا جو اس ٹرک میں پہلے سے سوار تھی جس میں غلام بھرے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک کا چہرہ خوف زدہ تھا سوائے پامیلا کے جس کے چہرے پر کدہ لفظ غرور و اطمینان اور پرکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالکل بھی خوف زدہ نہ تھی۔ ٹرک کے تمام مسافروں کے درمیان وہ جدا دکھائی دے رہی تھی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

☆☆☆

اگر بنا کا میدان بج تھا جہاں شوخین افراد کا جم غفیر کھیل کے شروع ہونے کا شہر تھا۔ سامنے ہی بڑا سا آج سجا ہوا تھا جس کی کرسیوں پر کچھ اسکے محزون بیٹھے تھے جن کے پیچھے ان کے غلام ہاتھ باندھے کھڑے اپنے اپنے ماسٹر کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ آج کے نچے چلو گھر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ انہیں مزادینے کے لیے یہاں لایا گیا تھا یہ لوگ یا تو چھوٹے موٹے چور تھے جو کسی بھی واردات کے دوران پکڑے گئے یا وہ غلام تھے جو اپنے ماسٹر کو ہموکا دے کر فرار ہونے کی کوشش میں گرفتار ہوئے۔ اب کچھ کے قانون کے مطابق انہیں سزا دینے کے لیے لے کر لایا گیا تھا۔ جہاں ہر مجرم کا مقابلہ ایک غلام سے تھا جس کی ہار جیت کا فیصلہ کسی ایک کی موت پر ختم ہوتا تھا۔ یہ غلام کھیل کھانے کے لوگوں کا پسندیدہ ترین تھا جس کا انتظار شدت سے کیا جاتا۔ لوگ ٹکٹ خرید کر یہ غلام دیکھنے آتے۔ جتنا یہ کھیل کھانے کے لوگوں کو پسند تھا، اتنا ہی اسپارک کے لیے قانون غرور تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں کسی کی یوں جان لینا بھی اچھا نہ لگا تھا لیکن وہ مجبور تھا، اس کا ماسٹر اس کھیل کا شیرازہ تھا جس میں وہ لاکھوں روپیہ کما تا جس کی خاطر وہ کسری بدن رکھنے والے غلام خریدنے میں اپنا پیسہ پانی کی طرح بہاتا۔ کھیل شروع ہو گیا تھا۔ میدان تھوڑے کی آواز سے گونج اٹھا۔ اسپارک کے مقابلے میں ایک سو کی سڑی کالی سی لڑکی تھی جو پچھلے ماہ اپنے ماسٹر

کے قلم و ستم سے بچنے کی خاطر اس کے گھر سے فرار ہوئے کی کوشش میں پکڑ لی گئی تھی اور قسمت نے اسے موت کے اس کھیل کا حصہ بنا دیا۔ پہلی نظر میں وہ اسپارک کو بہت آسان ہدف محسوس ہوئی لیکن کھیل شروع ہوتے ہی اسے اپنے خیال کی خود کوئی کرنا پڑی۔ لڑکی کا کھیل دیکھ کر وہ جلد ہی اس بات کا قائل ہو گیا کہ بچنے کی خواہش ایک معمولی شے کو بھی طاقت بخش دیتا ہے۔ غلام لڑکی اس کا بھرپور مقابلہ کر رہی تھی، اسپارک کے کس میں ہوتا تو اسے زندگی بخش دیتا لیکن جانتا تھا اس صورت میں موت اسپارک کا مقدر بن جاتی اور ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ موت اور زندگی کا یہ کھیل اپنے عروج پر تھا۔ سارا میدان دیکھنے والوں کے چرچوں نعروں سے گونج اٹھا جو دونوں فریقین کے لیے ٹانگ کا کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کا کھیل دیکھ کر بیٹریا ٹانگ کا جوش بھی بڑھتا جا رہا تھا، وہ ہر حال میں اسپارک کو زخمی دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے کھیل کے ذریعے مزید پیسہ کما سکے پھر ایک دم میدان میں ہونے والا شو تھم گیا جس کا مطلب تھا کوئی ایک کھلاڑی یہ جنگ ہار چکا ہے جو یقیناً اسپارک نہ تھا۔

☆☆☆

اسپارک دیگر مرد غلاموں کے ہمراہ ڈیرے پر رہتا تھا جو اس کے ماسٹر پیٹر ٹانگ کے گھر کے ساتھ ہی واقع تھا جس کا ایک دروازہ اندر کی جانب کھلتا تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ لوہے کے مضبوط دروازے کی دوسری جانب ایک بڑا سا تالا ہر وقت لگا رہتا تھا کہ ڈیرے سے کوئی غلام چوٹی میں داخل نہ ہو سکے۔ تمام غلام عورتیں ماسٹر کے گھر میں رہتی تھیں جس کا بڑا سبب یہی تھا کہ گیت بھی ہر وقت بند رہتا۔ یہی وجہ تھی جو اسپارک اب تک پامیلا سے نہ مل پاتا تھا۔ وہ اس سے مل کر یہاں سے فرار کا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتا تھا جو ابھی تک ممکن نہ ہوا تھا کہ وہ خونی حادثہ ہو گیا جس کے شش اسپارک کے دل پر دائمی اثرات چھوڑ گئے۔ وہ ایک طوفانی رات تھی ڈیرے پر موجود چند غلام ماسٹر کی چوٹی کی چھت پر صفائی کا کام کر رہے تھے جن میں اسپارک بھی شامل تھا جب اچانک ہی چوٹی میں ایک غیر ماسٹر شورش مانی دیا جو آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ اب ان کا فرض تھا نیچے جا کر دیکھیں شاید ماسٹر کی فیملی کسی مشکل کا شکار نہ ہو۔ یہی سوچ کر اسپارک نے اپنے قریب رہی لکڑی کی کھوار اٹھائی۔ ان کا اصل اسلحہ چوٹی کے اندر ماسٹر کے قبضے میں ہوتا تھا جو انہیں یہ وقت ضرورت فراہم کیا جاتا تو وہ اپنی پریکٹس لکڑی کی کھواروں سے کرتے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا جب اسپارک وہ غلام لڑکوں کے ہمراہ چوٹی کے بڑے سے ہال میں داخل ہوا۔ سامنے ہی پامیلا موجود تھی جس کا

پہلا بے کشتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسپارک نے دیکھا اس کے سامنے فرش پر ایک غلام لڑکی خون میں لٹ پڑی ہے جس کے قریب ماسٹر کا سترہ سالہ بیٹا سا چڑے کا ہنٹر لیے کھڑا تھا جس پر لڑکی کے بدن کا خون دور سے چمک رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اسپارک خوف زدہ ہو گیا، ایک ہی سیکنڈ میں وہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اس وقت پامیلا اس لڑکی پر ہونے والے ظلم کو روکنے کے لیے باہر لڑکی تھی جو اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ پامیلا کو روکنا چاہتا تھا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ پامیلا نے ماسٹر کے بیٹے راڈرک کے ہاتھ سے ہنٹر جین لینا چاہا۔ وہ غصے میں چلا رہی تھی اور احتجاج کر رہی تھی، اس ظلم کے خلاف جو اس غلام لڑکی پر کیا گیا۔ اس کا یہ رد عمل بغاوت کے زمرے میں آتا تھا۔ چوٹی کے قانون کے مطابق پامیلا باغی ہو چکی تھی جس کی سزا صرف موت تھی۔ اسپارک اسے روکنا چاہتا تھا جب چشم زدن میں وہ واقعہ دہرا ہو گیا۔ ماسٹر کا خاص غلام کھڑن ایک بڑا سا ڈنڈا لیے ہال میں نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر اسپارک خوف زدہ ہو گیا جب اسے بازو سے پکڑ کر بیرونی دروازے کی جانب دھکیل دیا گیا۔ اسپارک نے پلٹ کر دیکھا کھڑن ڈنڈا لے کر پامیلا کے سر پر جا پہنچا تھا اور ایک ہی سیکنڈ میں بنا سوچے سمجھے اس نے پامیلا کے سر پر ڈنڈا مار دیا۔ وہ لہر لہ کر نیچے گر کر اس وقت تک اسپارک کو دیکھنے دے کر باہر نکال دیا گیا تھا، اس بے باک رات وہ پامیلا کی کوئی مدد نہ کر سکا تھا۔ اس ناز کی رات کے ہر لمحے میں اسپارک نے صرف ایک بات سوچی کہ اس کی کھوار اصلی ہوئی۔ وہ ایک ایسی کالی اور اندھیری رات تھی جس کی تباہی اسپارک کی زندگی میں کبھی نہ آئی۔

☆☆☆

ماسٹر کے بڑے بیٹے کی شادی قریب آ رہی تھی جس کے لیے چوٹی میں تین تین وائریش کا کام جاری تھا۔ ڈیرے کا ہر غلام چوٹی میں اپنا کام سر انجام دے رہا تھا۔ اسپارک کو چوٹی کا بیرونی حصہ رنگ کرنے کے لیے دیا گیا تھا جب اس نے رنگ کرتے ہوئے اپنے دل میں حساب لگا، آٹھ ماہ، چھ مہینے دن اور دس گھنٹے ہو گئے تھے اسے پامیلا سے بچھڑے ہوئے۔ وہ اس لمحے اور گھڑی کا انتقام لینا چاہتا تھا جو اس نے پامیلا کے بغیر گزاری۔ اپنے اس انتقام کے لیے اسپارک کو غلاموں پر مشتمل ایک نیم درکار تھی جسے تشکیل دینے کے منصوبے پر اس نے کام شروع کر دیا تھا وہ جب بھی ماسٹر اور اس کے بیٹے راڈرک کو دیکھتا اس کا رخ ہرا ہوا جاتا۔ اس کے دل میں موجود انتقام کی آگ تیز ہو جاتی تھی جیسے فنی نے مزید ہوا دی، جو چوٹی میں موجود ایک غلام لڑکی تھی جسے اس وقت روم سے اٹھا کر کھیا

کی منڈی میں پہنچایا گیا جب وہ اپنے غلامان کے ساتھ تفریح کے لیے روم آئی تھی۔ اس سے ایک بڑا سا لڑکی لڑکی چمکن کر اسے غلام بنا دیا گیا، اس کے بال بپ اور دونوں بھولوں کا پیار بھی چھین گیا اور اسے اس بلند و بالا دیوار والی چوٹی کے اندر قید کر دیا گیا جہاں وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لے سکتی تھی۔ وہ آزادی چاہتی تھی جس کی کوئی بھی بھاری قیمت ادا کرنے کو تیار تھی، یہی وجہ تھی فنی نے ڈیرے پر موجود ایک غلام لڑکے کو کس سے فنی جھڑکھا تھا جو اسپارک کی نظر میں آ گیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ فنی، ماسٹر کے علاوہ ماسٹر کے بھی شدید نفرت کرتی ہے اس لیے اسے فنی چوٹی کے اندر اپنی بہترین ہڈی مار دی۔ اسپارک جانتا تھا یہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں اگر ان میں سے کوئی ایک بھی پکڑا جاتا تو اس کی قسمت میں سوائے موت کے کچھ نہ تھا۔ یہاں کے قانون کے مطابق فرار ہونے والا غلام اگر رات میں موت کا مقابلہ جیت بھی لیتا تو بھی اپنے ماسٹر کے ہاتھوں مارا جاتا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی اذیت ناک موت نہ چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسپارک کا مقصد محض فرار نہ تھا وہ پامیلا کے خون کا ایسا بدلہ لینا چاہتا تھا جو صدیوں تک یاد رکھا جائے۔ اپنے انتقام کے ذریعے وہ اگلی دنیا میں پامیلا کو سکون دینا چاہتا تھا اور یہ سب کرنے کے لیے فرار ہونے سے قبل ان سب کایک بار چوٹی میں داخل ہونا تھا جو صرف فنی کی مدد سے ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ماسٹر کی ملازمت خاص شریک کی پسندیدہ تھی اور شریک جانتی تھی چوٹی کے داخلی راستے کی چابیاں کہاں رکھی ہیں۔

☆☆☆

آج صبح ہی تیز آنڈی آئی تھی جس کے ساتھ گرد و غبار کا طوفان چوٹی اور ڈیرے میں داخل ہو کر ایک تباہی چاٹتا گزرا گیا تھا جس کے بعد چاروں طرف ریت ہی ریت دکھائی دے رہی تھی جس کی صفائی کا کام جاری تھا۔ کچھ لڑکے چوٹی کے باہر کا بڑا سا میدان صاف کر رہے تھے جبکہ کچھ اسپارک جیسے جنگجو اس وقت ڈیرے کے میدان میں اپنی کھوار بازی کی مشق میں مصروف تھے۔ جب اسپارک نے اپنی کھوار ہاتھ سے رکھ کر پریکٹس کرتے غلاموں پر ایک نظر ڈالی تو اس وقت میں سے قریب تھے جن میں سے دس ایسے تھے جو یہاں سے نکلنے کے لیے اسپارک کی ہر بات ماننے کو تیار تھے۔ باقی دس اس نے ابھی بات ہی نہ کی تھی۔ اسے انتظار تھا آج رات کا جب تمام غلام واپس آئیں تو ڈیرے پر ایک بینگ رکھی جائے جس میں سب لوگ شریک ہوں۔ وہ یہاں سے فرار کے لیے ہر غلام کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا تھا تاکہ پیچھے رہ جانے والے ماسٹر کے عتاب کا شکار نہ ہوں۔ اسے

www.panhlo.com

ماسٹر اور اس کے گاؤں سے مقابلے کے لیے غلاموں کی پوری فوج
چاہے تھی جس کا لاکھوں مل دو مرتب کر چکا تھا مگر اصل مسئلہ اب بھی
وہی تھا۔ حویلی کے اندر داخل ہونے کے لیے درمیانی دروازہ کھلا
ہو یا نہ ہو پوری توجہ تھی ابھی تک اس دروازے کی چابی حاصل نہ
کر سکی تھی۔ حویلی کے مین گیٹ سے اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔
وہاں سیکورٹی کے سخت ترین انتظامات تھے۔ داخلی گیٹ
پر کتوں اوروں سے لیس جنگجو غلاموں کی پوری فوج ہر وقت موجود رہتی۔
ایسے میں حویلی کے اندر داخل ہونے کا واحد راستہ حویلی کا درمیانی
دروازہ تھا جو پورے کی جانب کھلتا تھا اور جسے اندر سے صرف یعنی
کھول سکتی تھی۔ اسپارک، قیمتی کی طرف سے گرین سگنل کا منتظر تھا
جس کے بعد وہ سب اس حویلی میں داخل ہو جاتے۔ وہ حساب لگا
چکا تھا اس کے ساتھ حویلی میں داخل ہونے والے غلاموں کی تعداد
پچاس سے زائد تھی۔ قیمتی نے بھی کچھ خواتین غلاموں کو اپنے ساتھ
لا لیا تھا۔ وہ بھی جانتی تھی کہ لوہے کی اصلی اور تیز و تیز کواریں کس
کمرے میں تھیں۔ وہ وہاں تک رسائی کا راستہ بھی معلوم کر چکی
تھی۔ اسے صرف اور صرف انتظار تھا اس مناسب وقت کا جب قیمتی
کے دیے گئے سگنل کے بعد وہ اپنی کارروائی کا آغاز کر سکتے۔

☆☆☆

آدمی رات کا وقت تھا جب اسپارک کے حساس کانوں
نے ایک نسوانی چیخ کی آواز سنی۔ وقفے وقفے سے سنائی دینے
والی چیخ کی آواز حویلی کے درمیانی دروازے سے اس طرف
آ رہی تھی جس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا
حویلی میں آج پھر راکٹر کے زیرِ عتاب کوئی ملازمہ آگئی تھی
کیونکہ راکٹر ہمیشہ آدمی رات کو شراب کے نشے میں دھت
ہو کر خواتین ملازمہ ان پر تشدد کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ یہ آواز سن
کر اسپارک اٹھ بیٹھا، اس کے ساتھ ہی وہاں موجود دیگر غلام بھی
جاگ گئے۔ رات کے اس لمحے ان نسوانی چیخوں کی آواز نے
اس کے ذہن میں پامپا کی یاد کو ایک بار پھر تازہ کر دیا۔ وہ بے
چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل کر حویلی کی بلند بالا دیواروں
پر ایک نظر ڈالی۔ کوئی ایسا طریقہ نہ تھا جو ان دیواروں کے
ذریعے وہ حویلی کے دوسری جانب کود جاتا۔ وہ مایوس ہو کر
پھر اس کمرے میں داخل ہوا جہاں موجود درمیانی دروازہ اس کی
واحد امید تھا جس کے ذریعے وہ حویلی میں داخل ہو کر وہاں
ہونے والے ظلم کو روک سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مزید دس غلام
بھی اس کمرے میں موجود تھے۔ دوسری طرف سے سنائی
دینے والی چیخیں تھم گئی تھیں، شاید ایک اور غلام ملازمہ ان
غلاموں کے ہاتھوں اپنی زندگی کی بازی ہار گئی تھی اور یہ سب
اس کے لیے بھی کچھ نہ کر سکے تھے۔ مایوس ہو کر اسپارک

دروازے کے مندرجہ قریب ہوا جب اس کے کانوں نے بھی کسی
کوئی آواز سنی۔ کسی نے دروازے پر ہلکے تالے میں جالی
کھائی تھی۔ اسپارک دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اپنی
جگہ پر رک گیا۔ اگلے دو سیکنڈ میں دروازے کی دھج کر اسے
جانے کی آواز واضح طور پر سنائی دی اور قیمتی نے دروازہ کھول کر
ذرا سی گردن باہر نکال کر اس کی جانب دیکھا۔ یہ گرین سگنل
تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے واپس لوٹ گئی تھی۔ اسپارک کے لیے
انتہائی کافی تھا۔ اپنے ساتھ موجود غلاموں کو اسے گروہ حویلی میں
داخل ہو گیا اور درمیانی دروازہ کھلا چھوڑ دیا تاکہ مزید غلام بھی
اس کے پیچھے حویلی میں آجائیں۔ وہ سب قیمتی کی قیادت میں
اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں اسلحہ رکھا تھا۔ پوری حویلی رات
کے ستائے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ملازمہ کی خون میں لت پت
لاش لاؤنج میں پڑی دور سے دکھائی دے رہی تھی جسے دن تلخ
ہی اٹھا کر قریبی جنگل میں پھینک دیا جاتا جہاں وہ جنگلی
جانوروں کی خود راک بن جاتی۔ اسپارک کو یہ سوچ کر بھر پھر
سی آگئی۔ پامپا جیسی روحانی پیشوا کی لاش بھی یوں ہی جنگلی
جانوروں کی نذر کر دی گئی تھی۔ اسے اپنی مذہبی رسومات بھی
نصیب نہ ہوئی تھیں، اس کی لاش لاوارث کچھ کر پھینک دی گئی۔

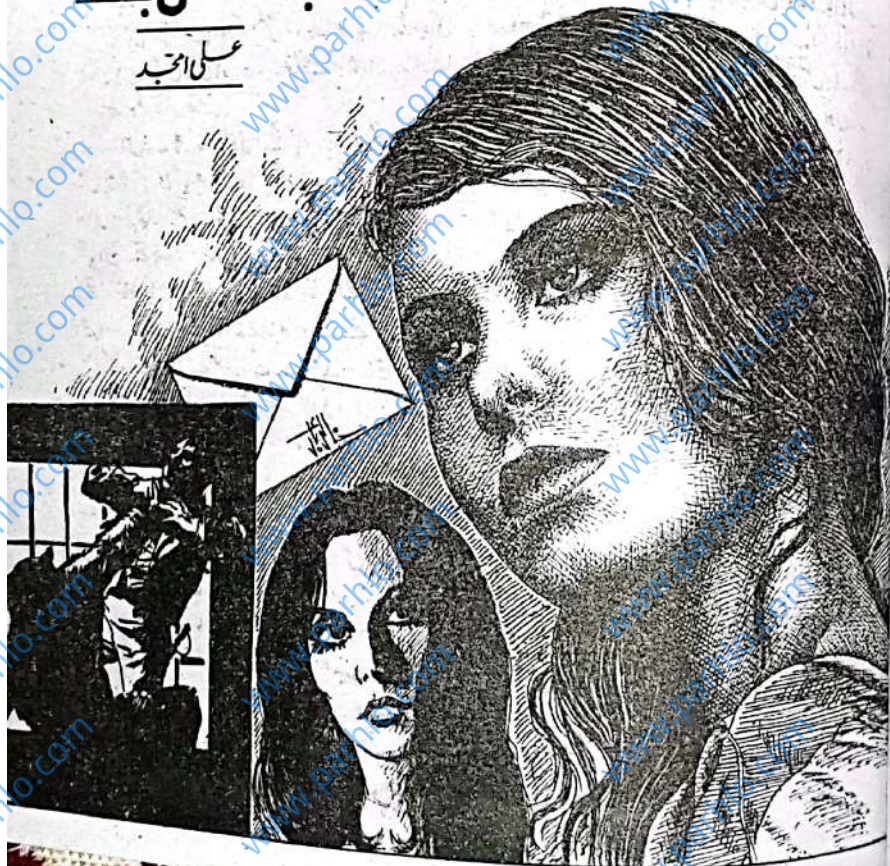
اس احساس کے ساتھ ہی اسپارک کے سارے بدن میں غصے کی
لہر ابھری، وہ اپنے ہاتھ میں تیز دھار والی کھوار لیے پیڑ یا ناک
کے کمرے میں داخل ہو گیا جو اس کا پہلا مجرم تھا، جس کی قوت
خرید کے سبب وہ دونوں میاں بیوی اس بلند و بالا حویلی میں
موجود تھے اور یہ رات بھی جب حویلی میں ماسٹر اور اس کا کوئی
رشتے دار باقی نہ بچا سوائے ان غلاموں کے جو حویلی میں
دناتے پھر رہے تھے جنہیں خریدنے کے لیے پیڑ یا ناک
لاکھوں روپیہ صرف کرتا تھا۔ آج وہی اس کی موت بن گئے
اور اس کے خاندان کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔ سچ ہے نفرت انتقام
کی سیڑھی پر رکھا جانے والا پہلا قدم ہے۔ دن کا سورج نکلنے
سے پہلے حویلی غلاموں سے خالی ہو گئی۔ جب علاقے کا چیف
اس حویلی میں پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ غلاموں نے
پیڑ یا ناک اور اس کے خاندان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی موت
کے کھاتے اتار دیا تھا جو اپنے ماسٹر کے وفادار تھے۔ ساری
حویلی خون سے رنگین تھی اور ہر طرف انسانی لاشوں کا ڈیر نظر آ
رہا تھا حیرت کی بات یہ بھی کہ فرار ہونے والوں نے حویلی سے
کوئی قیمتی چیز نہ اٹھائی تھی۔ شاید انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس
نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک سب سے قیمتی شے ان کی
اپنی جان تھی جسے بچا کر وہ اس حویلی اور ڈیرے سے نکل گئے۔

لمبی چھلانگ لگانے والے چند کھلاڑیوں کا ناٹھی انداز

خطائیں کر کے مذاق میں ازا دینے سے سزائیں معاف نہیں
ہو جاتیں... یہ حقیقت جب ان بے وقوفوں پر کھلی تو گنبد کے
مانند شہر کی جانب بھاگ جانے کا خیال انہیں کچھ لمحات کے
لیے تو مسحور کر گیا لیکن خطاؤں کی سنگینی نے ان کے چودہ
طبق روشن کر ڈالے کیونکہ... مجرمانہ کارروائیوں میں نہ
کوئی سبب ہوتا ہے نہ دشمن... پس ایک ایسی اجنبیت
ہوتی ہے کہ کسی بھی آنکھ میں اپنا عکس نظر نہیں آتا۔

بھائی بند

علی اعجاز



اداروں کو ہوش آتا تھا اور وہ یہاں پر کرکٹ ڈاؤن شروع کر دیتے تھے۔ اس کرکٹ ڈاؤن کو کسی غصے نہیں رکھا گیا بلکہ یہ خبر اخبارات میں بڑے فخر کے ساتھ چھپائی جاتی تھی کہ کرکٹ ڈاؤن گلاب تارن سے شروع ہو رہا ہے اور گلاب تارن تک جاری رہے گا تاکہ اسکور دوست ہوشیار ہو جائیں۔ ہم بھی انہی میں سے تھے۔

شہر کے بچے کی زبان پر یہ بات تھی کہ پولیس اسکورنگ کے ساتھ ٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا حصہ لے کر اسکورنگ کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ باوجود یہ کہ اس اسکورنگ کے فیوض و برکات مقامی لوگوں کو برا دراست حاصل ہوتے تھے مگر پھر بھی لوگ اس گل شدہ سامان خریدتے تھے اور اسے پسند کرتے تھے۔ جہاں تک بات ہے قانون اور اسکورنگ کی ملی جلت اور ان کے باہمی تعاون کی تو اس کی صداقت کے بارے میں حتیٰ فیصلہ صادر کرنا مشکل ہے کیونکہ اپنے دوسرا لہ کیریمز میں کسی پولیس والے بھائیوں کو ان کا ”حق“ نہیں دیتا تھا۔

”وہ بھی کیا دن تھے یار پوئی! وقت کتنی تیری سے گزر جاتا ہے نا؟“

میں نے گردن موڑ کر اکل کو دیکھا جو ایک نسبتاً سیدھی چٹان پر یوں آٹنی پائی مارے بیٹھا تھا جیسے شہنشاہ اکبر دربار جم کر بیٹھا ہو کر اداس تھا۔

اس نے بھر کہا۔ ”پوئی! تجھے یاد ہے، اس منحوس بزنس میں پڑ کر ہم نے کیا کھو یا؟“ تجھے چپ پا کر اس نے مزید اداس ہو کر کہا۔ ”ہم نے بچپن کھو یا..... بچپن کے یار کھو دیے۔ کیا دن تھے جب ہم سارا دن محلے میں آوارہ گردیاں کرتے تھے۔ شاہ، باہم، لوی، چڑیا، حامد گینڈا، اچھو شاہ، عامر وغیرہ..... یہ سب لوگ ہمارے ساتھ ہوتے تھے مگر وہ وقت گزر گیا..... یار! بڑے ظلم کی بات ہے۔ وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے، یوں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ زندگی وہ ریت ہے کہ جو لکھنوی سے سرکتی جا رہی ہے۔“

میں نے بھنا کر کہا۔ ”فلاسفر کی اولاد! کیا خاک تیزی سے گزرتا ہے وقت۔ ایک ایک لمبے لمبے پھیلنا ہوا لگ رہا ہے۔ ہمیں کتنی دیر ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے ابھی تک سامان نہیں پہنچایا۔ پتا نہیں کہاں سرگئے ہیں۔“

وہ میری اس بات کا اثر لیے بغیر بولا۔ ”پوئی یار! تو نے مجھے خواہوا اس دھندے میں کھیت لیا۔ میں گزرے ہوئے وقت کو بہت مس کرتا ہوں۔ بھلا اب وہ وقت کیسے واپس آسکتا ہے۔“

”جھوٹے آدمی اتنی سوچ کب بڑی ہوگی؟“ میں نے جل کر کہا۔ ”تو ہر چوتھے روز گزرے وقت کو یاد کر کے اداس ہو جاتا ہے۔ بیوقوف آدمی! تجھے میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میں نے تجھے اپنے کاروبار میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ ورنہ تو اب بھی خالی جیب، ہیر و زگار محلے کے گھٹے یا دیوں کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہا ہوتا۔ تیرے دن کا آغاز بچپن کی لعنت ملامت سے ہوتا اور رات کو شیک ٹھاک کا کیوں سے عزت افزائی کر دیا کہ تو کھانسی گہری نیند سوتا۔ یہ تیری جیب میں ٹوٹ ہوتے، نہ گھر میں تیری قدر ہوتی۔“

”اب کون سی ہوتی ہے؟“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”ماں دہائی بچتی رہتی ہے کہ تجھے پیدا کیا تھا کہ تو سخت کر کے حلال کار کھائے گا۔ تو اپنے ایک غیث دوست کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر اسٹریٹ بن گیا ہے۔“

میں نے اپنے گرد رپڑ پر حملہ ہوتے دیکھا تو پینٹر ابل کر کہا۔ ”اکل، میرے دوست! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم محلے کے تمام دوستوں سے زیادہ کمارے ہیں۔ تو نے دیکھا ہی ہوگا، جب سے ہم نے کام شروع کیا ہے، گھر والوں کے روئے میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ میرا باپ دن میں دوسرے بلاناغہ دکانی اور لالچی ملی جلی انجیل گالیوں سے میری عزت افزائی کرتا تھا کہ میں گدھے جتنا بڑا ہو گیا ہوں اور اپنا مستقبل بنانے کے بجائے لوفر دوستوں کے ساتھ قیمتی وقت پر یاد کر رہا ہوں۔ اب ہر مہینے بڑے ٹوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں پکڑا تا ہوں تو ظاہر نہیں ہونے دیتا مگر اندر سے بہت خوش ہوتا ہے۔ نہ اب گالیاں دیتا ہے، نہ جوتوں سے مرمت کرتا ہے۔“

”تیرا باپ ٹھہرا لالچی آدمی۔“ اکل نے عادت سے مجبور ہو کر نفی نکالا کیونکہ وہ بھی کئی مرتبہ میرے باپ کی گالیاں کے ذخیرے سے شیک ٹھاک مستفیض ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ”اور اپنے باپ کو بھی بھول نہ جایا کرو..... سارا محکمہ جانتا ہے کہ چاہے افضل نے زندگی میں نہ تو کوئی نماز چھوڑی ہے، نہ کوئی خوبصورت عورت۔ جو بھی اس کے کربانے اس پر آئی، متاع عزت و ناموس کی فروخت کے لیے بولی لگا کر بیٹھی۔“

”بکواس ہے یہ سب۔ ابا دکان کی ساری آمدن امان کے ہاتھ پر لا کر رکھتا ہے۔ پتا نہیں لوگوں نے کیوں یہ بات مشہور کر رکھی ہے۔“

”بیٹا! دھواں دہیں سے اٹھتا ہے جہاں پر آگ ہوتی ہے۔“ میں نے فس کر کہا۔ ”یہ فضول باتیں چھوڑ، مجھے تو فیشن ہو رہی ہے کہ ابھی تک سامان نہیں پہنچا ہے۔ کہیں ان لوگوں

کے ساتھ راستے میں گم ہونے ہوئی ہو۔“

اسی دوران نفلت روڈ کی طرف سے ایک ٹرک ہمارے پاس سے گزری۔ میں تو پہلے ہی بیٹھ چکا تھا کہ ایک چٹان کی ہڈیوں میں بیٹھا ہوا تھا جبکہ اکل نسبتاً اونچی چٹان پر بیٹھا تھا۔ ٹرک کی ہڈیوں کی روشنی سیدی میں اس پر پڑی تو وہ پھرتی سے چٹان پر اپنا منہ کر کے بچھانے لگا۔

”یہ کون ذلیل کا کام آگیا؟“

”اپنے ہی بھائی بندہ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بڑے غائب خوف معلوم ہوتے ہیں۔ لاشیں بندھی نہیں کیں۔“

”اسی طرح ایک دن پولیس آئے کی اور ہم دونوں پکڑے جا گئے۔“ اکل نے ہش کی طرح امکان کا اظہار کیا۔

”پتا تو مسکرا ہے، پڑ بڑی کی باتیں چھوڑنا تیرے بس کی بات نہیں، منحوس آدمی! بیٹھا کمانے کے لیے دل سے خوف کھانا پڑتا ہے۔ ڈھائی سال سے تیری بکواس سن رہا ہوں..... پکڑے جا گئے گے..... پکڑے جا گئے گے..... پکڑے جانا ہوتا تو اب تک آزاد محوم رہے ہوتے؟“ میں نے غصہ ہو کر کہا۔ ”مگر ہم لوگ یہ کام نہ کرتے تو اب ہماری کیا اوقات ہوتی؟ نہ تیری روزی سے شادی ہو پاتی، نہ محلے کی سب سے خوبصورت لڑکی صوفی میرے گن گاتی۔“

اس نے اعتراض کر لیا۔ ”تو شیک کہہ رہا ہے پوئی! روزی کا قصا باپ بھی اس کا ہاتھ بچھے نہ دیتا کہ میرے پاس لاپتہ نہ ہوتا لیکن تجھے یاد ہے نا وہ وعدہ جو ہم نے ڈھائی سال پہلے کیا تھا؟“

”ہاں ہاں۔ فکر نہ کر۔ جیسے ہی ہمارے پاس مناسب پٹا اٹھا جائے گا، ہم اسکالنگ چھوڑ کر کوئی مناسب کاروبار کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔ اسی دوران میں میرے پاس موجود نموس ٹرانسمیٹر نے شور مچانا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سامان پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں مستعدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

یہ شاید پریشانی سے آگے کا مرحلہ تھا۔ رات غارت ہوئی تھی۔ نیند کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ صبح اٹھا تو موڈ خراب..... اماں سے بدتمیزی کی، ابا سے اکڑ کر بات کی اور صلے میں گالیوں کی ایک بوچھاڑ حسب معمول وصول کی پھر سارا دن کمرے میں پڑا کر ہوتا رہا۔ ابھی دن کے دو بجے تھے اور میں اکل سے ملنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا گھر عقبی گلی میں غریب گھر تھا۔ اس کے گھر جانے کے لیے مجھے خاصا طویل پکر کاٹ کر جانا پڑتا تھا۔

راستے میں وحید عرف استاد سانگل سے ملاقات ہوئی جو عین جوانی میں سر سے ٹمٹھا ہو گیا تھا۔ میری دسک کے جواب میں اکل باہر گلی میں ہی آ گیا۔ ہم اس کے گھر کے قریب چائے انشال میں آ بیٹھے۔ وہ چائے آڈر کرنے کے بعد میرا بغور جائزہ لے کر بولا۔ ”لکنا سے تو رات بھر نہیں سویا؟“

”تیرا کیا خیال ہے..... اتنا نقصان سہنے کے بعد کھانسی گہری نیند سوتا؟“

”پوئی! یہ تو قسمت کی بات ہے یار! وہ سستی سے بھائی لے کر بولا۔

میں نے جل کر کہا۔ ”تو تو خوب گہری نیند سویا ہوگا؟“

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”شادی شدہ ہوں بھائی۔ جب محبوبہ بیوی کے روپ میں پہلو میں ہو تو ہر کچے ہو سکتا ہے کہ بندے کو کائناتوں پر کتنی گہری نیند آئے۔ دیکھ پوئی! میں تو کہتا ہوں تو بھی اب شادی کر لے۔ اس سے پہلے کہ استاد سانگل کی طرح تیرے سر میں سے بھی ٹمٹھا برا آدھ ہو جائے۔ اب عمر بہت ہو گئی ہے تیری، دیر نہ کر۔“

میں نے بتایا۔ ”ابھی ملا تھا منحوس شادی ہال کے سامنے، چہرے پر ازلی محبت لیے ہوئے۔ سر ہو گیا، کہتا تھا خوب روکڑا چھاپ رہے ہو اسکالنگ سے۔ میں نے کہا بد بخت! تجھے کس بد بخت نے کہہ دیا کہ ہم اسکالنگ کر رہے ہیں۔“

”بھائی! عشق، محبت اور اسکالنگ چھپائے نہیں جیسے۔ آہستہ آہستہ ہماری شہرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم یہ کام جتنی بھی احتیاط سے کریں، محلے کے زیادہ تر لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ ہم اسٹریٹ بن چکے ہیں۔ خیر، اس بیکار موضوع کو بھاڑ میں ڈال۔“ اس نے چائے کا پہلا سپن لیا پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ”یہ بتا، صوفی کیا کہتا ہے؟“

”وہ کیا کہہ سکتی ہے ہاسوائے کوئی بزنس کرنے پر زور دینے کے۔“ میں نے کہا۔ ”شادی کے لیے بھی اس نے شرط رکھی ہوئی ہے۔ تم تو جانتے ہو۔ یہ بھی جانتے ہو کہ وہ کس قدر ضدی ہے۔ کس سے کس نہیں ہوگی۔“

”بیٹا! وہ تجھے دھالیا کر کے چھوڑے گی۔ لوٹ کے کھاری ہے وہ تجھے..... اس طرح تو بزنس نہیں ہو سکتا..... نہ پیسہ جمع ہوگا، نہ کاروبار شروع ہونے کی نوبت آئے گی۔“

میں نے منحوس لپٹ کر کہا۔ ”تو چھوڑ صوفی کو..... ابھی میں تفتیش کرنے آیا ہوں۔“

”تفتیش؟“

”ہاں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”کس سے تفتیش؟“

”تجہ ہے۔“ میرا اواز دو ٹوک تھا۔ ”کیونکہ میں سامان
دروائے بغیر چلا گیا تھا۔ صوفی کو مارکٹ میں لڑکوں نے
میں ہنگامی حالات کے پیش نظر چلا گیا تھا۔ سامان کو
میں نے..... جب ہمارا سامان دلا کر بی بی لڑکیوں سے
میں نے مجھے بتایا تھا لیکن ٹھیک جیسے منٹ بعد تو نے بتایا
میں نے ہر گز کے پاس ڈاکوؤں نے تجھے روک لیا اور تجھے من
رہے ہیں کہ کے سپرد سامان لے گئے۔“

”اور تیرا خیال ہے کہ وہ غنڈہ امواں تیری بات غور اور قیاس سے گا اور پھر کہے گا کہ اُدھے، ہو گیا بادشاہ ہو.....“ آپ کا نام یوں پر..... ابھی آپ کا سامان لوٹا ہے دے دیتے ہیں۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”اجن آدمی! وہ ایسا کیوں کہتا ہے؟ بہت نا اصول ہوتے ہیں۔ تشدد و سب سے لیتے ہیں، چلنے چلنے لیتے ہیں مگر کبھی لوٹا ہوا مال واپس نہیں کرتے۔“ ”یہ بتا کر وہ روشن دادا کے پاس جانے کا کہا تھا۔“

اس سے پیشتر کہ وہ اپنے گلے میں نصب قدرتی لاکھڑی کے رہنے مجھے مزید خیالات سے دوچار کرتا، میں نے جاننے کے لیے اس کے قریب آکر کہا۔ ”کھاتے میں پیار“

”اُدو کے ہو گیا پوی جی!“ وہ دانت کھال کر گویا ”دو بار کیسا چل رہا ہے؟ لگتا ہے بیٹھ گیا ہے ورنہ تم جاب کھانے کی کوشش نہ کرتے.....“

”اے دوری!“ ”تمہیں اس کے قریب جا کر مسکا کر کہا۔
 ”اے!“ اس نے جھجھکیا جاتے جاتے کہا۔ ”بھرن کوہر؟“
 ”تمہارا بیرو کدھر ہے؟“ ”میں نے اگلے کے بارے
 ”سیرا کون سا بیرو؟“ ”دو بے پردائی سے ہوا۔“

بلکہ وہی شخصیت تھی جس کے گھر سے میں ابھی شیک ٹاک
بے عزتی کروا کر آ رہا تھا۔
”تو یہاں کھڑا ہے میں ابھی تیرے گھر سے ہو کر آ رہا
ہوں۔“ میں نے قریب جا کر اکل سے کہا۔
”حامد کار کشا الٹ گیا تھا، بڑی مڑی کے پاس۔ وہ
رکے میں بیڑیاں لے کر آ رہا تھا۔ میں اس کی مدد کرنے چلا گیا
تھا۔“ اکل نے بتایا۔ ”پیارے کو بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔“
”اپنی بیوی کو تیرا کر جاتا۔ بڑے خوشخوار تیروں کے
ساتھ وہ تیرا انتظار کر رہی تھی۔“

اور پھر کم دونوں وہاں سے کھسک کر میں روڈ پر چڑیا
کے کھوکے پر جا بیٹھ۔ چڑیا ہمارا بچپن کا یاد تھا۔ ہمیں دیکھ کر
ہمیشہ کی طرح اس کی یاچیں کل گئیں۔ ”گھرے اکل اور
پوی! کتنے دنوں بعد اپنی ٹھیکیں دکھا رہے ہو۔ کس حالات
میں بند رہے ہو؟“
چڑیا کو ہم سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا تھا۔ یوں تو وہ
یاروں کا یاد تھا لیکن یہ بات ہمیں بچپن سے ہی بخوبی معلوم تھی
کہ چڑیا کی کام آنے کو اپنی توہین سمجھتا تھا۔
میں نے پھر بھی چڑیا کو مخاطب کیا۔ ”چڑیا! تجھے سے ایک
کام پڑ گیا ہے۔“

”مجھ سے؟“ چڑیا ہمیشہ کی طرح بدک گیا۔
”ہاں۔“ میں نے کہا۔
”دیکھ پوی! تو بار بار اپنا۔ میں یاروں کا یاد ہوں مگر ہاتھ
بہت جگ جگ رہا ہے آج کل۔ حالات تیرے سامنے ہیں۔“
”چڑیا کے بچے! ہو گیا تیرا دھونا اسٹارٹ؟“ میں
نے برامان کر کہا۔ ”تو سمجھ رہا ہے کہ ہم تجھ سے ادھار مانگتے
آئے ہیں؟“

”وہ بولا۔ ”تو کیا نہیں مانگتے آئے ہو؟“
”ہرگز نہیں۔“
اس کی جان میں جان آئی۔ ”تو پھر کیا کام ہے مجھ سے؟
”ہم کو، یاروں کے لیے تو چڑیا کی جان بھی حاضر ہے۔“
”میں نے اس کے بے مثال غلوں پر کہا۔ ”بے شک،
بے شک، خیر، کام تجھ سے یہ ہے کہ روشن دادا کا دست
دست حنیف کی زمانے میں تیرا بڑا دوست رہا ہے، اسے
اپہرچ کرنا ہے۔“

چڑیا کے چہرے پر سنجیدگی کی پرچھائیاں گزریں۔
”خیرت؟“
”جہاں میں نے اسے تمام قصہ فہم کہہ دیا تو وہ کہہ کر سوچ
میں پڑ گیا۔ ”پوی! میں خطرہ بہت ہے۔ روشن دادا بہت
سنبھل ڈال جیت۔“

”کالم آدی ہے۔“

”یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں اس کے
ساتھ۔۔۔۔۔ میں ایک راز کو کھولنے کھولنے رو گیا۔“ کلام اس کے
لے تو تیرے پاس آئے ہیں۔ تو حنیف سے بات کر دو۔ میں
روشن دادا سے ملو اے۔“
چڑیا نے کہا۔ ”حنیف سے میرے تعلقات بہت پہلے
ختم ہو چکے ہیں۔“
”بہت کمینہ پایا گیا ہے تو۔“ اکل نے اسے گھورا۔ ”تو
جیتے جی کسی کے کام نہیں آئے گا۔“

”میں بچ کہہ رہا ہوں اکل! چڑیا منہ پایا۔
میں نے بچ میں حصہ ڈالا۔ ”بے شک تو بچ کہہ رہا ہے
لیکن حنیف کے ساتھ تیری خدا خواست دشمنی تو نہیں ہے نا تو
بات کر کے گا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔“
”اچھا۔“ وہ نیم رضامندی سے بولا۔ ”میں بات کر کے
دیکھوں گا۔“

☆☆☆

ٹوڈر کی آنکھوں کی لالی خاصی خوفناک تھی۔ اس نے
روشن دادا کے سامنے بے مشکل غصہ قابو کرتے ہوئے مجھے
آنکھیں دکھائیں۔ ”تیرے جیسے چہروں کو ٹوڈر پاؤں کے نیچے
مسل دیتا ہے۔ مجھ پر لازم تراشی کی سزا جانتا ہے؟“
میں نے اسے نظر انداز کر کے ہماری پرستی سے لے

روشن دادا کو مخاطب کیا۔ ”روشن دادا! اچھا آپ کے سامنے ظلم
بیانی کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟ میرے دوست نے خود
ٹوڈر کو ان ڈاکوؤں کے ساتھ دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے اکل اور
کیری ڈبے کے ڈرائیور کو اسلئے کی لوک پر بریغال بنایا اور
سامان لوٹ کر لے گئے۔ روشن دادا! ہم غریب لوگ ہیں۔
آپ کا تو یہ اصول دور دور تک مشہور ہے کہ روشن دادا اپنے
علاقے کے لوگوں کو تنگ نہیں کرتا۔ میں آپ کا محلے دار بھی ہوں
اور بہت عرصہ پہلے آپ کے ماتحت کام بھی کر چکا ہوں۔ خدا
کے لیے مجھے انصاف دیں۔“

روشن دادا نے ٹوڈر سے کہا۔ ”ٹوڈر! دیکھ لے، تو جانتا
ہے نا کوئی چیز زیادہ دیر تک روشن دادا سے چھپی نہیں رہتی۔“
”میں خدا، رسول کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایسی
کوئی واردات نہیں کی۔“ ٹوڈر نے کہا۔ ”اور پھر میں آپ کے
سامنے جھوٹ بولوں گا؟“

”یہ جھوٹ بول رہا ہے روشن دادا! اکل نے اسے اپنی
آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ تین اور لوگ بھی تھے۔“
روشن دادا نے کہا۔ ”خیر دوست اکل تیرے ساتھ

میں نہیں آیا؟ اصل بندہ تو وہی ہے نا جس نے ٹوڈر کو
دبھایا تھا۔“ اکل بہت بڑول ہے۔ میں نے
میں نے بتایا۔ ”اکل بہت بڑول ہے۔ میں نے
اے بہت سمجھا کہ روشن دادا ناحق کسی کو نقصان نہیں
پہنچاتے لیکن اس کے دل میں آپ کو لے کر بہت خوف بیٹھا
ہوا تھا اور پھر کل شام سے وہ شہر میں بھی نہیں ہے۔ اس کی
ساق کی طبیعت اچانک مجھ کوئی تھی۔ وہ شام کو ہی اپنی بیوی
کے ساتھ لٹک گیا تھا۔“

روشن دادا نے کچھ دیر تک کسی ”ذہین منصف“ کے مانند
مراقبہ۔ میری دھڑکنیں اچھل پھیل رہی تھیں۔
”دیکھ پوی، روشن دادا کی ایک ساکھ ہے۔ روشن دادا
پونی جلدی میں غلط فیصلے نہیں کرتا۔ تیرے دوست کا یہاں
پر موجود ہونا ضروری ہے۔ اصل مقدمہ تو ٹوڈر کا اور اس کا
بہرہ میں فیصلہ کروں گا۔“

میں نے خوشامدی انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے روشن دادا!
جواب کا ہم۔ جسے ہی اکل اپنے سرال سے لوٹے گا، میں
اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“
”ٹھیک ہے۔ یہ دروازے کھلے ہیں۔ جب چاہو
آجانا۔“ روشن دادا نے ایک ”عوامی جج“ کے سے جاہ و جلال
کے ساتھ کہا۔

میں ٹوڈر کی غصیلی نظروں سے بچتا بچتا روشن دادا کی
دہلیز سے باہر نکل آیا اور ساتے پر رنگ آنے والا بیٹا پوچھ کر
دہلیز پر نکل گیا۔ ابھی میں چکر گری چلا تھا کہ اچانک دو آدمی
میرے دائیں بائیں نمودار ہوئے۔ ایک کو میں نے فوراً پہچان
لیا تھا۔ انہوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑا اور کھینچ کر کھینچ
کی حرکت سے ایک تنگ سی ذیلی گلی میں لے گئے۔
”تھوڑو مجھے۔“ میں نے زور لگایا۔
”بگوان بند کرو۔“ ایک نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔
یہ تنگ سی گلی جو رہائشی مکانات پر مشتمل تھی، بالکل
دیران بڑی تھی۔ وہ دونوں مجھے پھر جھوم روڈ پر لے گئے جس دیدہ
دلبری کے ساتھ کھینچ کر اس گلی میں لائے تھے، اس سے یہ
بات داغ ہو جاتی تھی کہ وہ سکہ بند غنڈے تھے۔

گلی کا اختتام ایک بڑے خالی پلاٹ پر ہوا۔ پلاٹ میں
ایک بگوانی گلی تھاڑیوں کا جھنڈ تھا۔ وہ مجھے جھنڈ کی طرف دھکیلنے
لگے تو مجھے ان کا منصوبہ سمجھ میں آ گیا۔ ”ٹوڈر! دیکھ تو اچھا نہیں
کرنا۔“
ٹوڈر نے مجھے ایک جھانپڑ سید کیا۔ ”چپ۔“
”میں عزت کے معاملے میں بڑا حساس ہوں ٹوڈر۔“

میں نے بظاہر دھمکی اور اندرون خانہ دہلی دی لیکن انہوں نے
میری دہلی کو درخور احتیاد نہ سمجھا اور مجھے جھاڑیوں کے جھنڈے
جاچیکھا اور خوب شکاری لگا کر اور پلے گئے۔
میں نے انہیں غور سے دیکھا تو وحی کر کہا۔ ”ٹوڈر!
سوڈر کے بچے! میں روشن دادا کو بتاؤں گا۔“
ٹوڈر کو پھر کے لیے مڑا۔ ”تو نے مجھ پر جموہ الزام
لگایا۔۔۔۔۔ اس کی جتنی سزا مل گئی ہے۔ اب اگر تو نے روشن دادا کو
میری شکایت لگا تو تو سوچ لیتا میں تیرا کیا شکر کروں گا۔ ٹوڈر نام
ہے میرا۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ کا
روڑا اٹھا کر مجھے مارا۔

اسے میں ایک کڑورسا آدمی موٹے عدسوں والا نظر کا
چشمہ درست کرتا ہوا ہے گھر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔
”کیوں حیاں! ادھ تھاری پچھٹی لگا رہے تھے؟“

”نہیں جی۔۔۔۔۔ میری کہاں پچھٹی لگا رہے تھے۔“ میں
نے جل کر کہا اور کھڑا ہونے کی کوشش کی۔
”وہ ازراہ ہمدردی بولا۔ ”میں کھڑی سے دیکھ رہا تھا۔“
”بہت اچھا کر رہے تھے جناب!“ میں کھڑا ہو گیا۔
”بہت بھڑکی سے پیٹوہے تھے وہ۔“
”نہیں، نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ انہوں نے بہت
شفقت اور محبت سے پتا ہے مجھے۔“ میں نے کہا اور پھر وہاں
سے جانے کے لیے گلی میں داخل ہو گیا۔

اب مجھے اکل کی طرف جانا تھا۔ مجھے اس پر رہ رہ کر
غصہ بھی آ رہا تھا کہ میں نے اسے بہت کیا تھا کہ میرے ساتھ
چلو لیکن اس کی اڑی بڑی آڑے آگئی تھی۔ روشن دادا جیسے
بد معاش کے سامنے جانے سے اس کی درخشاں ہوتی تھی۔
مجھے اچنبھا ہوا کہ اکل کا قلیت بند پڑا تھا۔ نہ جانے
کبھی کہاں مر گیا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کل آ جاؤں گا،
جب تک اس کی واپسی بھی ہو جائے گی لیکن پھر میرے اندر
کے اضطراب نے مجھے سمجھا یا کہ معاملہ سامان کا ہے۔ کل اس کو
لے کر ہر صورت میں روشن دادا کے سامنے جانا ہوگا تاکہ وہ ٹوڈر
کے سامنے جا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرے لہذا میں
اس کے والد کی دکان پر چلا گیا۔

”السلام علیکم چاچا!“
”علیکم السلام!“ چاچا افضل نے مجھے سر تا پا دیکھا۔
”خیریت تو ہے؟“
”اکل کو ادھر نہیں آیا؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”یہ تو نے کیا مٹیہ بنا رکھا ہے۔۔۔۔۔
کہیں سے لڑکر آ رہا ہے کیا؟“

گمشدہ

سائنس

اعتبار ایک ایسے خطرناک احساس کا نام ہے جو قائم رہے تو انسان دنیا فتح کر لیتا ہے اور اگر ٹوٹ جائے تو خواب اور ذات دونوں ہی ٹوٹ جاتے ہیں... اس کا رشتہ بھی دل کے نازک تاروں سے جڑا تھا مگر بے اعتباری کی ایک چوٹ سے ایسا طوفان آیا کہ محبت کے سارے نقش مٹ کر رہ گئے۔



بالآخر ادیبو نے فیصلہ کیا کہ اسے نسل کے گھری مٹانی خود کرنی پڑے گی۔ یہ اچھا تھا اس لحاظ سے کہ وہ اس گھر سے ان تمام پرانی یادوں کو نکال باہر کرتی جو نسل کو تکیہ دیتی تھیں۔

اس کے بھانجے نسل کی بیوی کیرن کو غائب ہونے لگ بھگ سال پورا ہونے کو تھا۔ اس کی کار ایک سڑک کنارے لیٹی تھی جس کی ہیڈ لائٹس اور دروازے کھلے ہوئے تھے مگر کیرن غائب تھی۔



اماں نے کہا۔ ”اچھا جی! ابھی میرے مارنے کی باتیں چھوڑ۔ تیرا وہ دوست آیا تھا۔ اکمل!“

”اکمل... کب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”دوڑھا ہی ہے۔۔۔۔۔۔ یا اس سے پہلے؟“

”کیا کہتا تھا؟“

”ایک لفافہ دے گیا ہے۔ کہتا تھا، تجھے دے دوں۔“

”کوہر ہے وہ لفافہ؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”تیرے کمرے میں رکھا ہے، بیڈ کے سرانے۔“

میں لپک کر اپنے کمرے میں گیا۔ نیکے کے اوپر ایک سر پر لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جلدی سے چاک کیا تو اس میں سے ایک کاغذ برآمد ہوا جس پر چند سطریں اکمل کی رائٹنگ میں لکھی ہوئی تھیں۔

”میرے دوست پویا!

سب سے پہلے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں یہ پریشانی اٹھانا پڑی ہے۔ میں اور روزی شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ روزی میرے کام سے مطمئن نہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں کوئی ڈسٹنکٹ کام کروں۔ تم تو جانتے ہو میں روزی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ لہذا روزی کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے تمہارے ساتھ دھوکا کر رہا ہوں۔ جو سامان ہم نے وصول کیا تھا، وہ نوڈز اور اس کے ساتھ ہیں۔ میں لوٹا تھا بلکہ میں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک ڈسٹر کو بیچ کر رقم وصول کر لی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ روشن وادانے تمہارا کیا حشر کیا ہو لیکن تمہاری واپسی تک میں روزی کو لے کر نکل چکا ہوں گا۔ سامان کی رقم کے علاوہ بھی روزی نے کافی سارے پیسے بچت کر کے بچا لیے تھے جو اب مجھے کوئی شریفانہ برٹس شروع کرنے میں مدد دیں گے حالانکہ تم یہی سمجھتے تھے کہ روزی مجھے لوٹ کر کھارتی ہے۔۔۔۔۔۔ روزی کو لگتا تھا کہ تم کوئی مناسب کاروبار کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو جی نہیں ایسا سوچنا پڑا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بڑھ کر تم بلوار ہے ہو گے لیکن اپنے دوست کی مجبوری کو سمجھو یا رام جتنے غیبت ہو، مجھے یقین ہے کہ جلد ہی کوئی نیا شیطانی دھندلا شروع کر دو گے۔ بہر حال اب یہ باتیں فضول ہیں۔ مجھے دل سے معاف کر دینا اور یہ رقم وصول کرنے میرے ابا کے پاس نہ پہنچ جانے دینا۔“

تمہارا دوست۔۔۔۔۔۔ اکمل!“

”نہیں تو۔۔۔۔۔۔ میں نے نئی سر ہلا دیا۔“

”وہ یوں۔۔۔۔۔۔ اور اپنا طیارہ کچھ۔۔۔۔۔۔“

میں دیوار کے ساتھ نصب قد آدم آئینے کے سامنے آیا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چوکور نسل ہونے والی خاطر تو اس کی نشانیاں لباس اور چہرے پر پڑنے والے نسل کی صورت میں واضح تھیں۔

چاچا کو اپنے لخت بیکری گھرائی ہوئی تھی۔ ”اکمل کہاں ہے۔۔۔۔۔۔ وہ کبک تو ہے؟“

”ابھی کی تلاش میں تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔۔ اپنے قیث پر نہیں ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں یہ کہہ کر باہر کے ساتھ دکان سے باہر نکل آیا تو چاچے افضل نے اپنی بھاری آواز میں پکارا۔

”لو! بات تو سن۔ کوہر جاتا ہے۔ کچھ بتا تو سنی۔“

میں نے ساتھ تری لڑائی ہوئی ہے۔“

لیکن میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات میرے کانوں تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

اگرچہ میں اپنا طیارہ ٹھیک کر کے گھر گیا تھا لیکن میں اپنا طیارہ بھی بھرتا بیٹا تھا، آٹھ کے نیچے پڑا ہوا بڑا سا نسل چھپ نہیں سکتا تھا۔

اماں نے رو دھو کر دل کا غبار نکالا۔ ابا نے گالیوں کا ایک بے مثال ذخیرہ خرچ کر کے اپنے پدرانہ جذبات کا اظہار کیا اور درختی سے کہا۔ ”مکنت! مار کھا کے آ گیا۔ بزرگوں کی عزت خاک میں ملاوی۔۔۔۔۔۔ سیتا تاس ہو تیرا۔“

میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”میں آپ کا خون ہوں اماں! یوں بزدلی سے مار کھا کر کیسے آسکتا ہوں۔ میں نے دشمن کو ناکوں سے چھو دیا ہے۔ جتنی چوٹیں میں نے اس کو لگائی ہیں، میری چوٹیں تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ وہ پڑا ہو گا اسپتال میں۔“

”وہ تھا کون؟“ اماں نے آخر کار پوچھ لیا۔

”ایک پرانا جاننے والا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”ابا نے پوچھا۔ ”لڑائی کی وجہ کیا تھی؟“

”مکنت نے گالی دی تھی آپ کو۔“ میں نے کہانی میں رنگ بھرتے ہوئے کہا۔

ابا زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ سے خوش ہوا اور میری پیٹھ ٹپک کر ہلا۔ ”شاباش! تم پر فخر ہے۔ اگر کوئی میرے سامنے تمہارے دادا مرحوم و مغفور کو گالی دیتا تو میں بھی اس کا یہی حشر کرتا۔“

گیارہ مہینے بغیر کسی اچھی یا بُری خبر کے انتظار کرتے ہوئے گزار گئے۔ گیارہ ماہ بعد پولیس کو اس کا پرس شہر سے دوپٹا اور ایک جھگ کے کنارے پھنسی ایک عری کے پاس سے ملا۔ ٹیل کی چٹلی یہ بات پر مجبور ہوئی گئی کہ شاید کیرن مر چکی ہے۔ اسی لیے انہوں نے چرچ میں ایک چھوٹی سی تقریب منعقد کی۔

اولیو یا کا خیال تھا اس طرح ٹیل اپنی بیوی کے خواب سے بھڑک کر اٹھے گا۔ شاید چند دن سوگ منا کر اپنی زندگی بھر سے بھر پور انداز میں سیتا شروع کر دے۔

کیرن کے لیے منہ کی گئی اس دعا نے تقریب میں جب ٹیل کو کیرن کے لیے کچھ الفاظ کہنے کے لیے بلایا گیا تو چند لمحوں کے کیرن کے چہرے کی بڑی تصویر کو گھورتا رہا۔

پانچ پریشان کن منٹوں کے بعد آخر کار وہ لرزتی آواز میں بولا۔ ”مجھے یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے جدا کرتی ہو۔“

کیرن کے جانے کے بعد ٹیل صوفے پر سوراہا تھا، اس بستر سے بچنے کے لیے جو بھی وہ اور کیرن تیز کرتے تھے۔

دخانے میں نہاتا تھا کہ کیرن کے شیپو کی خوشبو اس کے سنتوں تک نہ پہنچ جائے۔ الماری میں اس کے کپڑوں کو سب سے پیچھے دھکیل دیا تھا کہ کہیں غلطی سے بھی اس پر نظر نہ پڑ جائے۔

ٹیل کا یہ رویہ تازہ نہیں تھا۔ سب دیکھ رہے تھے، وہ کیرن کی یادوں سے خوفزدہ بھی تھا مگر اس سے آواز بھی نہیں ہوتا چاہتا تھا۔ اب جبکہ سب کیرن کو مردہ مان چکے تھے، ٹیل کو اپنی زندگی میں آگے بڑھنا چاہیے تھا مگر وہ حال گزرنے کے بعد بھی وہیں کا۔ وہیں کھڑا تھا اور اسی لیے اولیو بانیے فیصلہ کیا۔

بس بہت ہوا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ٹیل کو کیرن نام کے آسیب سے چھٹکارا دلایا جائے۔

اس دن ٹیل کے آفس کے لیے نکلنے کے بعد اولیو یا اس کے گھر پہنچی تھی۔ اس کے پاس اضافی چابی تھی اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

کچھ دن پہلے جب ساری فیملی ایک ساتھ بیٹھی تھی، ٹیل نے بے لگب انداز میں کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا کوئی گھر میں کسی طرح کا ردوبدل کرے یا کیرن کی چیزوں کو چھینے۔

مگر اولیو یا نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ ایک غمزدہ شوہر کا بیان تھا اور وہ جانتی تھی کہ غم میں لوگ کون کون سا کچھ کر باہر نکلتا پڑتا ہے۔

آج رات جب وہ گھر پہنچے گا تو اسے راحت اور آراؤ کی احساس ہوگا۔ اسے اس بات کا یقین تھا۔

اولیو یا ہمیشہ سے ایک اچھی خالہ رہی تھی۔ ٹیل اس کے سامنے پہلی کر جواں ہوا تھا اور وہ اسے اتنی اچھی طرح جانتی تھی کہ شاید ٹیل بھی خود کو اتنا نہ جانتا ہو۔

اولیو یا کو احساس تھا کہ ٹیل ایسا کیوں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اوپر منڈلاتے شکوک و شبہات، سرگوشیوں اور نظروں سے خوفزدہ تھا۔ اسے لگتا تھا اگر وہ کیرن کو بھول کر اپنی زندگی میں آگے بڑھے گا تو لوگ اسے غلط سمجھیں گے مگر اب اسے لوگوں کی پروا چھوڑنا ہوگی۔ اسے آگے بڑھنا ہوگا۔

ٹیل کے جانے کے دس منٹ بعد اولیو یا اندر تھی۔ چھپے سگے ڈبوں اور دروی کی نوکریوں سے لیس۔

گھر میں پُر ہول خاموشی طاری تھی۔ کیرن کی موجودگی میں ایسا نہیں تھا۔

”تم جہاں بھی ہو اس دنیا میں یا دوسری دنیا میں، امید کرتی ہوں آرام سے ہو۔“ اولیو یا نے بہ آواز بلند کہا اور پھر اپنے کام پر لگ گئی۔

پہلا باکس کیرن کے رومانوی ناولوں سے بھر گیا تھا۔

ہاتھ روم آسان تھا۔ پہلے کا حمام سامان اس نے کچھ سے ڈبے میں ڈالا۔ اس کی جگہ نیا خوشبودار صابن، نیا شیپو اور ایک نئی شیپو کٹ رکھ دی۔ شاور کے پھول دار پردے پر دخول جم چکی تھی۔ اولیو یا نے اسے بھی کھینچ کر اپنے اتارا۔ بھلا ایک دخول بھر سے شاور کرتی کتنے اترنے سے ٹیل کے جذبات کیونکر بچ رہے ہو سکتے تھے؟

کچھ دیر خود سے انھنے کے بعد اولیو یا نے کمرے میں لگی کیرن کی تصویر چھوڑ دی لیکن ہال دوسے میں شادی کی تصویر اتار دی۔ ابھی اسے ٹیل کی نظروں سے دور کر دینا ہی بہتر تھا۔ شاید ایک دن ٹیل اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے تیار ہو جائے۔

بید روم میں بڑا کام تھا۔ اولیو یا نے چار بڑے ڈبوں کو جوتوں اور کپڑوں سے بھر دیا۔ اسے خدشہ تھا اتنا سامان شاید ہی اس کی گاڑی میں آجائے۔ اسے متعدد دورے کرنے پڑیں گے۔

کیرن کے کچھ بیانات اتنے خوبصورت تھے کہ ایک بل کے لیے اولیو یا کی ان پر نیت خراب ہونے لگی۔

غیر رنگ کاروباری ڈریسنگ گاؤں۔ اس کا غاس طور سے اپنے لیے الگ کر لے۔ تاہم پھر اسے دل چاہا کہ کیرن ٹیل اسے کسی دن اولیو یا کے گھر دیکھ لیا خیال آیا کہ گھر میں ہو گا یا اس سے بھی بدتر، تو کچھ جان جائے گا۔ اسی لیے ارادہ بدلتے ہوئے اس نے سوگوار ہو جانے کے ساتھ عطیہ کرنے کے لیے ڈال دیا۔

اس کے پاس بستر کے لیے نئی سفید چادریں تھیں۔ اس نے پرانی چادروں کو کچرے کے خیلے میں ڈالا۔ وہ انہیں چیتروں میں کاٹ کے اپنے کسی کام میں لاسکتی تھی۔

بید روم میں ماسٹر بیڈ پر چادر کے نیچے ایک گدے کا بٹھا تھا۔ اولیو یا نے اس گدے کو تھوڑے مشکل سے کھینچنے کی کوشش کی۔ اسے دھوننا سب سے زیادہ ضروری تھا تاکہ گندہ کیرن کی خوشبو سے بچکارا حاصل کیا جاسکے۔

اس نے کہیں پڑھا تھا۔ ”خوشبو سب سے بڑی بیوری نوکر ہے۔“

پہلے کے نیچے کے گدے پر ایک سرخ لٹاف تھا۔ اولیو یا کھلے ہوئے گدے پر بیٹھ گئی۔ اس نے لٹاف اٹھایا اور کچھ برائت پلٹ کر دیکھتی رہی۔

اس لٹاف کے اندر ایک کارڈ تھا۔ اولیو یا کے اس کارڈ کو کھولنے کے پیچھے کوئی تجسس نہیں تھا۔ یہ سب ایک بے انتہائی حرکت تھی۔

کارڈ کے کھولنے ہی گلاب کی سوکھی پھکھریاں اس کی گود میں بکھر گئیں۔ کارڈ کے اندر ایک ہاتھ سے لکھا ہوا خطا جاس میں کیرن کو مخاطب کیا گیا تھا۔

اولیو یا کی نظریں تیزی سے ان سطروں پر پھسلنے لگیں۔

محبت کے وعدے، کھلے ڈلے جذبات کا اظہار، جسمانی خواہشات کے حوالے۔

اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ ”تمہارا بیٹن!“

اولیو یا بیٹن نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی تھی۔ یہ ایک اثر تھا۔ یہ ایک اشارہ ہونا چاہیے۔ اسے فوری طور پر اس کی اطلاع دینی چاہیے۔

اس نے اپنا پرس اس پرائیویٹ ڈیٹلیو کے بڑے کارڈ کی تلاش میں ٹھولا جو کیرن کی تلاش پر مامور تھا۔ جس

کے بارے میں اولیو یا کا خیال تھا کہ وہ ایک ناکام ڈیٹلیو ہے لیکن شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ اس کے پاس شروع کرنے کے لیے زیادہ کچھ تھا نہیں، سوائے کیرن کی ایک تصویر کے۔۔۔۔۔۔ اور اب اولیو یا کے ہاتھ یہ ایک سراغ لگا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ کیرن کی خفیہ زندگی کا ایک ٹکڑا کھلے ہوئے تھی۔

کیا اس بارے میں معلوم کرنا اب اس کے بھانجے کو تکلیف دینے کے علاوہ کوئی اور مقصد پورا کر سکتا ہے؟ ٹیل کو تکلیف دینا ناقابل تصور تھا۔

اب کوئی چیز کیرن کو داپس نہیں لاسکتی لیکن اگر اس نے کیرن کا راز ظاہر کر دیا تو ٹیل کو ایک اور دھچکا لگے گا۔ ایک اور چوٹ، کیرن کی بیوقوفی کی۔

اس نے پرس سے ہاتھ واپس لٹالا اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اب وہ اس خط کا کیا کرے؟ کیا اسے اپنے ساتھ لے جائے یا خارج کر دے؟ یہ تو بے طے تھا کہ وہ اسے یہاں نہیں چھوڑنے والی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ کر پاتی، اس نے سامنے والے دروازے کی آواز سنی۔

ایک سیکنڈ بعد اس نے ٹیل کی آواز سنی۔ وہ اس کا نام نکال کر پوچھ رہا تھا کہ اس نے اس کی کارڈ بھی اور وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟

اولیو یا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ خود ہی اس کی تلاش میں بید روم تک آیا۔ اولیو یا اس سرخ لٹاف کو سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ ٹیل نے لٹاف کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف۔

اس کے چہرے کے تاثرات اتنے ناقابل فہم تھے کہ اولیو یا کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی انجینی کو دیکھ رہی ہو۔

وہ نہیں جانتی تھی کیرن۔۔۔۔۔۔ مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی جب اس نے ٹیل کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

”مجھے افسوس ہے، آئی اولیو یا!“ اس کی آواز ساٹ تھی اور اس کا چہرہ بھی۔ ”میرا خیال تھا کہ میں نے ان سب کو کیرن کے ساتھ ہی دفن کر دیا ہے۔“

ٹیل کے ہاتھ اس کی گردن کی سمت بڑھے۔ اولیو یا کی آنکھیں پھیلیں اور اس کی آنکھوں کے منظر میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

مستقل شاعر و سخن

✽ نایب یوسف اسلام آباد
قلعہ چار سو ہے میں دیکھوں جہاں تک
حالت میرے وطن کی بڑی سوگوار ہے
✽ عام خان کراچی
جب بھی لوٹ کے پردیس سے گھر جائے گا
دیکھ کر خالی در و پام وہ ڈر جائے گا
میر ساری ہی گمراہی تھی کائنات میں اب
خالی دیواروں کو سمجھتے ہوئے سر جائے گا
✽ شاہین نسیم کراچی

درد لفظوں میں کہاں دل کا بیاں ہوتا ہے
درد دل کا تو لکھوں سے عیاں ہوتا ہے

✽ کلید احمد ملتان
چار سو زنگی میں بے لے ہیں
لوگ کیوں بجز میں اکیلے ہیں
✽ صابر و جہان گکوگی

لے گی ہر خوشی ماں کی خدمت سے
ماں کی خدمت بھی سمجھو عبادت ہے
✽ رویہ کوثر گکوثر منڈی

مجھے حاشا تو کر اپنے دل کی دنیا میں
نظر اٹھا میں تیری وسعت نظر میں ہوں
✽ محمد حسن سیالکوٹ

ان کی آمد کا تصور روح پرور ہے مگر
دیکھ کر ٹوٹا ہے یہ ظلم انتظار
✽ خادم حسین سرری

ہنگوں پہ رگ کیا ہے سند غبار کا
سنا عجیب نہ ہے بڑے انتظار کا
✽ طاہر خان کراچی

اٹھی چاتو کی قبر ہے دل میں
چلے آؤ بھی تو فاتحہ پڑھنا
✽ محمد نواز جبیب آباد
مرق آباد جہیں ، پتی نظر ، لب خاموش
بے وقالی پہ کھیں آپ پشیاں تو نہیں



✽ ادیس کمال حیدر آباد
جو میرے ہر درد کی دوا ہے
نظر وہ میری ماں کی دعا ہے
✽ نیلہ جنید سرگودھا

دو گام ساتھ چل کے ہمیں چھوڑنا نہیں
ہم جیسے پھر ملیں گے نہیں اس جہان میں
جس طرح سے رشتہ مرا مجھ سے بچھڑا ہے
کل ہم ٹپک رہے تھے کبھی رفتگان میں
✽ رفعت شہناز گجرانوالہ

آنکھوں میں ممکنات کی پرچائیاں لے
میں سائل حیات تیرا کھڑی رہی
✽ صابر شاہ تلہ گنگ

تمہاری دیکھ کا مقصد رہا ہے جن لکھوں کا
”چشم ہشر بھرا کھیں کیا تم نہ آؤ گے“

✽ ابراہار سیالکوٹ
ہوں گی ہائیں اترار ہونے تو دے
ہوں گی دھار ہونے تو دے
ہوں گی چار ہونے تو دے
ہوں گی چار ہونے تو دے

✽ ہادی کریم کراچی
آپ کی یاد میں بہائے ہیں
آپ کی یاد میں بہائے ہیں
آپ کی یاد میں بہائے ہیں
آپ کی یاد میں بہائے ہیں

✽ شاہین پروین کراچی
جس راتے تو سمجھتے ہیں تیری نظر سے ہم
اس راتے تو سمجھتے ہیں تیری نظر سے ہم
اس راتے تو سمجھتے ہیں تیری نظر سے ہم
اس راتے تو سمجھتے ہیں تیری نظر سے ہم

✽ ام سعید چائیاں
ہر اک شب وہ غیبی آنکھیں اور بھی نلی تھیں
ہر اک شب وہ غیبی آنکھیں اور بھی نلی تھیں
ہر اک شب وہ غیبی آنکھیں اور بھی نلی تھیں
ہر اک شب وہ غیبی آنکھیں اور بھی نلی تھیں

✽ سلمان کی کراچی
دل نے اگر چھپا بھی لیا داغ آرزو
دل نے اگر چھپا بھی لیا داغ آرزو
دل نے اگر چھپا بھی لیا داغ آرزو
دل نے اگر چھپا بھی لیا داغ آرزو

✽ نازنین اشرف کراچی
سورت تری جو دیکھی تو قربان ہو گئے
سورت تری جو دیکھی تو قربان ہو گئے
سورت تری جو دیکھی تو قربان ہو گئے
سورت تری جو دیکھی تو قربان ہو گئے

✽ سید ابراہار بنوں
ایک لگا سا جسم ، ایک گہرا سا خمد
ایک لگا سا جسم ، ایک گہرا سا خمد
ایک لگا سا جسم ، ایک گہرا سا خمد
ایک لگا سا جسم ، ایک گہرا سا خمد

✽ رمضان خان میانوالی
نظر کو حال دل کا ترجمان کہتا ہی پڑتا ہے
نظر کو بھی اک طرف بیاں کہتا ہی پڑتا ہے
نظر کو بھی اک طرف بیاں کہتا ہی پڑتا ہے
نظر کو بھی اک طرف بیاں کہتا ہی پڑتا ہے

✽ ساجدہ مریم ڈیرہ غازی خان
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقین نہ کوئی امید
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقین نہ کوئی امید
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقین نہ کوئی امید
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقین نہ کوئی امید

✽ شائستہ پروین ملتان
ہم ان کو سوچ میں تم دیکھ کر دایں پلٹ آئے
ہم ان کو سوچ میں تم دیکھ کر دایں پلٹ آئے
ہم ان کو سوچ میں تم دیکھ کر دایں پلٹ آئے
ہم ان کو سوچ میں تم دیکھ کر دایں پلٹ آئے

✽ فرحان کراچی
فرقوں کے جھللاتے کس جگہوں پر رہے
فرقوں کے جھللاتے کس جگہوں پر رہے
فرقوں کے جھللاتے کس جگہوں پر رہے
فرقوں کے جھللاتے کس جگہوں پر رہے

✽ راجا اجمل جہلم
اس زلف کا کیا کہنا جو دوش پہ لہرائے
اس زلف کا کیا کہنا جو دوش پہ لہرائے
اس زلف کا کیا کہنا جو دوش پہ لہرائے
اس زلف کا کیا کہنا جو دوش پہ لہرائے

✽ محمد فیاض شاہد ہٹ
اچھا کیا سیت لے گیسوئے دراز
اچھا کیا سیت لے گیسوئے دراز
اچھا کیا سیت لے گیسوئے دراز
اچھا کیا سیت لے گیسوئے دراز

✽ تمیز اشرف گلگت
تم آہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
تم آہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
تم آہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
تم آہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں

✽ شاہد نسیم ہارون آباد
ڈر ہے ترے حسین تصور کا خوں نہ ہو
ڈر ہے ترے حسین تصور کا خوں نہ ہو
ڈر ہے ترے حسین تصور کا خوں نہ ہو
ڈر ہے ترے حسین تصور کا خوں نہ ہو

✽ نور حسین شاد
راز کہہ دیتے ہیں نازک سے اشارے و کفر
راز کہہ دیتے ہیں نازک سے اشارے و کفر
راز کہہ دیتے ہیں نازک سے اشارے و کفر
راز کہہ دیتے ہیں نازک سے اشارے و کفر

✽ تری نیم خوش نگاہیں ، ترا دیر ب جسم
یوں ہی اک ادائے مستی یونہی اک قریب سادہ
یوں ہی اک ادائے مستی یونہی اک قریب سادہ
یوں ہی اک ادائے مستی یونہی اک قریب سادہ

✽ رب نواز گجرانوالہ
تمہارے حسن سے رہتی ہے ہم کنار نظر
تمہارے حسن سے رہتی ہے ہم کنار نظر
تمہارے حسن سے رہتی ہے ہم کنار نظر
تمہارے حسن سے رہتی ہے ہم کنار نظر

✽ فخر عروج لاہور
یہ کیا ظلم ہے کہ شایا گیا مجھے
یہ کیا ظلم ہے کہ شایا گیا مجھے
یہ کیا ظلم ہے کہ شایا گیا مجھے
یہ کیا ظلم ہے کہ شایا گیا مجھے

اسے امید تھی کہ اس کا موجودہ ریورٹنگ امریکیوں سے
 اچھے پیسے دلوائے گا۔ اس کو امریکن ایجنسی کی ایک بکر غری
 کے ذریعے کوڑے ٹنگ مشین کے چپ کارڈ کی کاپی حاصل کر چکی۔
 دیکھا کہ اس نے کئی ہفتے کے بعد اس کام کے لیے تیار
 کر لیا تھا۔ دیکھا کہ کل دوپہر ایک پارک میں ملنا تھا۔ اگر وہ
 کاپی مل گئی تو وہ امریکیوں سے اچھے پیسے حاصل کر سکے گا۔

انتشار چاہے کھر کی سلطنت میں ہو یا ملکی سطح پر... اس انتشار کا سبب ہمیشہ کوئی ایسا شخص ہوتا ہے جو آپ کے انتہائی قریب ہو... اس ملک میں بھی مسلسل ہونے والے حادثات و واقعات نے حکومتی مشینری کو ہلا کر رکھ دیا تھا... ایسے میں اس کی جاسوسی نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ نودہ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا۔

اپنے ہی وطن کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والوں کا عبرت اثر انجام

گھر کا
سی

فیاض حسین جعفری



بے نام اداسی میں دیکھے شانگلہ کی
ہر چہرہ حقیقت میں پُر درو کہانی
❀ شاپانہ فیض رحیم یار خان
ہر اک چہرہ پڑھتے جائیں، ہر اک دامن چاک کر لیں
ہر اک جو ہر دھوئیں کے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ
❀ جو داد احمد کراچی

یہ حرمت ہے کہ تم جیتے ، مگر ہو پھر بھی انوار
تمہارا وار اور اچھوتا تھا کہ میری مات اور حوری ہے
* آصف خان پشاور

ہے اور کیوں تنہا ہوا کہ بستیاں تو بہہ چکیں
کہ گر چکی ہیں بجلیاں ، یہ ہجرتوں کا دور ہے
✽ شاہدیم بدین

پھول ممکن اور تارے مٹی سب کا وہ دھن دان
شکر کرے ہے ذرہ ذرہ ناشکرا انسان
❁ فردوسِ آخریدی..... پشاور

بارود برستا ہو جہاں روز زمیں پر
اس دس میں پھولوں کے زمانے نہیں آتے
❀ مہوش علی..... کراچی

یہ میری عقل کا دھوکا ہے یا اس کی ہے یہ جانائی
میں بیٹھ گئی اک منزل پر، وہ منزل منزل ہر جا کی
❁ کریم شاہ..... قصور

فرمان فرمایا کہ تم میری بات سنو اور میری بات سن کر میری بات کو دہرائیں۔
 فرمایا کہ تم میری بات سنو اور میری بات سن کر میری بات کو دہرائیں۔
 فرمایا کہ تم میری بات سنو اور میری بات سن کر میری بات کو دہرائیں۔

راں ہے کس عماری پر او جاہ انسان
ب بچم فتح کیے نہ فتح کیے الزمان
✽ کبیر احمد..... سوات

کیا جانیں کہ ایک خدا کی پوجا میں کیا ملتا ہے
در سجدے کرتے ہیں جو دولت کی جھنکاروں کو

﴿ محمد ایوب کراچی ﴾
 لب پہ لاتے نہیں مطلب کی کوئی بات سبھی
 اور پنوں میں اسگوں کو جواں رکھتے ہیں
 ﴿ تنویر علی مظفر گڑھ ﴾
 رات مجلس میں تری ہم بھی کمرے تھے چلے
 جیسے تصویر نگارے کوئی دیوار کے ساتھ
 ﴿ دلدار بھٹی لاہور ﴾

ساجن کو جب جان نہ پاؤں اس سے کیا منواؤں
خوئی اپنے جی میں تڑپوں اور میں رولوں
✽ شیرالوج..... سکھر

دل میں کر ہر دکھ سہلے گا، ہے شرط تمہارا ساتھ لے
تم دشت بنو یا شہر بنو یا پاؤں کا چھالا بن جاؤ
✽ مکان ایاز..... روہڑی

غرض کی اس دنیا میں شام سے پہلے بجھی کا
کچھ میں دانا داب کے لانا اچھا لگتا ہے
✽ عابد علی — میرپور خاص

دن کی ہیں پھواریں ، جیون پہ اب تمہارے
سما مرا فجر ہے ، کیا ساتھ تم چلو گے
❁ کاشفِ خاں — مری

کام تو کھن ہے ، غزریں تو اس کلی سے
میں چاہے بیٹے ، دل کو تو آزمائیں
محمد حسین بہادر

پ عداوت بھی ہوتا رہے گا
نے جینے کی مہلت اگر دی
میر خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
اے الہی کی جھیل کردی

✽ ذکرِ ساحرہ..... بحوالہ

❁ سیکینہ شاہ..... اوکاڑہ

موسم میں رہائی اُن کو مت دینا میار
لے چکی بھی اس میں بے پرختے جاتے ہیں

مُحْفَلٌ شِعْرٌ وَسُخْرٍ

٤٢٠

3

کوپن
برائے
شمارہ
اپریل
2024

بات سن لو۔“ لیری نے کہا۔
 ”میں اپنے ملک کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں۔“
 مجھے اب ایجنسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ڈینی نے کہا۔
 ”پلیز ایجنسی ملک کا حصہ ہے اور کل سلاطین کے لیے
 میری بات پر غور کرو۔ میں ڈینی ڈائریکٹر ڈکسن ہیلڈا
 ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔ چند مہینے سے دنیا کے مقرر
 حصوں میں ہمارے جاسوسی کے پروجیکٹ کا کام ہو رہا
 ہے۔ ہمارے ایجنٹ ناکارہ کیے جا رہے ہیں۔ روس کے
 جاسوسی ادارے K.G.B کو ہمارے ارادوں کا پتہ لگا رہا ہے
 چل جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری اپنی ایجنسی کے
 اندر کوئی دزد خیرید ایجنٹ کھسا بیٹھا ہے۔ ہمیں اس گھر کے عجیب
 کو تلاش کرنا ہے۔“ لیری نے کہا۔

”میں تو سات سال پہلے ایجنسی چھوڑ چکا ہوں اور اب
 سکون سے ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔“ ڈینی نے کہا۔
 ”زیادہ نہیں، صرف چھ مہینے کے لیے واپس آ جاؤ۔ ہم
 کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ تم جو چاہو گے، وہ سامان ضرور
 جاسکتا ہے۔ اگر تم انکار کرو گے تو ہم اس دریا کے پانی میں ڈال
 ملا دیں گے اور تمہارا خشت کیمپ پر باد ہو جائے گا۔ کوئی سیار
 یہاں آتا ہے نہیں کرے گا۔“ لیری نے کہا۔
 ڈینی نے تین روز تک پوری صورت حال پر غور کیا۔
 خشت کیمپ کا سارا انتظام اپنے نائب کے سپرد کر کے نیویارک
 جانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن روانگی سے پہلے اس نے ایک
 ضروری کام یہ کیا کہ اپنی بارہ سالہ بیٹی لیری کو جو اس کے پاس
 چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھی، اس کی ماں کے پاس بھی فوراً
 پہنچ دیا۔ کلیرنس اس کی دوسری بیوی تھی جس سے طلاق ہو چکی
 تھی۔

واشنگٹن انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے باہر آ کر ڈینی نے ایک
 کار کرائے پر لی اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد ایجنسی کے ہیڈ کوارٹر
 لینکلن پلجنگ گیا۔ مختلف سیکورٹی سیریز سے گزر کر وہ چھٹی منزل
 پر پہنچا جہاں ڈینی ڈائریکٹر آپریشنز (DDO) کا آفس تھا۔
 ڈکسن ہیڈ نے اسے اٹھ کر ڈینی کا استقبال کیا۔
 ”ہمیں بہت خوشی ہے کہ تم نے عارضی طور پر یہاں کام
 کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“ ہیڈ نے اس سے کہا۔
 ہیڈ نے اسے ان آپریشنز کی تفصیلات بتائیں جو نیو
 میڈرڈ، ویانا میں ناکام ہو گئے تھے۔ ہر اس شہر میں کسی ریٹائرڈ
 ایجنسی ایجنٹ کی موجودگی کے شواہد بھی ملے۔ گھنٹوں کے دوران
 ہیڈ نے بتایا۔ ”پانچ سال پہلے ایک تفصیلی تفتیش کے بعد
 تقریباً وہاں سوئیتزر ایجنٹس کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا
 تھا۔“

”میں جانتا ہوں تم محب وطن ہو۔ امریکا کی خاطر میری
 جی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے اس کی بیوی نے تو شام کو واپس
 آتا ہوتا ہے۔ اس نے دروازے کے پاس بچ کر پوچھا۔
 ”کون ہے؟“
 جواب میں آواز آئی۔ ”پوسٹ میں۔۔۔ ایک ضروری
 عطا رہا ہے۔“
 رابرٹ نے خفیہ سوراخ سے باہر جھانک کر دیکھا تو پوسٹ میں ہی
 تھا جس نے مخصوص طریقہ کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ اس نے
 دروازہ کھولا تو پوسٹ میں نے ایک قلم درجہ رکھنے کے لیے دیا۔
 جب قلم واپس کیا گیا تو پوسٹ میں نے اپنے چڑے
 کے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا پتول نکالا اور رابرٹ پر دو
 گولیاں قاز کر دیں۔ رابرٹ زمین پر گر پڑا اور تکلف کی
 شدت سے بے ہوش ہو گیا۔

لیری گیس نیویارک سے کینیڈا جا رہا تھا۔ منزل کے
 آخری حصے میں اس نے ایک بیلی کا پتہ کر کے لیا جو اس وقت
 شمالی کینیڈا کے علاقے میں ایک دریائی خشک کیمپ کی طرف
 جا رہا تھا۔ پائلٹ نے بچے کی جانب اشارہ کیا۔
 ”بیلی کیمپ“ بلیک ویل“ ہے۔“ پائلٹ نے بیلی کا پتہ کر
 ایک صاف جگہ پر اتارا۔
 لیری نے نیچے اتر کر دھڑا دھڑا نظر دوڑائی تو اسے جب نظر
 آئی جو اسے منزل پر لے جاتی۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد
 لیری کو درختوں کے جھنڈے پار ایک کالج نظر آیا۔ لیکن وہاں کوئی
 موجود نہیں تھا۔
 سڑکیوں سے نیچے دو باکے کنارے اسے ایک فحش نظر
 آتا جو ایک چھوٹی بوٹ کی صفائی کر رہا تھا۔ لیری نے وہاں پہنچ
 کر پوچھا۔
 ”دیکھو تیرے کہاں ہے؟“
 جواب ملا۔ ”ڈینی دریا میں اوپر کی خشک کے لیے گیا ہوا
 ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہاں لے جاسکتا ہوں۔“
 لیری بوٹ میں سوار ہو گیا۔ دریا میں ایک میل کے سفر
 کے بعد کنارے پر لیری نے ایک شخص کو کھڑے دیکھا جو چھٹی
 کی راڈ سے شکار میل رہا تھا۔ لیری بھی کنارے پر اتر گیا اور
 قریب پہنچ کر آواز دی۔
 ”ڈینی اچھے سے ضروری بات کرنا ہے۔“
 ”مجھے تمہاری بات سے دلچسپی نہیں ہے۔“ ڈینی نے
 کہا۔

ڈینی ایسا تھا کہ ان لوگوں نے اپنا کوئی گروپ بنایا ہے جو
 ہمارے آپریشنز کو برادر کر رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ
 ہمارے ایجنسی کے اندر سے کوئی شخص اس گروپ کو معلومات
 پہنچا کر رہا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس گھر کے عجیب کو تلاش
 کر کے اس کا نام بتاؤ۔ باقی کام ہم کر لیں گے۔ گروپ کو
 کوئی پتہ نہ رہا ہے، اس بارے میں بھی معلومات درکار ہیں۔“
 ڈکسن نے کہا۔ ”میں کچھ عرصے کے لیے واپس آنے کو
 چاہوں لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔ مجھے فری ریڈر چاہیے کہ میں
 چاہوں اور جس کے بارے میں تفتیش کروں، اس میں
 چاہاں چاہوں نہیں ہوگی۔ تنخواہ میں وہی لوں گا جو ایک سینئر آفیسر
 کو ملتا ہے لیکن ان باتوں کی تین دہائی میں ڈائریکٹر سی آئی
 کوئی بے یقینی میں اس کی رہائی سننا چاہتا
 ہے۔ بروکس چارڈن کے آفس میں اس کی رہائی سننا چاہتا
 ہے۔“ ڈینی نے کہا۔
 اگلے ہفتے کے دوران ڈینی نے درجنوں میں لینکلن سے
 کچھ قلم پر ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ فلیٹ فون بھی لگ گیا
 اور ایجنسی سے آنے جانے کے لیے کار بھی فراہم کر دی گئی۔
 ڈینی نے خشک کیمپ میں فون کر کے اپنا پتہ اور فون نمبر تائب کو
 نوٹ کر دیا تاکہ ایمریجنسی کی صورت میں رابطہ کیا جاسکے۔
 چند روز بعد وہ اپنے ایک پرانے ساتھی سام گرین سے
 ملنے اس کے فلیٹ پر گیا۔ سام جاسوس سیٹلائٹس کے شعبے میں
 کام کرتا تھا۔ گھنٹوں کے دوران ان سابق ایجنٹس کا ذکر بھی آیا
 جن کو ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ ان میں مختلف شعبوں کے
 اہلکار شامل تھے۔ یقیناً بہت سے ایجنسی سے ناراض
 بھی ہوں گے۔ موجودہ ڈائریکٹر اس وقت ڈینی ڈائریکٹر تھا۔
 ڈینی نے کہا کہ اب بھی کچھ سینئر لوگ ایجنسی میں موجود ہیں۔ ان
 میں سے ہی کوئی ایک یہاں کی اندرونی معلومات اس گروپ کو
 فراہم کر رہا ہے۔

”آج رات میں ایک پارٹی میں جا رہا ہوں۔ تم بھی
 ساتھ چلو۔ شاید کوئی کام کی باتیں بتا چل جائیں۔ یہ پارٹی
 روز لین کے گھر ہے اور وہاں زیادہ تر ایجنسی کے لوگ ہی موجود
 ہوں گے۔“ سام گرین نے ڈینی سے کہا۔
 سام کی کار میں دونوں روز لین کے گھر پہنچ گئے۔ پارٹی
 میں اچھم تھا۔ سب لوگ لطف اٹھا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈینی
 کو ایک خوبصورت خاتون پر بڑی جوش و خروش کا ایک شخص
 کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ ڈینی اس خاتون کے سیاہ بالوں اور
 بڑی ناک آنکھوں سے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے سام سے
 اپنا۔ ”یکون ہے؟“
 ”اس کا نام جولی ٹولس ہے۔ اس کے ساتھ جو شخص ہے،

وہ ترک رہا کس ہے جو ایجنسی کے ڈی ڈی ڈی میں کام کرتا
 ہے۔“ سام نے بتایا۔
 ڈینی اپنا جام لے کر بالکونی میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کو
 کسی نے پیچھے سے غائب کیا۔ ”کیا تم ہمارے گھر رہے ہو؟“
 ”نہیں۔ میں گزشتہ سال کے سال کے رہا ہوں۔“ ڈینی
 نے مرکز پر جواب دیا۔
 یہ وہی خوبصورت خاتون تھی۔ دونوں نے ایک
 دوسرے سے تعارف حاصل کیا اور اندر ہال میں ڈانس شروع
 کر دی۔ کچھ گھنٹوں کے دوران ڈینی کو معلوم ہوا کہ یہ خاتون ایجنسی
 کے ایک آفیسر کے شعبے میں کام کرتی ہے۔ دونوں نے فون
 نمبر کا تبادلہ بھی کیا۔
 دوسرے روز ڈینی کیاریہ بچے کے قریب ملاقات کے
 لیے ہیڈ کے آفس پہنچ گیا۔ ”مجھے ان لوگوں کے بارے
 میں معلومات چاہئیں جن کو بڑی تعداد میں ایک ساتھ ایجنسی
 سے نکالا گیا تھا۔“ اس نے کہا۔
 ”ان میں سے اکثر لوگ بالی بھونائیوں میں ملوث تھے
 اور خفیہ معلومات ان لوگوں کو فروخت کر رہے تھے جہاں سے
 زیادہ رقم ملنے کی امید تھی۔“ ہیڈ نے لے لیا۔
 ”مجھے ان آفیسرز کی مکمل فہرست چاہیے۔ مزید یہ کہ اس
 واقعے کے بعد ڈائریکٹر نے استعفا دے دیا اور اس کی جگہ
 چارڈن ڈائریکٹر بنایا گیا۔“ ڈینی نے کہا۔ ”مجھے تک روز کی
 فائل بھی چاہیے تاکہ میں دیکھ سکوں کہ مقام سے اپنے کام کا
 آغاز کروں۔“ ڈینی نے مزید کہا۔
 ڈینی اور جولی کی ملاقاتیں بدلتی گئیں۔ جولی نے بتایا کہ
 وہ وزارت خارجہ کے ایک آفسر کی بیٹی ہے جو ملازمت کے
 دوران دنیا کے مختلف ممالک کی ایمریجنس سہولتیں فراہم کرتا رہا۔ اس
 طرح جولی نے دنیا کی کئی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا جن میں
 روسی، چینی اور مشرقی یورپ کے کئی ممالک کی زبانیں شامل
 تھیں۔ اسی طرح ڈینی نے اپنی فلیٹ کے بارے میں بتایا کہ اس
 کا تعلق ایک آئرش خاندان سے ہے۔ اس کی والدہ حیات ہیں۔
 صبح جب وہ گہری نیند میں تھا، فون کی آواز سے اس کی
 آنکھ کھلی۔ دوسری طرف اس کا نائب کینیڈا سے بات کر رہا تھا۔
 اس نے بتایا۔ ”تمہاری سابقہ بیوی بہت پریشان ہے۔ اسے
 فوراً فون کرلو۔“
 ڈینی کو کبھی کا خیال آیا کہ شاید وہ بیمار ہے۔ اس نے
 کلیرنس فون کیا۔ ”کیا بات ہے؟“ ”خیریت تو ہے؟“
 ”کیمری کل اسکول میں آئی اور گھر واپس نہیں آئی ہے۔“
 میں نے اس کی دوستوں کے گھر بھی فون کر کے معلومات

www.parihlo.com

مائل ہیں لیکن کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا۔ میں نے پولیس میں بھی رپورٹ درج کروادی ہے۔ وہاں سے چن لوگ آئے تھے اور کسی کارروائی کر کے پلے گئے۔ انہوں نے کہا کہ اڑتا نہیں گئے انتظار کریں، پھر دیکھیں گے۔ ڈینی اب تم ہی کچھ کرو۔

اس نے بتایا۔

”مگر نہ کرو۔ میں اگلی ملاقات سے کیلی فوریا پہنچ رہا ہوں۔“ ڈینی نے جواب دیا۔

سفر کے دوران ڈینی سوچتا رہا کہ اس کی بیٹی کو کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ ابھی تک کسی نے تاربان کے لیے بھی ٹون نہیں کیا تھا شاید اس کے لیے وہ رنگ ہو کر وہ جو کام کر رہا ہے، اسے روک دے اور مزید تفتیش نہیں کرے۔

آفس پہنچ کر ڈینی سیدھا ہیڈ لے کے آفس میں گیا اور اس کو یہ صورت حال بتائی۔

”مجھے سچ اعدادہ نہیں ہو رہا کہ میری بیٹی کے اغوا کے پیچھے کون لوگ ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ روٹی کے جی بی، برخواست شدہ ایجنسی کے ایجنٹ یا ایجنسی میں سے کوئی خاص شخصیت اس جرم کے ذمہ دار ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ہیڈ لے نے تعین دلایا کہ ایجنسی کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے۔ ”لیکن کوئی تو ہے جو یہ چاہتا ہے کہ جو کام کر رہے ہو اس کو روک دو۔“ اس نے کہا۔

”جی ہاں کارروائی کے طور پر میں بھی کر سکتا ہوں کہ اس کام کو جاری رکھوں تاکہ میری بیٹی کی جان محفوظ رہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ڈینی اسی شام کیلی فوریا پہنچ گیا۔ اس نے کلیرنس کو تسلی دی کہ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ کیری کی جان کو نقصان نہ پہنچے۔ اس نے پولیس کے افسران سے بھی ملاقات کی۔ اس کو بتایا گیا کہ کیری کی سائیکل ایک نمبر کے کنارے سے لی ہے۔ مزید تفتیش جاری ہے۔

ڈینی دو روز کے بعد واپس نیویارک آ گیا۔ جولی سے ملاقات کے دوران اس کو بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ جولی نے بھی یہ بات کہی کہ شاید تمہاری بیٹی کے اغوا کا تعلق اس کام سے ہے جو تم ایجنسی کے لیے کر رہے ہو۔ کوئی گروپ یہ چاہتا ہے کہ یہ کام بند کر دیا جائے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری بیٹی جلد ہی خیریت مل جائے۔

ڈینی نے دیا پینچ کر آپریشن ”اس کا لی لارک“ کے کس آفیسر سے ملاقات طے کی۔ اسی سلسلے میں وہ اس وقت کلاک میوزیم میں موجود تھا۔

”کے جی بی نے ہر ایجنسی میں اپنے جاسوسی آلات

لگائے ہوئے ہیں اس لیے میں نے ملاقات کے لیے اس کا انتخاب کیا۔ تم کل ایجنسی میں آکر اس کیس فائل کا مطالعہ کر سکتے ہو۔“ میڈلر نے بتایا۔

ڈینی نے اگلے روز وہ فائل تفصیل سے دیکھی۔ ہر معلومات نوٹ کیں۔ جس ایجنٹ کو گولیاں ماری گئی تھیں، ہر اب واصل چیز استعمال کرتا تھا۔ ڈینی اس کا ایڈریس نوٹ کر کے دوسرے دن صبح اس کے گھر پہنچ گیا۔

اس کی بیوی نے دو روزہ کھولا اور بتایا کہ اس کا شوہر بیمار ہے۔ اسے زیادہ پریشان نہ کیا جائے۔

راہبٹ اسٹائن ایک ادیب اور عمر کا بوڑھا شخص تھا جو کمرے کے پاس واصل چیز پر بیٹھا تھا۔

”یقیناً کوئی اہم بات ہوئی جو تم نے واسطی سے دیا تاکہ سز کیا ہے۔“ اس نے ڈینی سے کہا۔

”میں تم سے ذاتی طور پر مل کر تفصیل جانتا چاہتا ہوں کہ یہ آپریشن کیسے ناکام ہوا۔“ ڈینی نے کہا۔

”انہوں نے مجھے گولیاں مار کر زندگی بھر کے لیے معذور کر دیا اور تم پوچھ رہے ہو کہ کیا ہوا۔ میں وہ کپیوٹر چرچ نظر کیا حاصل کرنے والا تھا۔ ایک رات پہلے مجھے دونوں ٹانگوں میں گولیاں ماری گئیں۔“ اس نے بتایا۔

”ہاں، میں نے پوری فائل پڑھی ہے۔ مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ چیک سفارت خانے کی وہ سیکرٹری ایر ولفٹ کی ملاقات سے ماسکوراؤنڈ کر دی گئی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ جس گمن سے گولیاں چلیں، کیا اس پر سائلٹر لگا ہوا تھا؟“ ڈینی نے پوچھا۔

”نہیں، وہ ایک عام بینڈ گن تھی لیکن فائر کی کوئی آواز میں نے نہیں سنی۔ یقیناً یہ عجیب بات تھی۔ شاید اس میں کوئی مخصوص گولیاں استعمال کی گئی تھیں۔“ اس نے کہا۔

ڈینی نے سوچا کہ جانے دوچہ کا جائزہ لیتا چاہیے۔ وہ چیک ایجنسی کے سامنے سے بھی گزرا اور اس کے بعد وہ میٹروپولیٹن میوزیم میں کٹ کے داخل ہو گیا۔ اس دوران بھی وہ اس کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ میوزیم کی سیر کے دوران کوئی نئی بات ذہن میں نہیں آئی۔

وہ واپسی کے لیے بچے آنے لگا۔ چانک ایک بوٹی سی عورت اس کو دکھا رہی تھی آگے بڑھ گئی۔ جینین دیر میں ڈینی سنبھلا، وہ عورت زمین سے مرکز غائب ہو چکی تھی۔

اسے اعدادہ ہوا کہ اس کی جیب میں کوئی مڑا ہوا کاغذ ڈالا گیا ہے۔ وہ جلدی سے باہر آیا تاکہ اس عورت کو پکڑ سکے۔ کچھ دور وہ مٹی عورت بھاگتی نظر آئی۔ اس دوران اس نے دگ اور

ہر ایک کو چیک دیا۔ اب ایک مونا سا آدمی سوٹ پہنے ہر ایک میں داخل ہو رہا تھا جو فوراً ہی روانہ ہوئی۔ ڈینی ایک بار بار میں جیب کے آخری تین عدد دیکھ سکا۔

مونا کی جیب سے کاغذ نکلا۔ بینڈ رائٹنگ دیکھ کر اسے ڈینی نے جیب سے نکالنا تھا۔ ڈینی نے پلیرز ایک لوگ جو کہ رہے تھے کیری کا نام تھا۔ آخری لائن کسی اور ہاتھ کی لکھی تھی۔ ”آگرم اپنی بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس خط سے باز آؤ۔ زندہ رہنا سچ کے فوے وارنٹ خود ہو گے۔“

ڈینی نے واسطی پہنچ کر ہیڈ لے کو فون کیا۔ ”آج ہفتہ ہے لیکن میں تم سے گھر پر ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ غصی تھا اس کے گھر پہنچ گیا۔

”میرے پاس بھی تمہارے لیے کچھ خبریں ہیں۔“ ہیڈ لے نے کہا۔ ”دیا نام سے میرے پاس ایسٹورڈ کی خفیہ ایجنسی کا فون آیا تھا کہ آسٹین پولیس نے وہ کار تلاش کر لی ہے جس کے آخری تین ہندسے تم نے دیے تھے۔ یہ کار ایک شخص اڈو ہاس کی ہے۔ یہ شخص کے جی بی کا ایک معمولی مہرہ ہے اور رقم کی خاطر چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔“

”یہ بات تو ملے ہوگی کہ میری بیٹی کے اغوا کے پیچھے زمین کا ہاتھ ہے تاکہ مجھے پروا نہ ڈالا جاسکے لیکن جواب ان کو باؤ میں رکنا چاہتا ہوں اور جو کام میں کر رہا ہوں، اس میں لا رہوں۔“ ڈینی نے کہا۔ ”میں دیا نام اسٹائن سے ملا تھا۔ اس شخص گن سے فائر کے گئے تھے، اس میں سائلٹر نہیں لگا ہوا تھا لیکن فائر کی آواز پھر بھی نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دارت میں خصوصی گولیاں استعمال کی گئی تھیں اور یہی آپ جانتے ہیں ایسی گولیاں ہی آئی اسے نے ایک خفیہ پروڈیجکٹ کے تحت تیار کی تھیں۔ یہ یقیناً اس گروپ کے کسی ممبر کا کام ہے جس کے لوگوں کو ایجنسی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ یقیناً اس کے پاس یہ گولیاں موجود تھیں۔ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایجنسی کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ دیا نام کیا آپریشن پلان کیا گیا ہے۔ گروپ کے لوگوں نے اس بات کو آخر تک خفیہ رکھا اور آسٹین کو کچھ وقت پر بتایا جس کے نتیجے میں رابرٹ کو گولیاں ماری گئیں اور چیک ایجنسی کی اس سیکرٹری کو دوسرے ہی دن ماسکوراؤنڈ کر دیا گیا۔ ایک اور مفید یہ تھا کہ ایجنسی کو دیا نام کیا جانے اور پریس کے ذریعے یہ انہماک کی حد تک بھی پہنچ جائیں۔“ ڈینی نے مزید کہا۔

”جی بی آفس میں ڈینی نے اس کیس کا مطالعہ کیا جس میں ملازمت سے نکالے جانے والے ایجنٹس کے نام تھے۔ اس نے ایک نام منتخب کیا اور اس سے ملاقات کے لیے روانہ

ہو گیا۔ سیکرٹری ایک بار میں شامل کرتے ہوئے لانا۔

”میں کچھ کنٹریکٹ حاصل کرنا چاہتا ہوں جس سے اچھی آمدنی ہو جائے۔ کیا گروپ میری مدد کرے گا؟ میں کس طرح ان سے رابطہ کروں؟“ ڈینی نے کہا۔

”اگر وہ چاہیں تو خود رابطہ کرتے ہیں۔ اگر چاہو تو لو موٹ سے بات کر کے دیکھو۔“ سیکرٹری نے کہا۔

لو موٹ سے ڈینی کی ملاقات اس کے نام کے پاس پر ہوئی۔ ”گروپ نے مجھے بھی چار سال پہلے کنٹریکٹ کی آفر کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔“ اس نے بتایا۔

”پلیز اچھے کوئی راستہ بتاؤ۔ میری مالی حالت اچھی نہیں ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم ہالٹ سے ملاقات کر کے دیکھو۔“ لو موٹ نے کہا۔ ”وہ جارج ٹاؤن میں رہتا ہے۔ یہ گروپ کی اسکریننگ کیٹی کا ممبر ہے۔“

”لیکن ان کا لین رکن ہے؟“ ڈینی نے پوچھا۔

”اصل طاقت وہ اسٹائن لائٹر کے پاس ہے۔“ لو موٹ نے کہا۔

”یہ کہاں رہتا ہے، مجھے تو معلوم نہیں۔“ ڈینی بولا۔

”شاید بنگی بریوولی کچھ بتا سکے لیکن میرا نام درمیان میں نہیں آتا چاہیے۔ میں اپنی جلی کے ساتھ پراسن زنگی گزار رہا ہوں۔“

جارج ٹاؤن میں ڈینی کی بھی سے ملاقات کوئی نتیجہ نہیں رہی۔ لائٹر کی ہائش کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں چلا سکا۔

ہیڈ لے کے آفس میں یہ ساری باتیں زیر بحث آئیں۔

”لائٹر کو تلاش کرنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“ ڈینی نے کہا۔ ”ایجنسی کے آپریشن میں ہونے والی خرابیاں، جمیدی ایجنٹ کی شناخت اور میری بیٹی کے اغوا کے معاملات کے حل کے لیے میرا لائٹر کچھ ضروری ہے۔“

”اس سلسلے میں تمہیں دفتر خزانہ سے معلومات کرنا ہوں گی کہ اس کے ریٹرنمنٹ چیک ہر مہینے کہاں کیش ہوتے ہیں۔“ ہیڈ لے نے کہا۔

ایک طویل طریقہ کار کے بعد ڈینی کو کامیابی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ لائٹر کے کیشن چیک کی ادائیگی زیورخ، سوئٹزرلینڈ کے بینک میں کی جاتی ہے۔

ڈینی نے فوراً سوئٹزرلینڈ جانے کا پروگرام بنالیا۔ زیورخ پہنچ کر اس نے ٹیکس ٹولبر سے ملنے کے لیے درجائے لمات کے کنارے ایک بھولوں کی دکان کو تلاش کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ ٹولبر سے اس کی ملاقات چھ سال پہلے ایک ہونین

تفصیل بہت واضح تھی۔ ایک تصویر میں چھت پر بنے ہوئے کمرے اور اس کے لاک کی واضح تفصیل تھی۔ ڈینی یہ تصاویر لے کر اور اپنی ضرورت کے سامان کی لسٹ کے ساتھ اس سیکشن میں پہنچ گیا جس کا نام ڈائریکٹر آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی تھا۔

”مجھے اس تالے کی چابی کی نقل چاہیے اور یہ سارا سامان بھی جو میں نے لسٹ میں لکھا ہے۔“ ڈینی نے کہا۔ ”مجھے ایک ڈارٹ گن بھی چاہیے جس کے ذریعے ڈور میں کسے کو کم از کم ایک گھنٹے کے لیے بے ہوش کیا جاسکے۔ آخری آٹم ایک برہنہ شیٹ چاہیے جس میں آدھے انچ کے برابر قطر پر سوراخ بنے ہوں۔ یہی شیٹ سب سے اہم ہے اور میری زندگی کی ضمانت ہوگی۔“ ڈینی نے مزید کہا۔

واشنگٹن میں ڈینی کا زیادہ وقت جولی کے ساتھ ہی گزارنا تھا۔ دونوں کے تعلقات بڑھتے جا رہے تھے۔

آخر کار عمل تیاری کے بعد ڈینی ایک مرتبہ پھر زیورنگ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک غیر معروف ہوٹل میں کمرہ ایک کر لیا۔ اس نے آڈی کار گرائے پر لی۔ بازار سے ایک ایلیمنیم کا آئینہ ٹیک خرید کر اسے بھر دیا۔ سارا ضروری سامان کارڈ کی ڈکی میں محفوظ کر دیا اور زیورنگ لیک کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ سورج کی روشنی میں صورت حال کا جائزہ لے سکے۔

اس جھیل کی چوڑائی، لمبائی سے کچھ۔ دور بین کے ذریعے اس نے جھیل کے مخالف کنارے پر ڈھلن لائٹر کے قلعہ نما گھر کا جائزہ لیا۔ یہ گھر تین اطراف سے حفاظتی دیوار میں محفوظ تھا لیکن جھیل کے کنارے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی۔

ہر طرح سے مطمئن ہو کر ڈینی واپس ہوئے کمرے میں پہنچ گیا۔ رات کا کھانا جلدی کھا کر وہ آرام کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے اپنے موبائل پر رات ایک بجے کا الارم لگایا لیکن نیند بھر بھر اسے نہ سنا سکی۔ ایسا لگا کہ الارم غورانی نہ کیا ہو۔

ڈینی اٹھ کر تیار ہوا اور اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اس مشن میں کافی خطرہ تھا لیکن اپنی بیٹی کی رہائی کی خاطر اس نے ہر خطرے کا سامنا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لائٹر کے گھر کے قریب جھیل کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں ڈینی نے گاڑی روکی اور کپڑے اتار کر راکٹ ڈائیونگ سوٹ پہن لیا۔ جھیل میں تیرنے والے جوئے پہن کر آئینہ ٹیک کمر پر باندھا اور جھیل میں اتر گیا۔ اس کا تمام ضروری سامان اس کے جسم پر بٹھا ہوا تھا۔

بارہ فٹ کی گہرائی میں پہنچ کر اس نے لائٹر کے گھر کی سمت تیرنا شروع کر دیا۔ کنارے پہنچ کر اس نے گھر کی

طرف چلنا شروع کر دیا۔ پورے چاند کی روشنی میں سفر شروع نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ تین سیاہ اجسام اچھری سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ ڈور میں کسے جتنے جن کی لیر پلنگ ہوئی ہے کہ خاموشی سے اپنے شکار پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

وقت بہت کم تھا۔ آگے آنے والا کتا ڈینی پر حملہ کرے والا تھا جب اس نے ڈارٹ گن فائر کی۔ وہ اس کے پیچوں کے قریب گر کر بے ہوش ہو گیا۔ دو سیکنڈ بعد اس نے دوسرا ڈارٹ دوسرے کتے پر بار دیا۔ یہی حشر تیسرے کتے کا بھی ہوا۔

ڈینی نے آئینہ ٹیک اور ڈائیونگ سوٹ اتار دیا اور ضروری سامان کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لائٹر کے گھر کی چھت کا ایک حصہ بقیہ حصے سے ذرا نیچا تھا۔ ڈینی نے چھت پر جانے کے لیے اس مقام کو ہی چنا تھا۔ چھت پر پہنچ کر ڈینی نے اوپر والے کمرے کے دروازے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا اور خاموشی سے لاؤنج میں پہنچ گیا۔ اسے تلاش کی کہ ٹیپ کہاں محفوظ کئے گئے ہیں۔

میکل کا مجسمہ کمرے کے وسط میں رکھا ہوا تھا۔ ڈینی نے بہت احتیاط کے ساتھ سوراخوں والی ربریش کو پیش کی سلاخوں میں لگا دیا تاکہ وہ آہٹیں نہیں ٹکرا کر خون پیدا کریں پھر اس نے مجسمے کا نیچے کا ٹیپ کھولا۔ اس خانے میں ایک ہی ٹیپ رکھا ہوا تھا۔

ڈینی نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا ریکارڈنگ ٹکالا اور وہ ٹیپ اس میں لگا دیا۔ چند سیکنڈ میں تیز رفتاری کے ساتھ اس نے اپنے ریکارڈنگ کے ٹیپ میں اس گفتگو کی کاپی تیار کر لی۔ ٹیپ واپس اسی جگہ پر رکھ دیا اور احتیاط سے ربریش اتار کر واپس کی راہ اختیار کی۔

جھیل کے کنارے پہنچ کر ڈینی نے جلدی جلدی ڈائیونگ سوٹ پہنا۔ تینوں کتوں نے ہلنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ہوش میں آنے میں بہت کم وقت بچا تھا۔ اس نے ان کے جسم سے ڈارٹ نکالے اور جھیل میں اتر کر تیرنا شروع کر دیا۔ لائٹر کے گھر میں کبھی کبھی پتا نہیں چلتا تھا کہ کون آیا تھا۔

واشنگٹن پہنچ کر ڈینی نے اپنے ایک پرانے ساتھی سے ملاقات کی جو انجینی سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ یہ شخص کپڑوں کے استعمال کا ماہر تھا۔ ڈینی نے اسے ٹیپ دیا کہ اس کو چیک کرے۔ اس شخص نے ٹیپ اپنے ریکارڈنگ میں لگا کر چلایا تو ایک خاتون کی آواز میں ایک پیغام تھا۔ اس خاتون کا لہجہ ہکلاہٹ کا شکار تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آواز کیپڈر کی مدد سے تبدیل کی گئی ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔“ انجین نے کہا۔

مٹی جتنے کی جنت کے بعد ٹیپ دو بارہ چلایا گیا تو اس میں ایک مرد کی آواز تھی۔ ڈینی یہ پیغام سن کر حیران رہ گیا۔ وہ پتہ نہ لگا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ اس کے اب تک کے بیان اعجاز سے غلط ثابت ہو چکے تھے۔

سینئر لیڈ کے مشہور اسکی ریزروٹ، برف پوش ”اسنگر“ کے کپیل کا راکیشن میں دو افراد انتظار کر رہے تھے۔ اسکیٹنگ کا سرخ لباس اور گاٹر پہنے لیے قدمائے شخص نے سنبھل چھوئے قدم اور ڈور بھاری جسم کا ہونے تھے۔ دوسرا شخص سنبھل چھوئے قدم اور ڈور بھاری جسم کا ہونے تھے۔ پلے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ دونوں کے کاندر صوفی خاندان کے بچے کی شکل تھی۔ کپیل کا راکیشن زکوسات ہزار فٹ کی پراکٹر لگی ہوئی تھی۔ وہاں سے یہ لوگ اسکیٹر کے ذریعے نیچے آتے تھے۔

جیسے ہی ایک سرخ رنگ کی کپیل کار آ کر رکی، دونوں افراد اس میں سوار ہو گئے اور کار کے سفر شروع کر دیا۔ پتہ قدمائے شخص کا نام ایسی پاؤنٹ تھا اور یہ روسی جاسوس انجینی کے جی بی کاپی تھا۔

اس نے دوسرے شخص سے کہا۔ ”مینگ کے لیے تم نے بہت اچھی جگہ چنی ہے۔ یہاں نہ ہمارے گاؤں ہیں اور نہ کوئی اور سٹن والا ہے۔“

”تمہارا شکر یہ کہ تم اس ملاقات کے لیے آ گئے۔“

فول فامٹ شخص نے کہا۔ یہ شخص امریکی سی آئی اے کا ڈائریکٹر بروکس جارجون تھا۔

یہ دونوں جاسوسی کی دنیا میں طاقتور ترین اشخاص تھے۔ کسال پہلے ان دونوں کی ملاقات جرمنی میں ہوئی تھی۔ جب سے یہ دوستی چل رہی تھی۔ دونوں برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے کو حساس معلومات فراہم کر رہے تھے۔ جارجون نے ”گروپ“ کی مدد سے جو تازہ کارروائیاں کی تھیں، ان کو پاؤنٹ نے اپنے کھاتے میں ڈال کر روسی یولٹ ہیرو میں اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم کر لیا تھا۔ موجودہ روسی صدر پوری کیلین بھی اس سے مطمئن تھا۔

”تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے؟“ جارجون نے پاؤنٹ سے کہا۔ پاؤنٹ نے جیب سے ایک سفید رنگ کا لفافہ نکال کر جارجون کو دیا۔ ”اس میں ہمارے SS-18 میزائل کی ڈرائنگس ہیں۔ ہمارے پاس ایسے تین سو میزائل ہیں۔“

جارجون نے وہ لفافہ جیب میں رکھ لیا۔

”امریکی صدر کی نظر میں تمہاری پوزیشن مزید بہتر ہو جائے گی۔“ پاؤنٹ نے کہا۔

جارجون کی پریشانی یہ تھی کہ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ

امریکی صدر کے اطراف لابی کا ایک گروپ اس کا مخالف تھا اور اسے ڈائریکٹر شپ سے ہٹانا چاہتا تھا۔ پاؤنٹ نے اسے اطمینان دلایا کہ اگر وہ صرف ہم دونوں کا باہمی تعاون دونوں کی ذات کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

”آئندہ ملاقات میں، میں تمہیں روسی لیڈر کی تفصیلات دے سکوں گا۔“ پاؤنٹ نے کہا۔

جارجون جانتا تھا کہ اس فیڈ میں روس، امریکا سے کافی آگے تھا۔

جارجون حیرت زدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ کوئی شرط بھی شامل ہے؟“

”امریکی سی آئی اے کے روسی صدر کیلین کو قتل کرنا ہوگا۔“ پاؤنٹ نے جواب دیا۔

”لیکن مجھے یہ سوا بہت ہنگامہ لگتا ہے۔ یہ ایک ناممکن کام ہے۔ ذرا سوچو، اگر یہ کوشش ناکام ہوگی تو تیسری عالمی جنگ شروع ہو سکتی ہے۔ اس کے نقصانات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔“

”اسکی کوئی بات نہیں ہوگی بلکہ دونوں بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے مزید ترقی کر سکتی ہیں۔“ پاؤنٹ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر انجینی یہ کام کرے گی تو تمہاری جانب سے معلومات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ میں یہ یقین دہانی چاہتا ہوں۔ مزید یہ کہ چین کی سرحدوں پر اپنا ہوا کھم کرانے میں بھی تم مدد کرو گے۔“ جارجون نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ تم سے میرا وعدہ ہے۔ ہم اس آپریشن کا نام ”آپریشن دہلیکی“ رکھتے ہیں۔ دہلیکی، یوکرین میں وہ جگہ ہے جہاں لیکن پیدا ہوا تھا۔“ پاؤنٹ نے کہا۔

اس دوران کپیل کار بھاری چوٹی تک پہنچ چکی تھی۔ دونوں افراد اتر کر ایک دوسرے سے خائف ست میں روانہ ہو گئے۔

واشنگٹن پہنچ کر ڈینی نے جولی کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کام سے ملک سے باہر گئی ہوئی ہے۔ ڈینی نے انجینی کے ڈائریکٹر کے آفس فون کر کے اس سے ملنے کا ایسا سکنٹ لیا۔ صبح دس بجے وہ ڈائریکٹر جارجون سے ملنے کے لیے اس کے آفس میں داخل ہوا۔

”میں نے بعیدی انجینٹ کو تلاش کر لیا ہے۔“ ڈینی نے بتایا۔

”وہ کون ہے؟“ جارجون نے پوچھا۔

”اس سوال کا جواب آپ ابھی طرح جانتے ہیں۔“

میرے پاس آپ کے تازہ ترین کیسٹ میں آپ کی آواز میں
پیغام موجود ہے جو آپ نے زیور خیمہ بجا تھا۔ ”ڈینی نے کہا۔
جارڈن نے جھپٹ کر سونے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”جیسی میں کوئی
بھید کی ایجنٹ نہیں تھا لیکن ڈکمن ہیلے، ڈیجی ڈائریکٹر کو شک
ہوا کہ کوئی اندر سے ہمارے بیرون ملک آپریشن کی اطلاعات
بائریج رہا ہے اور وہ روسیوں تک بھی پہنچ رہی ہیں اس لیے
تھیں بلایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ایک روسی
ڈیٹل ایجنٹ کو کنٹرول کر رہا ہوں۔ اس کا نام ایلس پاؤلف
ہے جو کہ بی بی کا سربراہ ہے۔“
لیکن تم نے خود کو رپ کو مطوعات فراہم کر کے ایجنسی
کے بیرونی آپریشن کو کام بنایا۔ ”ڈینی نے حیرانی سے سوال کیا۔
”پاؤلف کو کچھ تو دینا ہی تھا۔“ جارڈن بولا۔ ”روسیوں
نے تمہاری بی بی کو کسی ایسے لے آکر کریم پر دبا ڈالا جاسکے۔“
”مجھے اپنی بی بی واپس چاہیے۔ میں تم سے ایک سودا کرنا
چاہتا ہوں۔ اگر ایک ہفتے میں تم میری بی بی کو واپس لے آئے تو
میں خاموشی اختیار کروں گا ورنہ میرے پاس تمہاری غداری
کے ثبوت ہیں، وہ میں میڈیا کو دے دوں گا اور تمہارے لیے
کوئی جائے پناہ نہیں رہے گے۔“ ڈینی نے کہا۔
”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں لیکن اس کام میں چند روز
لگیں گے۔“ جارڈن بولا۔
ایک ہفتہ بعد ڈینی ڈائریکٹر ہیلے نے ڈینی کو فون کیا
اور کہا کہ میں تم سے واٹس ایپ پر ایک پارک میں شہر کے جنگل کے
پاس ملنا چاہتا ہوں۔ ڈینی مقررہ وقت پر پارک پہنچ گیا۔
”یہ جگہ محفوظ اور پرائیویٹ ہے۔ ہماری بات چیت کوئی
نہیں سن سکتا۔“ ہیلے نے کہا۔ ”میں نے آپریشن آپریشن
سیکشن سے تعلق رکھتا ہوں۔“ ڈینی نے کہا۔ ”اس سیکشن کا
محلے کا کوئی لگاؤ۔“ ہیلے نے ڈینی سے کہا۔ ”اس سیکشن کا
کوئی ایجنٹ ملک سے باہر بھیجا گیا ہے اور وہ مزید طور پر سرکس
کے سرخسے کی ٹریننگ لے رہا ہے۔ مجھے اس ایجنٹ کا نام نہیں
معلوم۔“ ہیلے نے بتایا۔
”میرا انٹریکٹ نو اب ختم ہونے والا ہے۔“ ڈینی نے
بتایا۔
”میرا پریشانی یہ ہے کہ جارڈن اور آپریشن آپریشن کے
لوگوں میں پھیلے ہوئے کسی کوئی مینگ ہوئی ہے۔ ضرور حال میں
کچھ نہ کچھ کالا ہے۔“ ہیلے نے کہا۔
ڈینی نے بھی غور کیا تو ذہن میں یہ بات آئی کہ جارڈن
سے ملاقات کے دوران اس سے کچھ باتیں چھپائی گئی ہیں۔
جارڈن نے کہا تھا کہ ایک دو معاملات مکمل ہو جائیں تو وہ

روسیوں سے اس کی بی بی کے متعلق بات کرے گا۔ اس نے
سوچا کہ شاید اس معاملے کا تعلق بھی میری کی زندگی سے متعلق
اس نے اس معاملے کو دیکھنے کے لیے اپنی آواز کی علامت کر کے
ڈینی نے کوکل پر تلاش کر کے دو تین ساتھیوں کے ساتھ
اسٹارکسز کو فون کیے۔ اسے پتا چلا کہ اس وقت اس کی بی بی
ٹریننگ کے لیے جرمنی کے شہر ہون میں موجود کلاڈن کا
بہترین ہے جسے وہ بھائی چلا رہے ہیں۔ ڈینی نے اپنے ایک
دوست کو سول ایوی ایشن میں فون کیا اور کہا کہ مجھے ان تمام
مسافروں کی فہرست چاہیے جو پچھلے ایک ہفتے میں ہون
(جرمنی) کے سفر پر روانہ ہوئے ہیں۔
فہرست ملنے پر اس نے تین نام منتخب کیے۔ ان میں سے
دو کا تعلق کولمبیا سے تھا اور ایک کانو یارک سے۔ ڈینی بھی جرمنی
روانہ ہو گیا۔ ہون پہنچ کر اس نے کلاڈن کا کال ایڈریس حاصل
کیا اور دو گھنٹے کے ٹرین کے سفر کے بعد اس مقام پر پہنچ گیا۔
کانج بک پائسن کے مقام پر تھا جو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔
وہاں رہائش کا ایک ہی ہوش تھا۔ ڈینی نے ہوش کے استیلاء
کلرک سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے ہاں کوئی مسافر ڈومینک کوب
کے نام سے قیم ہے؟“
”ہاں، یہ لڑکی یہاں کانج کی اسٹوڈنٹ ہے۔ یہاں اور
اسٹوڈنٹس بھی قیم ہیں۔“ کلرک نے کہا۔
ڈینی نے کانج کا راستہ دریافت کیا اور تھوڑی دیر میں
وہاں پہنچ گیا۔ تمام اسٹوڈنٹس ایک کلاس روم میں جا رہے
تھے۔ ڈینی بھی ان کے ساتھ مل کر اندر داخل ہو گیا اور پچھلی
نشستوں کی لائن میں بیٹھ گیا۔
تھوڑی ہی دیر میں ایک مونا ساہتہ قد آدمی اندر داخل
ہوا جس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے آج کی
کلاس کے بارے میں بتانا شروع کیا۔
”میرا تعلق نیو یارک سے ہے، میرا اخبار سے ہے اور میں
سرکس کانج کے بارے میں ایک نیچر لکھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ
مہاجر کون ہیں؟“ ڈینی نے اپنے برابر بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔
”یہ دونوں میں سے چھوٹا بھائی چیکو ہے۔“ لڑکی نے کہا۔
پہلے میک اپ کی ٹریننگ شروع ہوئی۔ آدھے لوگوں
نے سفید چہرے والا میک اپ کرنا تھا اور دوسرے گروپ نے
گلابی میک اپ کرنا تھا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو چیکو نے کہا۔
”اب ہم دوبارہ اس اسکرپٹ کی ریسرچ کریں گے جس میں
چھوڑا سا بی کارول ہے۔“
اتج پر چھ چھوٹا داخل ہوئے اور جوڑی کو کھولنے کی کوشش
کرنے لگے۔ ناکاکی کے بعد ایک نے جیب سے پٹاخوں کا

پٹاخا اور ہاتھ سے اسے آگ دکھادی۔ پٹاخے پھٹنے لگے۔
”جی، دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لو۔“ اور ڈومینک اتم
آگ لگنے پر ہاتھ رکھ لیا۔ چیکو نے کہا۔
ڈینی نے فوراً اس لڑکی کو دیکھا تو اسے کچھ شک ہوا۔
”پولیس مین۔“ ایک اور کلاڈن مصنوعی
چکنے آواز دی۔
پٹاخے اندر داخل ہوا اور فائرنگ شروع کر دی۔ سب چور
پٹولی لے کر اندر داخل ہوئے۔ کلاس نے تالیاں بجا دیں۔
گلاباں اٹھنے سے نیچے گر پڑے۔ کلاس نے تالیاں بجا دیں۔
”بیت اچھا۔ آج کا کام ختم۔ سب لوگ منہ ہاتھ
دھو لیں۔ اب سچ کا وقت ہے۔“ چیکو نے کہا۔
ڈینی خاموشی سے اٹھا اور ڈومینک کے برابر والی کرسی پر
جا کر بیٹھا۔
”ہیلو جولی اتم کسی ہو؟“ ڈینی نے کہا۔
جولی ذرا حیران ہوئی۔ ”ڈینی اتم یہاں؟ باہر آؤ۔ ہم
دونوں جگہ کے لیے قریبی ٹینٹین میں
ہاں بات نہیں کر سکتے۔“
”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ جولی نے پوچھا۔
”مجھے ہیلے نے بھیجا ہے۔ اسے معلوم ہوا تھا آپریشن
آپریشن سیکشن کا کوئی ایجنٹ سرکس کے سرخسے کی ٹریننگ کے
لے بھیجا گیا ہے لیکن یہ تو ایک انتہائی خفیہ مشن ہے۔“ ڈینی نے
کہا۔ ”جولی اتم جانتی ہو یوروپ کے کبھی کان ہوتے ہیں۔“
جگہ کے بعد دونوں واپس کلاس روم میں آ گئے۔ اب
بڑے بھائی روڈ کا لیکچر جس کا تعلق سرکس میں پیش کیے
جانے والے مزاحیہ خاکوں سے تھا۔ اس نے دنیا کے مختلف
لوگوں کے سرخسوں کا ذکر کیا جس میں سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور
آسٹریا کے تاریخی سرکسوں کا ذکر تھا اور بتایا کہ روس میں بھی
سرکس کی پرانی تاریخ ہے۔ اب بھی وہاں کئی مشہور سرکس ملک
کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سب سے
مشہور ”ماسکوسکس“ ہے۔
شام کو جب کلاس ختم ہو گئی تو جولی کی کار میں
ایک ماحولی مقام پر گئی تاکہ دونوں سکون سے بات کر سکیں۔
”تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔“ جولی نے کہا۔
”یقیناً مجھے بھی۔ تمہیں گئے ہوئے اتنے دن گزر گئے
تھے میں اداس ہو گیا تھا۔“ ڈینی بولا۔
”قبائلیں کے تحت مجھے اپنے پاس کو بتانا پڑے گا کہ یہ
میں اب خیر نہیں رہا لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ بھی
نہیں جانتی۔“ جولی نے کہا۔
”مگر نہ بتاؤ۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ دوسری بات یہ
ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپریشن آپریشن وہ ایجنٹ تم ہو۔“

ڈینی نے کہا۔
”میں ایک اور ایجنٹ کرنا چاہتی ہوں کہ ہمارا شعبہ
شروع ہی سے تمہاری عمر کی کر رہا تھا اور اس کے احکامات بڑا
راستہ جارڈن کی طرف سے ملے تھے۔“ جولی نے کہا۔ ”مجھے
انہوں سے، ایجنسی کے ہمارے درمیان شکوک پیدا کر دیے۔“
”مگر تم چاہتی ہو کہ ہمارے درمیان شکوک پیدا کر دیے۔“
شعبے سے پاک ہو جائیں تو میری طرح تم بھی استغاثہ کے دھمک
ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔“ ڈینی نے کہا۔
”میں ابھی ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ میں مجبور ہوں۔“ جولی
نے کہا۔
واشنگٹن واپس پہنچ کر ڈینی اپنے آفس گیا اور پرنس
ڈیپارٹمنٹ میں فون کیا کہ میں جولی کو کس کی فائل دیکھنا چاہتا
ہوں۔ تھوڑی دیر میں فائل آئی اور وہ اس کے مطالعے میں
مصروف ہو گیا۔ فائل سے دو اہم باتیں پتا چلیں کہ جولی اپنے
والدین کے ساتھ کئی سال ماسکوسکس میں رہی اور دوسری بات یہ
کہ وہ ایک ماہر نشانہ باز ہے۔
ڈینی اب ہیلے سے ملاقات کے لیے اس کے آفس
پہنچ گیا۔ ہیلے نے پوچھا۔ ”کیا تم نے سرکس کلاڈن والے
ایجنٹ کو تلاش کر لیا؟“
”ہاں، اس کا نام جولی کوس ہے۔ یہ روسی زبان کی ماہر
اور بہت اچھی نشانہ باز ہے اور یہ آپریشن آپریشن کے شعبے میں
کام کرتی ہے۔ یہ جرمنی کے کلاڈن کانج میں میک اپ اور خفیہ
اقسام کے مزاحیہ اسکرپٹ میں کام کرنا سیکھ رہی ہے۔“ ڈینی
نے کہا۔
”اصل سوال یہ ہے کہ اس کا نشانہ کون اور کہاں ہو سکتا
ہے۔“ بظاہر یہ لگتا ہے کہ ٹارگٹ روس میں ہے لیکن کون...؟“
ہیلے نے کہا۔
”میں کوشش کرتا ہوں انٹرنیٹ سے کچھ پتا چلے۔“ ڈینی
نے کہا۔
ڈینی نے اپنے آفس کینٹ پر تلاش شروع کی کہ کن
ملکوں کے سربراہ سرکس کا شوق رکھتے ہیں۔ تین نام سامنے
آئے جن میں روسی صدر ولین کا نام بھی شامل تھا۔ اب ڈینی کو
یقین ہو گیا کہ ٹارگٹ کون سی شخصیت ہے۔ ڈینی نے سی آئی
اے کے دوسرے سیکشن میں فون کیا اور پوچھا کہ مجھے یہ
معلومات چاہیں کہ روس میں ماسکوسکس کن تاریخوں میں اپنا
شو کرتا ہے۔
ڈینی کو تفصیل بتادی گئی اور پھر اس شخص نے کہا۔ ”عجب
بات ہے۔ ایک ہفتہ پہلے یہی معلومات آپریشن آپریشن کے کسی

عہد پدارتے بھی مانگی تھیں۔

ڈینی نے ہیلے کو یہ ساری تفصیل بتائی۔ ہیلے نے کہا۔ ”مگر یہ آپریشن کا سبب ہو گیا تو دنیا میں ایسی جنگ چھڑ سکتی ہے۔ ڈینی انھیں ماسکو جانا ہو گا اور کسی طرح اس آپریشن کو ختم کرنا ہے۔“

ڈینی نے آسٹریا کے شہر وینا سے ماسکو کے لیے ایروپلٹ کی پرواز کا ٹکٹ لیا۔ پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات جملے تھے لیکن وزیراعلیٰ لگا ہوا تھا جو اسٹیشن میں روٹی ایسی سے جاری ہوا تھا۔ ڈینی نے اپنا حلیہ بھی کافی حد تک تبدیل کیا ہوا تھا۔ اس نے ماسکو پہنچ کر ایک غیر معروف ہوٹل میں کمر لیا۔ رات کو آرام کے بعد دوسرے دن صبح وہ کسی کے ذریعے امریکن ہسپتال پہنچا اور کمرشل اتاشی سے ملاقات کی۔ دونوں ایک محفوظ کمرے میں گئے اور بات کی۔ ڈینی کو دو پارسل دیے گئے۔ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ یہ دونوں آج ہی موصول ہوئے تھے۔ ڈینی نے انہیں اپنے بیگ میں رکھ لیا اور ہسپتال سے باہر آگیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ایک بڑے ٹرین اسٹیشن میں گیا اور دونوں پارسل ایک لاکر میں محفوظ کر دیے۔ لاکر کی جالی اس نے حفاظت سے اپنی جیب میں رکھ لی اور ہوٹل واپس آگیا۔

رات کو آرام کے بعد دوسرے روز صبح ڈینی نے اپنے شہنشاہ کی تیاری شروع کی۔ اس نے بیگ سے ایک پارسل نکال کر کھولا تو اس میں سے سرکس کے سحرے کا لباس برآمد ہوا جو نامعلوم کا پتا ہوا تھا۔ یہ کپے گلابی رنگ کی قمیض اور سرخ و نیلے دھاری دار پاجامے پر مشتمل تھا۔ اس پیکٹ میں ربر کا فیس ماسک بھی تھا جس کے ساتھ سرخ رنگ کی ٹاک کی ہوئی تھی۔

ڈینی نے سائز ٹیبل سے اپنا چھوٹا پڑا ہوا لباس اور اس کا پچھلا کور کھول کر ایک دھاتی ڈبا نکالا۔ اس ڈبے کے ڈھکن میں چھوٹے گے ہوئے تھے۔ ڈینی نے اپنے جیبی جانو کی مدد سے یہ ڈبہ کھولا اور ڈھکن ہٹا یا تو ڈبے میں سے ایک تیز رنگ برآمد ہوئی۔ یہ تیز رنگ دالی چھوٹی نارنج کے برابر تھی۔ اس کن سے پندرہ فٹ کے فاصلے تک دو چھوٹی سونیاں (ڈارٹ) فائر کی جاسکتی تھیں۔ ڈارٹ ہارک تاروں کے ذریعے کن سے جڑے ہوئے تھے۔ اس کن کے ذریعے اپنے اشاریہ طاقتور بجلی کا کرنٹ پہنچایا جاسکتا تھا۔ ایک عام انسان کو اس کن کے ذریعے آدھے منٹ تک مکمل طور پر بے حس کیا جاسکتا تھا۔ اس کی نیلے نیلے کی صلاحیت ختم ہو جاتی لیکن اس کن کے فائر سے کوئی ہلک اثرات نہیں ہوتے۔ آہستہ آہستہ چند منٹ میں وہ شخص نامول ہوجاتا ہے۔

ڈینی کو آج دو بجے والے سرکس کے شومیں جانا تھا۔

مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ڈینی نے تیاری شروع کی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی سینٹ اور شرٹ پہنی۔ جیبوں میں سے ایک کن، بنوا اور سیف ڈپازٹ باکس کی جالی سنبھال کر دیکھی۔ اس نے سرکس کلاؤن کا لباس پہنا۔ اوپر سے اور کوٹ پہن لیا۔ اس کوٹ نے اس کا لباس بھروسہ تک چھپایا تھا۔ ماسک لٹکائی جیب میں رکھ لیا۔ اس تیاری کے بعد اس نے کمر باندھا۔ جازہ لیا۔ رچرڈ کھورے نام کا جلی پاسپورٹ اور دوسرے شروٹ والا چشمہ اس نے سائز ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایک بیجے باہر آ کر ڈینی ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اسے ماسکو سرکس جانے کا کہا۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ٹیکسی نے اسے ماسکو سرکس کے باہر اتار دیا۔ یہ ایک بڑے گول گنبد والی شاندار عمارت تھی۔ کچھ دیر بلڈنگ کے چاروں طرف جازہ لے لیے کے بعد پچھلے دروازے سے ڈینی اندر داخل ہوا۔ یہاں بہت سے ڈیرنگ روم تھے۔ اندر جانے سے پہلے ڈینی نے جیب سے پلاسٹک کا ایک شاتھی کارڈ نکال کر چیک کر لیا تھا۔ اس کارڈ پر ماسکو سرکس کے ملازم میٹائل اور پروف کا نام موجود تھا۔ اندر ایک ٹیبل پر ایک خاتون آنے والے ملازمین کے پاس سرسری طور پر چیک کر رہی تھی۔ ڈینی نے بھی اپنا کارڈ ہاتھ میں لے کر دکھا دیا۔ ایک خالی ویٹنگ روم میں داخل ہو کر ڈینی نے اور کوٹ اتار دیا۔ فیس ماسک لگا کر آئینے میں اپنا جازہ دیکھا۔ بالکل دوسرے معجزوں کی طرح لگ رہا تھا۔ سرکس کے بڑے ہال سے بیٹھ کر تیز آواز اور لوگوں کے تالیاں بجانے کی آواز آئی۔ ڈینی سمجھ گیا کہ وہی صدر کیلین پنڈل میں آئے ہیں۔

ڈینی نے دروازے میں سے دیکھا کہ سرکس کا ریا شائقین سے مکمل بھرا ہوا ہے۔ پہلی قطار کے درمیان آج کے عین سامنے وہی صدر کیلین اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں جانب گہرے سیاہ سوٹ میں ملیوں دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ مقررہ وقت پر سرکس شروع ہو گیا۔ مختلف فنکاروں نے اپنا کمال پیش کیا۔ ہاتھی، جیتے، ریتچہ اور ہندوؤں کے ایک پیش کیے گئے۔ وقت گزر رہا تھا۔ ڈینی نے کھڑی دیکھی۔ اب ساڑھے تین بجے والے تھے۔ سائز ٹیبل کے ایک کٹ کے بعد پروگرام کے مطابق اب معجزوں نے داخل ہونا تھا۔ ڈینی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ کر کن کو چیک کیا۔ ایک بڑی سی ملی ہوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی ایک جانب سے آج پر داخل ہوئی۔ اس میں سے دس سحرے برآمد ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کو خوش آمدید کہا۔ ڈینی اس گروپ میں جولی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے امریکی گاؤڑ باز کا لباس پہنا ہوا

مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ڈینی نے تیاری شروع کی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی سینٹ اور شرٹ پہنی۔ جیبوں میں سے ایک کن، بنوا اور سیف ڈپازٹ باکس کی جالی سنبھال کر دیکھی۔ اس نے سرکس کلاؤن کا لباس پہنا۔ اوپر سے اور کوٹ پہن لیا۔ اس کوٹ نے اس کا لباس بھروسہ تک چھپایا تھا۔ ماسک لٹکائی جیب میں رکھ لیا۔ اس تیاری کے بعد اس نے کمر باندھا۔ جازہ لیا۔ رچرڈ کھورے نام کا جلی پاسپورٹ اور دوسرے شروٹ والا چشمہ اس نے سائز ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایک بیجے باہر آ کر ڈینی ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اسے ماسکو سرکس جانے کا کہا۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ٹیکسی نے اسے ماسکو سرکس کے باہر اتار دیا۔ یہ ایک بڑے گول گنبد والی شاندار عمارت تھی۔ کچھ دیر بلڈنگ کے چاروں طرف جازہ لے لیے کے بعد پچھلے دروازے سے ڈینی اندر داخل ہوا۔ یہاں بہت سے ڈیرنگ روم تھے۔ اندر جانے سے پہلے ڈینی نے جیب سے پلاسٹک کا ایک شاتھی کارڈ نکال کر چیک کر لیا تھا۔ اس کارڈ پر ماسکو سرکس کے ملازم میٹائل اور پروف کا نام موجود تھا۔ اندر ایک ٹیبل پر ایک خاتون آنے والے ملازمین کے پاس سرسری طور پر چیک کر رہی تھی۔ ڈینی نے بھی اپنا کارڈ ہاتھ میں لے کر دکھا دیا۔ ایک خالی ویٹنگ روم میں داخل ہو کر ڈینی نے اور کوٹ اتار دیا۔ فیس ماسک لگا کر آئینے میں اپنا جازہ دیکھا۔ بالکل دوسرے معجزوں کی طرح لگ رہا تھا۔ سرکس کے بڑے ہال سے بیٹھ کر تیز آواز اور لوگوں کے تالیاں بجانے کی آواز آئی۔ ڈینی سمجھ گیا کہ وہی صدر کیلین پنڈل میں آئے ہیں۔

ڈینی نے دروازے میں سے دیکھا کہ سرکس کا ریا شائقین سے مکمل بھرا ہوا ہے۔ پہلی قطار کے درمیان آج کے عین سامنے وہی صدر کیلین اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں جانب گہرے سیاہ سوٹ میں ملیوں دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ مقررہ وقت پر سرکس شروع ہو گیا۔ مختلف فنکاروں نے اپنا کمال پیش کیا۔ ہاتھی، جیتے، ریتچہ اور ہندوؤں کے ایک پیش کیے گئے۔ وقت گزر رہا تھا۔ ڈینی نے کھڑی دیکھی۔ اب ساڑھے تین بجے والے تھے۔ سائز ٹیبل کے ایک کٹ کے بعد پروگرام کے مطابق اب معجزوں نے داخل ہونا تھا۔ ڈینی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ کر کن کو چیک کیا۔ ایک بڑی سی ملی ہوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی ایک جانب سے آج پر داخل ہوئی۔ اس میں سے دس سحرے برآمد ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کو خوش آمدید کہا۔ ڈینی اس گروپ میں جولی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے امریکی گاؤڑ باز کا لباس پہنا ہوا

ڈینی نے دروازے میں سے دیکھا کہ سرکس کا ریا شائقین سے مکمل بھرا ہوا ہے۔ پہلی قطار کے درمیان آج کے عین سامنے وہی صدر کیلین اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں جانب گہرے سیاہ سوٹ میں ملیوں دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ مقررہ وقت پر سرکس شروع ہو گیا۔ مختلف فنکاروں نے اپنا کمال پیش کیا۔ ہاتھی، جیتے، ریتچہ اور ہندوؤں کے ایک پیش کیے گئے۔ وقت گزر رہا تھا۔ ڈینی نے کھڑی دیکھی۔ اب ساڑھے تین بجے والے تھے۔ سائز ٹیبل کے ایک کٹ کے بعد پروگرام کے مطابق اب معجزوں نے داخل ہونا تھا۔ ڈینی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ کر کن کو چیک کیا۔ ایک بڑی سی ملی ہوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی ایک جانب سے آج پر داخل ہوئی۔ اس میں سے دس سحرے برآمد ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کو خوش آمدید کہا۔ ڈینی اس گروپ میں جولی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے امریکی گاؤڑ باز کا لباس پہنا ہوا

ڈینی نے دروازے میں سے دیکھا کہ سرکس کا ریا شائقین سے مکمل بھرا ہوا ہے۔ پہلی قطار کے درمیان آج کے عین سامنے وہی صدر کیلین اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں جانب گہرے سیاہ سوٹ میں ملیوں دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ مقررہ وقت پر سرکس شروع ہو گیا۔ مختلف فنکاروں نے اپنا کمال پیش کیا۔ ہاتھی، جیتے، ریتچہ اور ہندوؤں کے ایک پیش کیے گئے۔ وقت گزر رہا تھا۔ ڈینی نے کھڑی دیکھی۔ اب ساڑھے تین بجے والے تھے۔ سائز ٹیبل کے ایک کٹ کے بعد پروگرام کے مطابق اب معجزوں نے داخل ہونا تھا۔ ڈینی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ کر کن کو چیک کیا۔ ایک بڑی سی ملی ہوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی ایک جانب سے آج پر داخل ہوئی۔ اس میں سے دس سحرے برآمد ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کو خوش آمدید کہا۔ ڈینی اس گروپ میں جولی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے امریکی گاؤڑ باز کا لباس پہنا ہوا

ڈینی نے دروازے میں سے دیکھا کہ سرکس کا ریا شائقین سے مکمل بھرا ہوا ہے۔ پہلی قطار کے درمیان آج کے عین سامنے وہی صدر کیلین اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں جانب گہرے سیاہ سوٹ میں ملیوں دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی دو گاؤڑ بیٹھے تھے۔ مقررہ وقت پر سرکس شروع ہو گیا۔ مختلف فنکاروں نے اپنا کمال پیش کیا۔ ہاتھی، جیتے، ریتچہ اور ہندوؤں کے ایک پیش کیے گئے۔ وقت گزر رہا تھا۔ ڈینی نے کھڑی دیکھی۔ اب ساڑھے تین بجے والے تھے۔ سائز ٹیبل کے ایک کٹ کے بعد پروگرام کے مطابق اب معجزوں نے داخل ہونا تھا۔ ڈینی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ کر کن کو چیک کیا۔ ایک بڑی سی ملی ہوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی ایک جانب سے آج پر داخل ہوئی۔ اس میں سے دس سحرے برآمد ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کو خوش آمدید کہا۔ ڈینی اس گروپ میں جولی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے امریکی گاؤڑ باز کا لباس پہنا ہوا

”ڈونا ریڈ تو باہر انتظار کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ میں نے روسی صدر کو کوئی ماری ہے یا نہیں۔“ جولی نے کہا۔ ”جائزوں کا پیمانہ کسی کی ملی کے ساتھ بھی تھا کہ جنہیں کسی حالت میں زندہ نہیں چھوڑا ہے۔ اب کے جی بی میں پورے شہر میں تلاش کر رہی ہوگی اس لیے میں جولی کو سرکس میں استعمال کرتے ہوئے اس ٹرین اسٹیشن پہنچا ہے جہاں میں نے دو پیکٹ محفوظ کیے تھے۔ اس دوران تم کچھ سے بچنا کلاؤن کا میک اپ صاف کرنے کی کوشش کرو۔“ ڈینی نے کہا۔

اسٹیشن کے قریب پہنچ کر ڈینی نے جولی سے کہا۔ ”میں اسٹیشن کے اندر جاؤں گا، تم آکر پیکٹ دوسری جانب آکر مجھ سے ملو۔“

ڈینی نے دونوں پیکٹ وصول کیے اور دوسری جانب سے باہر آ کر جولی کو تلاش کیا۔ وہ دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور ریڈ اسکوٹر کی جانب روانہ ہو گئے۔

”اب سے دو گھنٹے بعد ماسکو سے برٹش ایئر ویز کی ایک فلائٹ لندن کے لیے روانہ ہونے والی ہے۔ میں وہ فلائٹ پکڑنی ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ٹیکسی سے اتر کر وہ دونوں ساحلوں کے جھم میں شامل ہو گئے اور اسی کے ساحلوں کے ایک گروپ کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ راستے میں وہ دونوں گروپ سے الگ ہو کر ایک چھوٹے سے چرچ میں داخل ہو گئے۔ وہاں بیچھے کی جانب واٹس روم ہے ہوئے تھے۔ ڈینی نے جولی کو ایک پیکٹ دیا اور کہا کہ اندر جا کر لباس تبدیل کرلو۔

جب جولی باہر آئی تو برٹش ایئر ویز کی ہوشن کی بونٹارم میں تھی۔ ڈینی بھی پائلٹ کے پرنٹارم میں تھا۔ ڈینی نے جولی کو برٹش پاسپورٹ اور ایئر لائن کا شاتھی کارڈ دیا جو گئے میں پہنا جاتا ہے۔

”ہم دونوں کا تعلق انگلینڈ سے ہے اور ہم آج کی فلائٹ 711 کے اسٹاف میں شامل ہیں۔“ اس نے کہا۔

جب وہ باہر آئے تو دیکھا کہ دروازے پر چار آدمی ہر ایک کے کاغذات چیک کر رہے ہیں۔ ڈینی اور جولی دوسرے راستے کی طرف بڑھے۔ وہاں بھی چیکنگ ہو رہی تھی۔

”ایسا لگتا ہے کہ جی بی نے سب راستے بند کیے ہوئے ہیں۔“ ڈینی نے کہا۔

”اب کیا کریں؟“ جولی بولی۔

”ہم ٹھوڑی دیر اندر ہی انتظار کرتے ہیں۔“ ڈینی نے کہا۔

وہ ریڈ اسکوٹر میں دوبارہ ایک بڑے سائتی گروپ میں شامل ہو گئے۔ اس گروپ کی میں ایک جانب کھڑی تھی۔

دوسرے لوگوں کے ساتھ یہ دونوں بھی بس میں بیٹھ گئے۔ بس باہر کھڑے راستے کی جانب بڑھی تو جرنی نے ڈینی کا بازو پکڑ لیا اور باہر اشارہ کیا۔

راستے میں ایک چیک پوائنٹ بنا ہوا تھا اور ایک جانب ایک سیاحتیوں والی کار بھی موجود تھی۔ بس رگ ہلکی تھی۔ کار سے ایک چھوٹے قد کا درمیانی عمر کا شخص برآمد ہوا۔

”یہ پاؤلف ہے۔ روسی کے جی پی ایچ کے کاسر براہ۔“

ڈینی نے کہا۔

”بس میں داخل ہوا اور مسافروں کا جائزہ لینے ہوئے ڈینی اور جرنی کے قریب پہنچا اور بولا۔ ”آپ دونوں اپنے کاغذات دکھائیے۔“

دونوں کے پاسپورٹ اور کارڈز دیکھنے کے بعد پاؤلف بولا۔ ”آپ دونوں ذرا اس سے باہر آجائیں۔“

دونوں نے سمجھ لیا کہ اب کبھی ختم ہو گیا۔ دونوں کے جی پی کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ بس سے باہر آکر پاؤلف نے کہا۔

”سسر ڈینی! میرے پاس دو راستے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ تم دونوں کو خاموشی سے ختم کر دیا جائے لیکن قانون کے مطابق پہلے تم دونوں سے پوچھ لیا جاتا ہے لیکن یہ میرے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں تم دونوں کو جانے دوں لیکن میں تمہیں دارنگ دینا چاہتا ہوں کہ میرے اسٹاف تم دونوں کی گرفتاری کے احکامات ہیں۔ آگے کیا ہوتا ہے تمہاری قسمت۔“

وہ دونوں بس میں آکر بیٹھ گئے۔ میریڑ بٹا دیا گیا اور بس روانہ ہو گئی۔ اگلے اسٹاپ پر سب سیاح اتر کر میرے لیے چل دیے۔ ڈینی اور جرنی ایک ٹکسی میں بیٹھے اور ان پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر جرنی نے کہا۔ ”ہمارے پاس روسی ویزا تو ہے نہیں۔“ ڈینی نے بتایا۔ ”انٹرنیشنل اسٹاف کے پاسپورٹ پر مشتمل ویزا لگا ہوا ہے۔“

ڈینی اور جرنی پتھر کی رکاوٹ کے ان پورٹ پہنچ گئے۔ ڈیپارچر لائن میں دو روزے کے اندر تین افراد لیے رین کوٹ پہنے ہوئے آنے والے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔

”ان کا تعلق کس جی پی سے ہے۔ بالکل ناٹل رولز ہم لوگ انٹرنیشنل کے اسٹاف میں ہیں۔ ان لوگوں کا آنا جائزہ دینا معمول ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

دونوں لائن میں لگ گئے اور کاؤنٹر پہنچ کر اپنے پاسپورٹ پیش کر دیے۔ کاؤنٹر پر خاتون نے پوچھا کہ اور کوئی سامان؟ دونوں نے ہلکا سا کارڈ حاصل کیے اور امیگریشن کاؤنٹر کی لائن میں لگ گئے۔ کاؤنٹر پر ان کے کاغذات ایک

مرتبہ پھر تفصیل سے چیک کیے گئے۔ پاسپورٹ وائس کے بعد ڈینی اور جرنی جہاز میں سوار ہو گئے۔

کچھ دیر بعد جہاز نے اتران بھری اور لوگوں کو اترنے کا کہنا کیا۔ ان کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے، روسی حکام نے فلائٹ 711/19 واپس ماسکو بلا لیا ہے۔“

”ہم اس وقت کہاں سے مقرر رہے ہیں؟“ ڈینی نے پوچھا۔

”کیڑا ہے۔ ابھی ہم روسی فضائی حدود میں تقریباً پینتیس میل اندر ہیں۔“ کیپٹن نے کہا۔

”کیپٹن! اب آپ کیا کریں گے؟“ جرنی نے پوچھا۔

”قوانین کے مطابق تو مجھے جہاز واپس موڑ لینا چاہیے لیکن اگر مجھے پیغام ملایا نہیں تو پھر مجبور ہی ہے۔“ اس نے کہا۔

دونوں نے اطمینان کی سانس لی اور بولے۔ ”بہت بہت شکریہ کیپٹن!“

امریکا واپس پہنچ کر ڈینی نے سی آئی اے ڈائریکٹر بروکس جاردن کو فون کیا۔ ”میں آپ سے کھرب لانا چاہتا ہوں۔“

رات آٹھ بجے ڈینی، جاردن کے گھر پہنچ گیا۔

”ڈینی! تمہیں آپریشن وکس میں داخل انداز کی کئی کئی چابی تھی۔ اس کو مدد صاحب نے منظور کیا تھا۔“ جاردن نے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ تم اس بات کو غائب نہیں کر سکتے۔ روسی صدر کو قتل کرنے کا مطلب عالمی جنگ کا چھڑ جانا ہوتا۔“

ڈینی نے کہا۔

”مدد رکھیں اب اور بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔“ جاردن نے کہا۔

”ایسا نہیں ہے بلکہ تم نے پاؤلف سے کوئی سودا کیا تھا۔“ ڈینی نے کہا۔

”چھوڑو..... اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ جاردن نے کہا۔

”لیکن میری بیٹی کی زندگی کا سوال اب بھی موجود ہے۔ میری بچھی آفراب بھی قائم ہے۔ میری بیٹی کو اڑتالیس گھنٹے میں میرے حوالے کر دو روزہ میرے پاس تمہاری آواز کا پ اور آپریشن وکس کی پوری تفصیل کیپیڈ ڈسک پر موجود ہے۔ میں نے یہ چیزیں انہی طرح محفوظ کی ہوئی ہیں۔ میں یہ سب چیزیں میڈیا میں بیچ دوں گا۔“ ڈینی نے کہا۔ ”پاؤلف کو تو روس میں کوئی مادی جائے کی اور تمہارا مقدر تاحیات جیل کی کوٹھی ہے۔ میری خاموشی کی قیمت یہی ہے کہ میری بیٹی کی

زندگی بچ جائے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہتے ہو، ایسا ہی ہوگا۔“

جاردن نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

بارہ گھنٹے بعد ڈینی کے فلیٹ میں فون کی گھنٹی بجی۔ فون پر ایک غیر امریکی لہجے میں کسی نے کہا۔ ”تم آج فوراً مکلی فورنیا چلے جاؤ۔ غروب آفتاب کے وقت ”ہاف مون“ پر اکیلے پہنچ جاؤ۔“

اس پیغام کے بعد فون بند ہو گیا۔

ڈینی نے دوپہر کی فلائٹ سے مکلی فورنیا کی سیٹ بک کر لی۔ اس کے بعد اپنے دوست سام گرین کو فون کر کے کہا۔

”میں تو اس وقت ان پورٹ جا رہا ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے نائب کو کیڑا فون کرنا۔ وہ تمہیں ایک بینک کا نام اور سیف ڈپازٹ باکس کا نمبر بتائے گا۔ اس باکس میں اہم حقائق میٹرل ہے۔ تمہیں وہ چیزیں سینٹ کی ایٹمی جنس میٹری کے جیٹریں کو پہنچانی ہیں۔“ ڈینی نے سام کو ہدایت دی۔

ڈینی کی فلائٹ میں بجے لاس اینجلس پہنچ گئی۔ باہر پہنچ کر اس نے کار کے لیے پری اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد ساحل کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ریت کے ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ باقی تھے۔ ڈینی سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے یہ روسی کے جی پی نے اس کے لیے چھنڈا تیار کیا ہو اور وہ اب اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے ہوں۔

جیسے ہی سورج غروب ہوا، ڈینی نے ساحل کے کنارے کنارے چلتا شروع کر دیا۔ کچھ منٹ بعد اس نے دیکھا کہ دور سے کوئی بچہ اس کی طرف چلتا ہوا آ رہا ہے۔ ذرا قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ یہ اس کی بیٹی کی بیٹی تھی۔ دونوں دوڑ کر ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے۔ ڈینی نے کیری کو اپنی گود میں اٹھالیا اور پیار کرنے لگا۔

”خدا کا شکر ہے تم خیریت سے ہو۔“ دونوں باپ بیٹی مائٹا برا کے قصبے میں کیری کی ماں کے پاس پہنچ گئے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ڈینی نے شریف ڈیپارٹمنٹ میں فون کر کے انچارج انسپکٹر کو بھی بتا دیا کہ میری بیٹی کیری گھر واپس آ گئی ہے۔ وہ اپنی خالہ کے گھر رہ رہی تھی۔ کیری کی گمشدگی کا کس داخل دفتر کر دیا گیا۔ ڈینی نے چند روز اپنی بیٹی کے ساتھ گزارے اور واپس واپس واپس پہنچ گیا۔

رات کو بیٹی کی خبروں سے ڈینی کو پتا چلا کہ سی آئی اے کے ڈائریکٹر بروکس جاردن نے سمر میں کوئی بارگھوشی کر لی۔ ایک اور خبروں سے متعلق بھی تھی کہ روسی کے جی پی کے سربراہ پاؤلف کو برطرف کر دیا گیا ہے اور ان کو سامیریا کے ایک ریگ

کیپ میں دس سال کے لیے بھیج دیا گیا۔ احمد واٹسن میں ڈسٹریکٹ ہیڈ لے کوئی آئی کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا ہے۔

واٹسن کی پینل آرٹ گیلری میں ڈینی اور جرنی ایک ساتھ سیر کر رہے تھے۔

”کیا دانی تم واپس کیڑا جا رہے ہو؟“ جرنی نے پوچھا۔

”ہاں، یہاں میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ مجھے واپس جا کر اپنے فنک کیپ کے معاملات سمجھنا ہیں۔“ ڈینی نے کہا۔

”میں تمہیں بہت مس کر دوں گی۔“ جرنی نے کہا۔

”ہاں، میں بھی تمہیں سوچ رہا ہوں۔“ ڈینی نے کہا۔ ”جرنی! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں لکڑی کی زندگی کی ابتدا کریں؟“

جرنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔ ”یہ میری دلی خواہش ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ ایک طرف ایجنسی میں میرا کیریئر ہے اور دوسری طرف نئی زندگی۔ میرے لیے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو بھاری دل سے خدا حافظ کہا اور جدا راستے پر چل پڑے۔

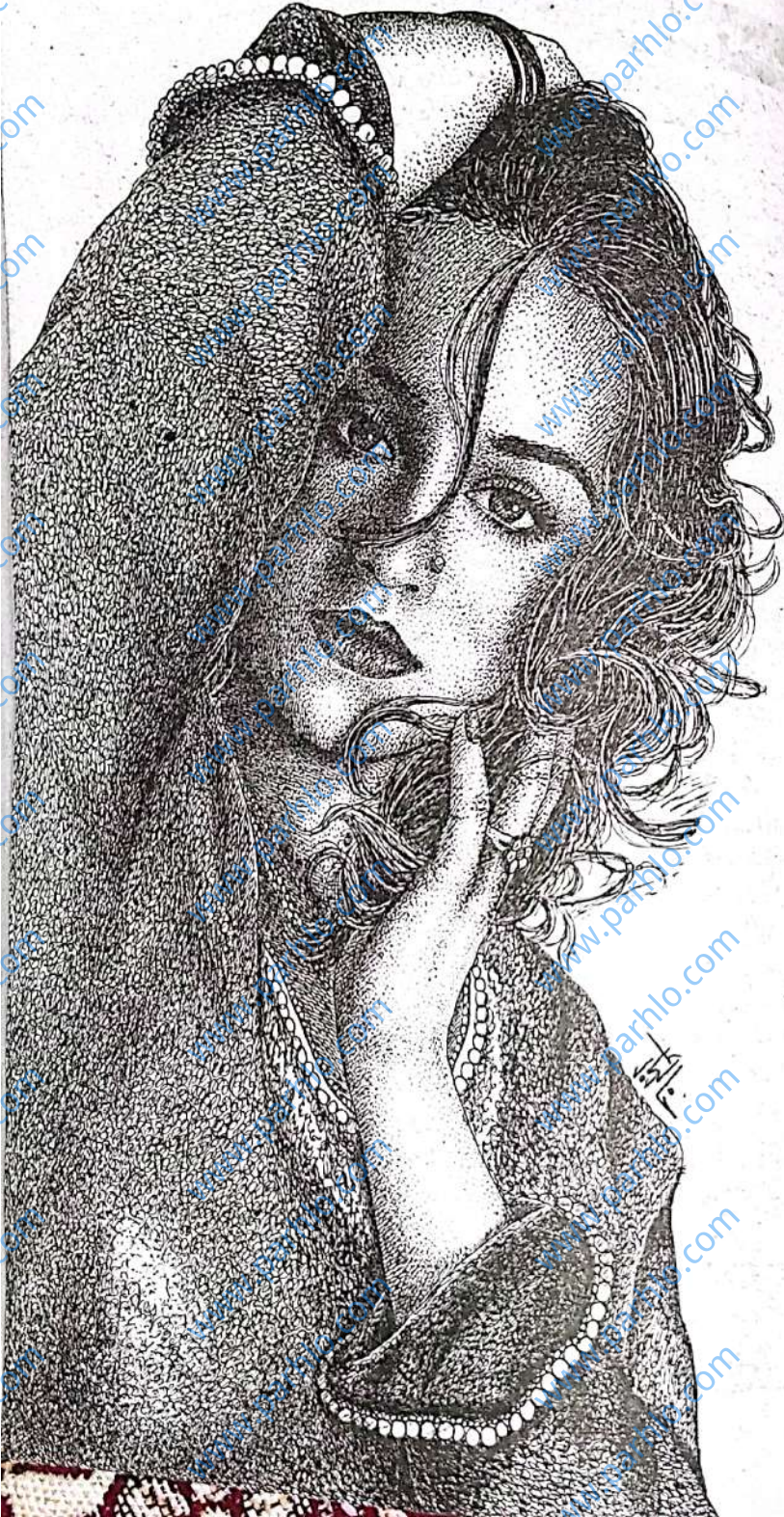
ڈینی کیڑا پہنچ کر فنک کیپ میں کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے جرنی کو بھولنے کی کوشش کی لیکن اکثر اس کا خیال آ جاتا تھا۔

موسم بھاری آندھی۔ درجہ حرارت کچھ بڑھنے لگا۔ برف پگھلنے لگی تو دریا کا بہاؤ بھی تیز ہو گیا۔ جنگل کے درختوں نے نئے پتوں کا سبز لباس پہن لیا۔ اپریل کے درمیان میں ساحلوں کی آمد تو تھی مگر ایک روزہ صبح کی نرم صوب میں دریا میں بنی ڈالے سالن پگھلنے کے شکار میں مصروف تھا۔ اسے کانوں میں ہلکی سی آواز آئی۔ اس نے اوپر دیکھا تو ایک سی پلین (sea plane) جنوب کی سمت سے آ رہا تھا۔ جلد ہی وہ کیپ کے سامنے دریا میں آکر اتر گیا۔ وہ چلتا ہوا ڈینی کی طرف آ کر رک گیا۔ پائلٹ نے انہیں بند کیا۔ جہاز کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون جینز اور سرخ سوٹر پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ یہ جرنی تھی۔

دونوں گرجوشی سے ملے۔

”میں نے ایجنسی کی ملازمت سے استقفا دے دیا ہے۔ اب میں بیروں گزار ہوں۔“ جرنی نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ اب ہم دونوں مل کر بہتر طریقے سے اس کیپ کو چلا جائیں گے اور ہماری زندگی خوشیوں سے بھرپور مقررے گی۔“ ڈینی نے خوش ہو کر کہا۔



جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرحمن

قسط 25

مقدر کا عروج ہو یا تصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسہ کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید ہو سیدہ درو دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے نا آشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید نا آسودہ خواہشوں کا بہنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کاپا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی ولد و داستان

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بہر کیف، زیادہ سوچنے کا وقت نہ رہا تھا کیونکہ ان کے زور زور سے پائیں کرنے اور دست قہقہوں کی آوازیں قریب آچکی تھیں۔ وہ بھرپور غلغلہ مچا رہے تھے۔ لہذا چوتھے تو بھونپڑی کے بعد ایک دم اچانک میں ایک خاموشی طاری ہوئی۔ اس کے بعد ایک دم اچانک میں دروازہ کھلا۔ یکھت میرے اعصاب تن گئے۔ سیوٹ کی جڑی صوبی موش ہوئی۔ اس کے دونوں معصوم بچے بھی ڈر کر اس سے چپک گئے تھے اور ماں کے عقب سے خوف بھری آنکھوں کے ساتھ دروازے پر کھڑے ان چاروں ششپے بدصاش کو کھتے اور سنتے جاتے۔

سیوٹ بچہ پہلے ہی پریشان تھا۔ ان کا پالتو کتا ایک بار بھونک کر خاموش ہو رہا۔ ان چاروں میں ایک دروازہ ت اور میرے جسم کی گوری عورت بھی تھی۔ خاموشی پر کشش لیکن رنگ۔ اس کے سہری بالوں پر لی کبھی اور اور گریٹنگ بالوں کی ٹلوں سے سفید برف چمکی ہوئی تھی۔ انھیں غلی اور ان میں خاص قسم کی شکاری چمک دکھانے لگی تھی۔ انھیں مجھ پر نگاہ پڑتے تھے یہ چمک اور گریٹنگ ہو چکی تھی۔

اس چمک میں مجھے مکاری کا عنصر غالب محسوس ہوا۔ چہرے کی گوری رنگت میں سرخی کا احراج اسے خاصا پرکشش بنائے ہوئے تھا۔ اس نے چست مگر گرم لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس پر بھی برف کے ان گنت ذرات نظر آئے۔ اس کی شخصیت میں حسن کے ساتھ دبدبہ نمایاں تھا۔ مجھے یہ لہڑی لارائی۔ بالی اس کے تن میں سداسی جی اسی طرح کے دکھائی دیے۔ ان کی آنکھوں سے ہی نہیں، چہرہ سے بھی سٹائی ہوئی تھی۔ مجھے بھی وہ چمک کر گھور کر دیکھنے لگے۔ ان کے پاس اسلحہ کی جھلک نظر آئی تھی۔ انہوں نے سامنے کی دیوار والے آتش دان کے سامنے شینا کو گم بے ہوشی کے عالم میں لینے دیکھ کر بھونپڑی کی گھنٹی۔

ان تینوں میں ایک بیٹا بیٹا کتا اور دروازہ قامت تھا۔ اس کا سر سامنے کی طرف سے گھما تھا۔ چپے بال گدی سے تھپک تھپک جھل رہے تھے۔ اس کے چہرے سے بے بسی اور آنکھوں سے درد کی حشر تھی۔ ہمیلی نظر میں اس پر کسی قصاب کا ہی گمان محسوس ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ بدینیت اس کا منہ تھا جسے کوئی پالا ہوا وحشی سورہ۔ وہ خوش لہڑی لارائے کے بالکل ساتھ ہی کھڑا تھا۔ باقی دو ان کے دائیں بائیں۔

”کون ہو تم؟“

عورت نے پہلے مجھ پر ایک بھر پر نگاہ ڈالنے کے بعد

خاموشی دہے سے پوچھا۔ اس کی مشادہ ملی آنکھوں میں ہلکا سا جاکرہ لینے میں مشغول رہیں۔ اس کی آواز اور منہ میں ہلکا سا ان بات کی تصدیق کر ڈالی تھی کہ یہی عالمی کرکٹسٹوں کی ایک سربراہ البرٹ رمنڈو کی نائب لیڈی لارائی تھی جس سے میں لاسکی رابطہ کر چکا تھا۔ اب مجھے ڈر ہوا کہ میری آواز اور لہڑی سے وہ مجھے بھی رامو کے نام نہاد ساتھی ”شیان“ کی حیثیت سے نہ پہچان لے۔ بل کے بل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ان محدود حالات میں مجھے کیا کردار نبھانا چاہیے۔

”میرا نام شیان ہے۔ تم لوگ؟“ میں نے

سات لہجے میں کہا اور اسلحہ کی گوری کی حشر سے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے جن میں کچھ کچھ غیر چمک کا عنصر بھی غالب نظر آیا۔ واضح طور پر اس کے ساتھ کھڑا تصانی نما آدھے سر کا نچا بھی چوٹکا۔

”کیا تم وہی شیان ہو، رامو کے ساتھی؟“ لہڑی لارائے پوچھا تو اب میرے چہرے کو آواز حیرت ظاہر کرنے کی باری تھی۔

”اوہو..... یو لیڈی لارائی؟“ میرا لہجہ مستشرقانہ تھا۔ گفتگو شہرہ انگریزی میں ہو رہی تھی۔

”ہاں، مگر تم یہاں کیسے؟“ لارائی بولی۔ آنکھوں میں ہنوز لہراتے تشکیک کے سامنے مجھے عجیب لگے۔ میں نے ایک گہری ہکاری خارج کی اور تھکے تھکے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”امید تو تھی مجھے کہ یہاں کہیں تم سے میرا سامنا ہو جائے گا مگر اتنی جلدی اور اجاگاری کی توقع نہ تھی کیونکہ تم نے مجھے بتا رکھا تھا کہ تم لوگ تباہی پو.....“

”مشر شیان!“ دفعتاً ہی اس آدھے سر کے سر اور سر جیسے تھوٹھے والے نے مجھے درمیان میں ٹوک دیا۔ میں ایک دم چپ ہو کر اسے تنہا نظروں سے گھورنے لگا۔

”پہلے مادام لارا کے سوال کا جواب دو، اپنی کہانی بعد میں سنانا۔ سمجھے؟“ اس کا لہجہ مجھے اکڑا اور پُر غور سا لگا جس نے میرے جیسے جنگ باز کے اندر آگ سی بھری اور تڑکی تڑکی میں بھی اسی لہجے میں اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اپنی زبان سنبھالو مگر! اور اپنا لہجہ بھی درست رکھو۔ تم بھی سمجھے یا نہیں.....“

میرے بھی اسی انداز کے جوابی کلامی دارنے اسے پھر ادا دیا۔ اسے خود پر کچھ زیادہ ہی غرور تھا اور وہ ”تھ“ ”جھٹ“ ”جھٹی“ لگتا تھا۔ اس کی آواز اور غرور کو شاید میرے اسی انداز کے جواب نے زبردست دھچکا پہنچایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خوشخوار نظروں سے مجھے گھورتا اور دندنے کے مانند غراتا ہوا میری جانب لپکا۔ لارائے بھی اسے روکنے کی

پیش کشی کی جبکہ اس کے باقی دونوں ساتھیوں کی آنکھوں سے جوش اور دلچسپی مترشح ہونے لگی تھی۔

ماحول کا ایک کٹیدہ ہو گیا۔ اس درندے کو پھر تا دیکھ کر صوبی کے حلقے سے ہنچ نکل گئی۔ اس کا شوہر سیوٹ دیکھ کر پیشان ہو گیا۔ دونوں بچے سہم گئے۔ ان کا پالتو کتا بھی بھونپڑی لگا۔

”وہ جیٹ سیدھا مجھ پر آن پڑا۔ اس نے مجھے ”آسان“ لے لیا تھا لہذا مجھے ہی وہ میرے قریب چمکا، میں نے اپنی جگہ اطمینان سے کھڑے کھڑے اپنی دائیں ہاتھ مخصوص ٹوک کے ساتھ اس کے پہلو میں اس زور سے دبا کر ڈالی کہ اس کا رخ بدلا اور وہ چنداچ اچھل کر قریب کی ایک میز پر جا پڑا۔ میز ٹوٹ گئی اور اس کے دو ٹکڑوں سمیت وہ بھی فرش پوس ہو رہا۔

لارائے کا کٹیدہ بھی البتہ اس کی آنکھوں کی حکاراندہ چمک ایک لمحے کے لیے تیز ہو کر معدوم ہوئی۔ اس کے بالی دو ساتھی جن کے چہروں پر کچھ دیر پہلے جوش اور دلچسپی کے لب جل اٹھے تھے، وہ شاید اپنے خود مند ساتھی کے ہاتھوں میری درگت کے ”نظارے“ کے شہر تھے۔ لیکن اب اپنے ہی ساتھی کا شہر دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

میں نے اپنے مضروب مد مقابل کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور اسی طرح کھڑے کھڑے لارائے سے مخاطب ہو کر حکارت سے بولا۔

”لیڈی لارا! اپنے اس کتے کو سنبھالو ورنہ اس کا برا طر کر دوں گا۔“

”جنگی! اسناپ ناؤ۔“ وہ ایک دم بولی۔ اس کا نام شاید جنگی تھا جو چوٹ کھانے کے بعد تیزی سے سنبھلا تھا اور اس بار مجھ پر پہلے سے زیادہ بلا بولنے کے لیے پر بھی تو لے لگا تھا کہ ”مادام“ کے حکم پر وہیں رک گیا لیکن اپنی اس تعجب براس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”بس کرو..... اتنی جلدی غصے میں نہیں آ جا یا کرو اور دست دشمن کی تیز رکھا کرو۔“

جنگی نے اپنا غصہ ٹوٹی ہوئی میز کے ٹکڑوں کو لات مار کر لگا لگا کر دیا۔

”شکر بہ مادام!“ میں نے مختصر لارائے کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی مجھے مکاری کی تہ میں لاپائوس ہوئی۔

”میرا خیال ہے ہمیں آرام سے پہلے کام کی بات کر لینی چاہیے۔“

”یقیناً۔“ میں نے یکسر جنگی کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ اس کی طرف دوبارہ دیکھا۔

لارائے آتش دان کی طرف ایک ٹھنڈی جھانچا تھا۔

”یہ کون ہے؟“

”جب آرام سے کھٹو ہوگی تو سب معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہمارا یہاں ذرا قافلے پر کیمپ ہے۔ وہیں چل کر بات کر لیتے ہیں۔“

”ابھی نہیں، من بات ہوگی مادام! مجھے پر شہید محسن طاری ہے اور میں کچھ کھٹے آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ میرے جواب پر لارائے کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گر کر گیا پھر وہ ہنسنے لگا۔

”اوکے۔ میں نوڈی کو جی یہاں بھیج دوں گی۔ اس کے ساتھ آ جانا۔“ پھر اس نے حیران پریشان کھڑے سیوٹ اور صوبی کی طرف دیکھ کر حیرانہ دہشت سے کہا۔

”ہمارے لیے جڑی کا یہ، لے آؤ جلدی۔“

صوبی ڈرے ڈرے انداز میں جنگی کی جانب بڑھنے کے لیے پلٹی اور ایک ذرا سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ مجھے اس غریب کی نگاہ میں بے چارگی کا تاثر محسوس ہوا اور میں نے فوراً اپنا ایک ہاتھ آگے کر کے اس کا دست روک لیا۔

”گھبر جاؤ۔“ وہ رک گئی۔ چند لمحوں بعد ماحول میں پھر سکوت طاری ہوا۔ تب میں نے لارائے سے گھڑی ہوئی تنجید کی سے کہا۔

”مادام! یہ اب میرے محسن ہیں۔ انہوں نے ایک نازک موقع پر ہماری جان بچائی ہے اور یہاں سخت موسم میں پناہ دی ہے۔ تمہارے یہ محسن بٹے بٹے ساتھی کس کام کے ہیں؟ باہر شکار موجود ہے۔ ان سے کہو کہ آج شکار ساتھ لے جائیں، بالی ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ یہ بھی تم پر میرا احسان ہے کہ اپنا شکار لیا ہوا نہیں دے رہا ہوں ورنہ تم خود بھی شکار کر سکتے ہو۔ باہر میدان کھلا ہے۔“

”مشر شیان!“ لارائے ہی ہوئی۔ ”تم بھولو کہ تم ہمارے آکر کار ہو۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے بھی فوراً اور بلا خوف کہا۔

”میں چند دن پہلے تم سے لاسکی رابطے کے دوران یہ کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارا زور خرید نہیں ہوں۔ جو معاملہ ہم دونوں کے درمیان ہے، وہ خالصتاً میرے اور برابری کی بنیاد پر ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔“

یہ بات درست تھی کیونکہ چند دن پہلے میں نے لاسکی راہیلے کے دوران لارا کو اس کے اسی جھکانہ لہجے پر بڑی دکھائی ہے یہ باور کرا دیا تھا۔

جنگلی سمیت اس کے دونوں منٹوں سے ساتھیوں کی آنکھوں میں میرے لیے بڑی خوشخوار چمک ابھری۔ وہ اپنی "نادام" کے حکم کے بے چینی سے منتظر آنے لگے کہ کب وہ انہیں مجھ پر ہل پڑنے کا اشارہ کرے اور تینوں میری کانپنی کر کے رکھ دیں۔

میرے جواب پر لارا کے حسین چہرے پر بھی ایک لمبے کوشش کی سرخی ابھری مگر شاید کسی "مصلحت" کے تحت اس نے ایک گہری سانس لے کر جیسے خود کو مسکون کر لیا اور بولی۔

"تم سبک ہے۔ ہم چلتے ہیں لیکن کل صبح نرؤی تمہیں لینے آجائے گا۔" نرؤی شاید سرخوشی کے علاوہ ان دونوں میں سے کوئی ساتھی تھا۔

میں نے اس کی بات پر صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تو تینوں باہر چلے گئے۔

"یہ بہت خطرناک لوگ تھے لیکن حیرت ہے تم نے انہیں کیسے۔۔۔" ان کے مکان سے نکلے ہی میو نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تلے مجھ سے کہنا چاہا مگر میں اسے نظر انداز کرتا ہوا اپنی طرف متوجہ ہوا۔

اس کی حالت اب کچھ بہتر ہونے لگی تھی۔ صوبی نے اس کا جڑی بوٹیوں سے خوب علاج کیا تھا۔ البتہ زخم کو میرے میں وقت درکار تھا۔ اب موجودہ حالات میں خینا کا ساتھ میرے لیے اور بھی ضروری ہو گیا تھا لیکن ان صحرائی عتاب والوں کی یہاں موجودگی بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔ وہ دینی پائی راہ کو پی لے سکتے تھے۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ کل صبح میری ان باتوں سے کس طرح مطمئن ہونے والے تھے جو میں سوچ چکا تھا۔

میں تھا ہوا تھا اور نیند سے بھی میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میری وجہ سے اگرچہ دونوں میاں بیوی کو حوصلہ ہوا تھا مگر وہ اب بھی انجانے خوف کا شکار تھے۔

"ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل صبح تک مجبور کروں گا۔ یہ اب تمہیں یہاں سے کوچ کرنے پر بھی گئے۔" میں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا میں چھوٹے آرام کر سکتا ہوں؟"

"غور۔۔۔" میو نے کہا اور پھر اپنی بیوی سے کچھ بولا۔ وہ میرے لیے فوراً سو کا گرم بستر لے آئی جو میں نے آتش

وال کے قریب اور خینا سے ڈرا فاصلے پر بچھالیا اور سو گیا۔

نہ جانے رات کے کس پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی میں ہڑبڑا کر جاگا لیکن خود کو بے بس پایا۔ گہری نیند ابھانک ٹوٹنے پر پہلے تو میرا دماغ ہی بوہل سا رہا۔ چند لمحوں تک میری سمجھ میں ہی نہ آ سکا کہ ہوا کیا ہے۔

حواس بحال ہوئے تو خود کو پہلو کے بل پایا۔ اس طرح کہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ ماحول میں ہڑبڑگ کی چمکی ہوئی تھی۔ کھنکھاتی ہوئی، رونے اور سسکنے کی آوازیں۔ اس درمیان شیطانی قہقہے اور انسانی غراہیں تھیں۔

میں نے دیکھا وہ شیطانی ٹولا ایک بار پھر وہاں آں دھمکا تھا۔ نہ جانے رات کا وقت تھا یا صبح دم بیدار ہو چکی تھی۔ میرے دونوں میزبان میاں بیوی اپنے دونوں معصوم بچوں کے ساتھ ایک کونے میں کھڑے خوف سے قہقہہ کانپ رہے تھے اور میری طرف تنگے جا رہے تھے۔ بچے اپنی ماں اور باپ کے عقب میں دبے کھڑے تھے۔

لارا کے ہاتھ میں لمبی نال والا پتھول چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی مکاریاں چمک اب ایک مسکراہٹ تلے ظاہر تھی۔ اس کے دو ساتھی بھی اسلحہ بدست اس کے دائیں بائیں موجود میری جانب زہر خند مسکراہٹ سے مگورے تھے۔

جنگلی میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خفا کا نہ تاثرات تھے۔ خینا کو بھی چکا دیا گیا تھا اور وہ بے چین اور پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اوپر سے گرم موٹا کٹاف ہٹا دیا گیا تھا۔

ہل کے بل مجھے یہ سمجھنے میں مددگار رہا کہ انہوں نے دھوکے سے دوبارہ شب خون مارا تھا اور جنگلی نے مجھے سوتے ہوئے جکڑ بند کر ڈالا تھا۔ میرے میزبان کا کساناں پر بری طرح بھونکنے لگا تو جنگلی نے نرؤی کو اشارہ کیا۔ نرؤی نے اس معصوم بے زبان کو جادو جادو ساتھ ہی بھجور نکال لیا۔ اپنے پالتو کتے کے نرؤی کے ہاتھوں متوجہ بے رحمانہ حشر کے تصور سے صوبی اور میو تنج پڑے۔ دونوں بچے بھی رونے لگے لیکن نرؤی کتے کو باہر لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس معصوم بے زبان کی آخری چیخ ابھری اور خاموشی طاری ہو گئی۔ نرؤی جب لوٹا تو اپنا خون آلود بھتر صاف کر کے اپنی پٹلی میں اڑس رہا تھا۔

نرؤی کی اس بے رحمی پر قہر و غضب تلے میری حالت خیر ہوئے گی۔ صوبی اور بچے رونے لگے۔ میو نے دکھ سے اپنے ہونٹ چمچ لیے۔ ان کا پالتو کتا شاید بہت عرصے سے ان

میرا ہوتا تھا بلکان کے مختصر خاندان کا حصہ بن چکا ہوگا۔

"سب کیا ہے؟" میں نے پہلو کے بل لیٹنے لگا اور کھنکھاتے ہوئے حلق کے بل چلا کر کہا تو اسی وقت جنگلی کی ٹانگ حرکت میں آئی جس کی درودار زنجیر کھڑے پیٹ پر پڑی۔ میرے منہ سے درد انگیز کراہٹ نکلی اور میں دہرا ہوا گیا۔ کچھ نہیں، اس نے دوسری ٹانگ بھی چلا دی۔ میں جب تک اپنی سانس روک کر اپنے پیٹ کے مفلات کو تکلیف کی شدت سے بچانے کے لیے سخت کر چکا تھا اتنی لمبی دوسری ضرب سے مجھے کم تکلیف محسوس ہوئی۔

اس زنجیل نے اس پر بھی بس نہ کیا اور لاتوں کی ضربات سے اپنی ہڈیاں نکال چکا گیا۔ یہاں تک کہ میرے حلق سے کچھ بے رحم ہونے لگیں اور خینا نے میرا ہر جھڑک کر چلانا شروع کر دیا۔ لارا نے اپنے ایک ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا تو وہ فوراً ایک کر خینا کی طرف بڑھا جس کا اس کے اپنے ہی ساتھی اپنی جنگلی نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"رک جاؤ نرؤی! میں نادام کے حکم سے سب منہال لوں گا۔"

نرؤی دانی وہ آدمی شیطانی انداز میں ہنستا ہوا واپس ہٹ کر اپنی جگہ پر جا کھڑا ہوا۔ لارا نے شاید اپنے اس جہرے ہوئے کتے جنگلی کو میرے سلسلے میں "نرؤی ونڈ" دے دیا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر خینا کی طرف بڑھا۔ اس سنگدل نے خینا کے زخمی پہلو پر لات چلا دی۔ خینا کے حلق سے شدت درد تلے ایسی چیخ ابھری جیسے وہ آخری ہو۔ اس کے پہلو کا زخم کھل گیا، جڑی بوٹیوں کے لیپ نے جریان خون روکے گا جو بند باندھ رکھا تھا، وہ جیسے ٹوٹا تو وہاں سے سرخ اور گاڑے خون کی ندی بہہ نکلی۔ وہ کسی زخمی کی مٹی طرح سبز کر سکیانی اور گھٹے گھٹے انداز میں کراہتی رہی۔

اس کے چہرے پر موت کی زردی چھانے لگی۔

خینا کی یہ ہیبت کئی اٹا پڑا دینے والی تھی۔ خینا کا زہرہ رہا میرے لیے ضروری تھا۔ ساتھ ہی مجھے بچھتا ہوا کہ میں ان مکار اور سنگدل لوگوں سے عاقل کیوں ہوں۔ یہ لوگ بے رحم اور خفاک ہی نہیں بلکہ حدود رے کے مکار بھی تھے۔

ننگا بے رحمی سے بٹنے لگا اور ساتھ ہی میری جانب تپا دینے والے انداز میں مگورا۔ اس کی آنکھوں میں میرے بے داشت انگیز انتقام اور بغض کی آگ بھڑک رہی تھی۔

نوشہ رات میں نے اس کی پر غور کیا کہ جو دھچکا پہنچا رہا تھا، اب اس کا ادھار چکارا تھا لیکن لارا سے مجھے یہ امید نہ تھی کہ وہ مجھ سے برابر کی کیول اور دوستانہ انداز کا برتاؤ

رکھے ہوئے تھی اور اسی نے اپنے منہ چرے اور غصہ اور ساجھی جنگی کو میرے ساتھ الجھنے سے منع بھی کیا تھا مگر اب۔۔۔ شاید لارا کی اپنی بددینی اور مکاری بھی مکمل کر میرے سامنے آچکی تھی۔

بددستی سے میں اسی دھوکے میں رہ گیا تھا کہ یوہورگا کے مجھے سے حصول کے سلسلے میں لارا میرے ساتھ معاملت سے پیش آئے گی لیکن ان لوگوں نے شاید رات یہاں سے جانے کے بعد کچھ اور ہی منصوبہ بنالیا تھا اور یقیناً اس میں جنگلی کے ہی مشورے کا زیادہ دخل ہو سکتا تھا۔

"لارا۔۔۔!" میں حلق کے بل چیخا۔ میرا انداز لگاتار بڑھتا تھا۔ "یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔ اپنے اس بزدل کتے کو چٹا ڈال دو۔ اس سے منہ لے کر تمہارے اور میرے سچے راسخو والے معاملے کی بات ختم ہو جائے۔" میں نے دانستہ ابھی یوہورگا والے مجھے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ لارا کچھ کھنکھاتی سے کام لے لی مگر اس نے بدستور مکاریاں غاموشی اختیار کرتے ہوئے لاشعری کا رویہ قائم رکھا اور اپنے خار کھائے ساتھی جنگلی کی طرف دیکھا۔ اشارہ کیے بغیر جنگلی جیسے دشمنی اور دے کوہ فری ونڈ دے چکی تھی۔ کچھ دیر بعد جنگلی نے پیش انداز میں دوبارہ میری جانب بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑا پھر اٹھا کر مجھے کمر پر گرانے کے سے انداز میں بٹھا دیا اور تھرا آلود لہجے میں غرا کر بولا۔

"اب ایک لفظ بھی نادام کے لیے منہ سے نکالا تو میرا حشر خارش کھائے کتے کی طرح کر ڈالوں گا۔" اس نے یہ بات میرے چہرے کے اتنے قریب ہو کر کہی کہ اس کے سوراخ جیسے تھوٹے سے جھانک کے جھپٹے اڑتے میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیے۔ مجھے اس ناپاک درد سے کراہت آنے لگی لیکن اس نازک موقع پر بھی اسے جواب دینے سے خود کو روک نہ سکا۔

"مار کھائے ہوئے بزدل سورا میرے ہاتھ کھول کر دیکھ۔ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ کون کس کا خارش زدہ کتے والا حشر کرتا ہے۔"

میرے اس جواب نے جنگلی کے تن بدن میں جیسے آگ لگا دی۔ اس کی سورا جیسی جتنی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے سلسلے میں کوئی انتہائی قدم اٹھاتا، لارا کی آواز نے اسے روک دیا۔

"جنگلی! یہ تمہیں نہیں دلاتا رہے گا اور ہمارا وقت ضائع کرتا رہے گا۔ کام کی بات پوچھا اس سے۔۔۔ یہ سب چھوڑ دو۔"

جنگی بیٹا کروہ کا پھر لارا غور آئے بڑی اور جنگی کو
 پیچھے ہٹا دیا۔ ہینا کی کھٹی کھٹی چٹکیں مجھے بے چین کیے دے
 رہی تھیں۔ لارا میرے قریب آکر مکارانہ فریادیں سے بولی۔
 ”دیریشان! اس قسم کدواں۔ وہ مجھ سے میرے حوالے
 کرو بغیر کسی ڈینگ کے ہم چلے جائیں گے یہاں سے۔“
 میں پہلے تو خوفزدہ نظروں سے اس مکار عورت کو گھورتا
 رہا پھر اسی لمحے میں بولا۔

”لارا! تم نے یہ میرے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔“
 ”تم ہاتھ پاؤں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔“
 لارا درمیان میں بولی۔

”ہماری بوٹ کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ نیپالی اور تبتی
 فورسز سے جان بچا کر ہم پہاڑی نالے میں بوٹ سمیت
 جا کر رہے تھے۔ وہاں سے بچتے بچاتے یہاں تک پہنچے۔“
 میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔
 ”لارا کی بھویں سکھ گئیں۔ نیلی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔
 پھر وہ بولی۔ ”فراسٹر تمہارے پاس موجود تھا۔ میں نے نہیں
 ہدایت کر دی تھی کہ کپل ہل کی اطلاع مجھے دیتے رہو۔“

ہینا تکیٹ اور جریان خون کی وجہ سے ہنوز کراہ رہی
 تھی۔ صوبی بے جا اس دشت زدہ ماحول کے باوجود
 اس کی مدد کرنے کے لیے ڈرتے ڈرتے اس کی جانب بڑھی
 تھی مگر وہ دوڑتی گئی بے دردی سے اسے بالوں سے پکڑ کر
 پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے دونوں مصوم بچے ماں کی پیچ پر رو
 پڑے۔ لارا کے دوسرا سہیلی انہیں ڈرا دھکا کر خاموش کرانے
 کی کوشش کرنے لگے۔ میونگ نے اپنی بیوی کو سنبھال لیا۔

”لارا! یہ میری ساسی ہے۔ اسے کچھ نہیں ہونا
 چاہیے۔“ میں نے کہا۔ لارا نے ہینا کی طرف دیکھا۔ میں
 بھر بولا۔ ”اس عورت کو اجازت دو وہ اسے سنبھال لے ورنہ
 ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہے، وہ سب ختم ہو جائے گا۔ ضد
 کا میں بھی کچھ نہیں ہوں۔“

میرے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا کہ لارا نے ایک گہری
 سانس لے کر صوبی کو اجازت دے دی۔ جنگی کے چہرے پر
 ناگواری کے آثار ابھرے۔ وہ بلند آواز میں لارا سے بولا۔

”مادام! یہ اس کی کمزوری گئی ہے ورنہ یہ مجھے کے
 بارے میں کبھی نہیں بتائے گا۔“
 جنگی ایک نمبر کا زہل آوی تھا۔ ہینا سے متعلق میری
 ”جینتی“ کو سمجھنا ہی تھا لیکن راز کھیلنا میں بھی جانتا تھا۔

میں نے کہا۔
 ”مجھے کسی تلاش کے لیے تم لوگوں کو اب بھی میری
 جنگی غرایا پھر اس نے اپنے لباس سے حیرت و حاد قردلی

ضرورت پرستی ہے۔“ میں نے ایسا ہم اچھا تھا کہ لارا
 سمیت جنگی بھی بری طرح چونکے۔
 ”تلاش۔۔۔ کیا مطلب؟“ لارا کے منہ سے برآمد

ہوا۔ میرا خیال خشک نکلا۔ وہ مجھے صحیح سلامت یہاں پا کر
 سمجھے تھے کہ مجھ سے ہی پاس ہے اور میں اتنی آسانی
 سے انہیں نہیں بتاؤں گا لہذا مجھ پر دہشت جھا کر وہ اسے
 حاصل کرنے کی تک دوڑ میں تھے۔

”میں نے بتایا تھا کہ بوٹ کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ مجھے
 سمیت دوسرا سہیلی بھی بچتے پہاڑی نالے سے بچے جا کر رہے
 تھے۔“ میں نے چال جاری رکھی۔ ”مجھ سے جس جگہ پانی میں
 غرق ہوا وہ مقام مجھے از رہے۔“

”اوہ۔“ لارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میرا دل
 اندر سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ
 لارا کو میرے مجبوت پر بچ کا گمان ہوا تھا۔

”مادام! یہ کیوں کر رہا ہے۔“ جنگی غرایا۔ ”مجھ
 اسی مکان میں چھپا رکھا ہے۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ تلاشی لو پورے مکان
 کی۔“ لارا نے انہیں حکم دیا۔ آن کی آن میں ان بدبختوں نے
 سارا گھر اٹھ دیا۔ مجھ سے ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ صوبی اور میونگ
 سے بھی ڈرا دھکا کر پوچھا گیا تھا۔ ان بے چاروں کو بھلا کیا
 معلوم تھا۔ انہوں نے لاکھ لاکھ کا اٹھارہ لاکھ تو ان پر تشدد کیا گیا۔

ہینا بے ہوش ہو چکی تھی۔ لارا نے صوبی کو اسے
 سنبھالنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اب مکان میں سب
 کچھ بکھر چکا تھا۔ مجھے آنکھوں پور ہوا تھا کہ میری وجہ سے

میرے مہربان میزبانوں کو یہ سب برداشت کرنا پڑا تھا۔
 میرے دماغ میں پھل پھل مچھلی ہوئی تھی۔ میرے اندر ایک
 طوفان تھا جو اٹنے کو بے چین تھا۔ ایک آتش فشاں اندر ہی
 اندر اٹھنے لگا تھا۔

ہر طرح سے ناکام ہونے کے بعد جنگی پھرے ہوئے
 سواری کی طرح بے ہوش اور نیم مردہ حالت میں پڑی ہینا کی
 طرف لپکا۔ صوبی کو ایک بار پھر اس نے بے دردی سے پرے
 دھکیل دیا اور ہینا کو گردن سے پکڑ کر بوجھ لیا اور پھر گردن موڑ
 کر سفاک لہجے میں غراتے ہوئے مجھ سے بولا۔

”شیان! آخری موقع دے رہا ہوں۔ مجھ کہاں ہے؟“
 جنگی کی اس بے رحمی پر میرا خون گھولنے لگا۔ میں نے کہا۔
 ”جنگی! میں نے کہا تھا مجھے تک میں تم لوگوں کی رسائی
 میں مدد کر سکتا ہوں۔“

جنگی غرایا پھر اس نے اپنے لباس سے حیرت و حاد قردلی

سبب ذالجت 148 مارچ 2024

”اوہ، کیا تم نے پاس کو سب بتا ڈالا؟“ جنگی کے لہجے
 میں تلخی عود کر آئی۔
 ”اور تمہارا کیا خیال ہے، پاس سے یہ پہچانی میں؟“
 جبکہ وہ خود یہاں پہنچ رہا ہے۔

”میں یہیں صحت سے کام لیتا جا رہا تھا۔“ جنگی بولا۔
 ”مثلاً؟“ لارا نے ٹھٹھا کر بولی۔
 ”جنگی! تم کہہ کر میاں کیے بالکل قریب ہیں۔ لیکن تم

نے ساری بات بتا کر پاس کو نہ صرف بدل کر دیا بلکہ یہاں
 آنے پر بھی مجبور کر ڈالا۔ اب ہم آزادی سے کام نہیں
 کر پائیں گے۔“

”تمہارے اس آزادانہ کام کے طریقے سے پاس پہلے
 ہی عاجز ہے۔“ لارا بولی۔ ”کاش! میں تمہارا کمانہ مانتی۔“
 لارا اور اس کا سر چڑھا سہیلی جنگی ایک دوسرے سے

الٹے گئے تھے۔ میں غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ صحرائی
 عقاب کا بگ باس یعنی البرٹ رنڈو خود بھی کا پڑ رہا تھا۔
 آ رہا تھا۔ اس خبر پر میں بھی چونکا تھا۔ شاید وہ نیپال یا
 بھارت کے کسی شہر میں عارضی طور پر فروکش تھا۔

ان کی بحث جاری تھی۔
 ”مت بھولو لارا! ڈرا دھکا کہ اس سے پہلے دو مہمات
 کا میں بھی نائب بن چکا ہوں۔“ جنگی کے لہجے میں غرات تھا۔

”اور تمہاری ان دو مہمات کی ناکامی کو میں ہی نہیں،
 پاس بھی نہیں بھولا ہے۔ اسی لیے اس بار مجھے نائب بنا کر اس
 نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ میری ہی عقل ماری تھی کہ

تمہاری باتوں میں آگئی۔“ لارا کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھا۔
 ”اس میں پاس کی فطرتی پالیسی کا دخل تھا۔ میرا قصور
 نہیں تھا۔“ جنگی بے پرواہی میں بولا۔ ”لارا! ڈیر! اب بھی

تم میری پالیسی پر عمل کرتی رہو تو دو مہمات میں مجھ سے ہمارے
 پاس ہوگا۔“
 ”تم بہت جاہل اور گنوار ہو۔ مجھ شیان کے پاس

نہیں ہے۔“
 ”مجھ اسی نے ادھر کہیں چھپا رکھا ہے۔“ کہتے
 ہوئے جنگی نے میری جانب گھورا۔ ”مجھ کا سو فیصد خیال

درست تھا۔ اگر انہیں اس پہاڑی نالے کے کنارے گھاس
 پھوس کے گڑھے کا پتا چل جاتا تو یقیناً ان کی مہم کی کامیابی کا
 سرخیل جنگی کو ہی سمجھا جاتا۔

”میرا خیال ہے اب جبکہ پاس خود یہاں پہنچ ہی رہا
 ہے تو آپس میں اچھے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ ان کے دوسرے
 ساتھی نرڈی نے پہلی بار مداخلت کی۔ اس پر ان کا تیسرا

ساتھ نہ دیر کے کسی تاکید کی ہے۔“

سبب ذالجت 149 مارچ 2024

www.panhlo.com

www.panhlo.com

ساتھی بھی بولا۔
”میں خوش اور مطمئن ہونا چاہیے کہ اب اس مجیدہ
مسلے کو اس خود کر ویشل کر لے گا۔“

”تم سدا کے بدحو اور احمق ہی رہو گے چنڈا“ جنگلی
نے ہنسا کر اپنے آخر الذکر ساتھی کو بری طرح کھڑک دیا۔
دو ٹانف ہو کر بیک سا گیا۔ ”میں باس کو تکلیف دینا نہیں
چاہتا تھا۔ اس طرح ہمارا اس پر کیا اثر پڑے گا؟ کب
سے ہم اس منوں جیسے کو حاصل کرنے کے لیے خود ہورہے
ہیں۔ اب جبکہ اس کا سر اٹھنے کی امید بلکہ سمجھوں ہی کیا
ہے تو لارے نے اصرار نہ کیا کہ وہ باور باس کو۔۔۔“

”فلا۔“ لارے نے جنگلی کی بات کاٹ دی۔ ”باس
کا کیا پتہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ میں نے اسے یہاں
آنے کا کب کہا؟ میں تو پابندی کہ اسے مجھے کی تلاش اور
کامیابی کے جائزے بارے میں ملے گی کی خبر دیتی رہوں
اور میں نے وہی کیا۔ باس کا اپنا فیصلہ ہے یہاں آنے
کا۔ شش!“

”ختم کرو۔“ جنگلی جھاکر بولا۔ ”مجھے ذرا اس سے بات
کرنے دو۔“ کہتے ہوئے وہ اپنے دونوں بازو ہلاتا ہوا قدم
چلا ہوا میرے قریب آ گیا اور چڑھتے ہوئے کھانچا جانے والی
نظروں سے گھورتا رہا پھر پھیرے دیکھ کر غراہٹ تے بولا۔
”اگر مجھے تم نے نہیں چھوڑا ہے تو ہمارے حوالے
کر دو اور جوڈیل ہم نے بیسوں کی راسخوں سے کر رکھی وہ
تھماری ہوئی۔ معاملہ ادھر ہی ختم ہو جائے گا۔ ہم اپنی راہ
لیں گے اور تم اپنی۔“

میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”جنگلی! میں اب بھی
اپنی بات اور ڈیل پر قائم ہوں لیکن تم نے ملاوٹ خور خراب
بھلا کر میرا دل خراب کر ڈالا لیکن پھر بھی میں یہ سب بھول
جانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر ایسا بائیں تم دوستانہ ماحول
میں کرو چیسوں کا مجھے کیا لاگ لگا ہے۔ مجھے جس مقام پر پانی
میں غرق ہوا ہے وہ جگہ مجھے یاد ہے۔ ہم وہاں سے۔۔۔“

”شٹ۔۔۔ شٹ۔۔۔ شٹ۔۔۔“ جنگلی حسب عادت
پاٹھوں کی طرح پھر گیا۔ میری بات درمیان میں رہ گئی۔
اس نے جھلا کر ایک ٹھوکر میرے کندھے پر رسید کر دیا۔ میں
اس تکلیف کو سہہ گیا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ میرے
آگے جھک آیا اور غرائے ہوئے بولا۔
”مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہمارے ساتھ بٹ کر رہے
ہو۔ مجھے تم نے ادھر ہی نہیں چھوڑا تھا ہے۔ ٹھہرو میں ابھی
بتاؤں۔“

یہ کہہ کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہم سب اس کی طرف
نکتے رہ گئے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک لمبی
سانس اندر کھینچے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ اس قدر
لگا۔ اس نے جب اچھی طرح ہوا اپنے پیچھے پھوڑوں میں مہل
تو دھیں رک گیا۔

میں نے بھی بھٹی بھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ
سرخ ہو چلا تھا۔ اس نے سانس اندر کھینچنے کے بعد روک کر
مٹی اور اس کے ہونٹ یوں مل رہے تھے جیسے کوئی مہتر جتر
پڑھ رہا ہو۔ محتاط انداز سے کے مطابق اس نے دو ٹانف
سانس اسی طرح اندر بھر کر روکے رکھی۔ اس کے بعد
دو جیسے دھیرے اس نے سانس باہر نکالی اور ساتھ ہی اپنی
آنکھیں بھی کھول لیں۔

میں نے دیکھا اس کے بدن پر تھوٹے تھوٹے پر بڑی سبکیں
سکراہٹ تھیں۔ مجھے لگا یہ سورج پھر پڑے گا لیکن وہ
جیسے ایک میکانیکی انداز میں گھوما اور اس کا سر بے ہوش پڑی
ہینا کی طرف ہو گیا جہاں بیون کی دم دل بیوی صوبی اس کی
تیار داری میں مصروف تھی۔ نہ جانے کیوں جنگلی کے اس انداز
نے مجھے اندر سے ایک لمحے کے لیے دھلا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

اس چھوٹے سے رفاتی مکان کی محدود فضا لکھت دم
نہو دی ہو گئی۔ اس بد بخت سوری شکل والے جنگلی نے نہ
جانے کون سا مہتر جتر پڑھا تھا کہ اسے ہینا پر کچھ شہ ہوا
تھا۔ کیا؟ یہ ابھی نامعلوم تھا۔ میں سناٹے میں آ گیا۔
نہ جانے اب یہ خنزیر انشل ہینا کی طرف کیوں توجہ
ہوا تھا جبکہ وہ ابھی تک اپنے حواسوں میں ہی نہ تھی۔ لارہ،
نرؤی اور جیڈ بھی اسی کی طرف نکتے جارہے تھے۔ میری
نظروں اسی پر جمی رہیں۔ وہ قریب پہنچا۔ صوبی کی مٹی۔

”اس کی حالت کب تک بہتر ہو جائے گی؟“ جنگلی
نے سہا لہجے میں اس سے پوچھا۔
”کک۔۔۔ کچھ وقت لگے گا؟“ صوبی نے ڈرے
سہ لہجے میں کہا۔
”کتنا؟“
”کچھ گھنٹے۔۔۔“

”میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ بات
کرنے کے قابل کب تک ہو جائے گی؟“
”میں کوشش کرتی ہوں کہ یہ تم سے تھوڑی بہت بات
کر سکے۔“
”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں اور تم اپنا کام
سنبھالو۔“

جنگ ہاؤ

”جنگلی بولا پھر میری جانب بڑھا۔ ہم دونوں کی نظریں
میں جھپکی۔ آخر تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟“ لارے نے بے
جانی سے پوچھا۔

”جنگلی کی ساتھی کے منہ سے مجھے کے متعلق کچ
اگر ڈال گا۔ اسے سب معلوم ہے۔ مجھے مقدس آبوری کی قسم
ہے۔ اس نے مجھے بھی اشارہ دیا ہے۔“ جنگلی نے جواب
دیا۔ نہ جانے یہ آبوری کیا بلا تھی؟ شاید یہ اس کا پجاری تھا، اس
کا کوئی فریضہ دینا تھا۔۔۔ کون تھا۔ میں نے اس پر لعنت
بھجی۔ لارہ بولی۔
”مگر شیان ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہے۔“ لارہ

نے اسے سمجھایا۔
”میں ہمارے ساتھ فیر نہیں ہے۔“ جنگلی نے میری
طرف گھور کر لارہ سے کہا اور اس کا خیال یا خدشہ سو فیصد
درست تھا۔ یہ اس کا اندازہ تھا اور قیاساً تم ہی غلط ثابت
ہوتے ہیں۔ لارے نے پرسوج انداز میں اپنے ہونٹ میچھ لیے
اور اشیاء انگیزہ گاہوں سے مجھے نکتے کی پھر جنگلی سے بولی۔
”ہم اس کی ساتھی کو اس وقت تک ریغمال بنا کر
رکھیں گے جب تک کہ یہ بوسور گا کے مجھے تک ہماری
درست راہنمائی نہیں کر دیتا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ شیان، میں
اور نرؤی ابھی یہاں سے جارہے ہیں۔ تم اور جیڈ یہیں
رکو۔“ جنگلی نے جیسے اپنا جتنی فیصلہ سنا دیا۔ اس نامراد کا
فیصلہ سن کر میرے اندر مسرت چھٹی۔
میں مہلت ملنے کا منتظر تھا۔ بعد میں جنگلی اور نرؤی کو
میں پچھا کر دو بارہ یہاں کا رخ کر سکتا تھا۔

”مجھے تمہارا یہ فیصلہ قبول ہے۔“ یہ مسرت تلے میری
جلد بازی تھی کہ میں نے جنگلی سے ایسا کہہ دیا لیکن وہ لکھت
دکارانہ مسکراہٹ تلے مجھ سے سرسرا تے لہجے میں بولا۔
”میں سب جانتا ہوں۔ تمہیں بھی، تمہارے ذہن
میں ملنے والے منصوبے کو بھی۔“ اس کی بات پر میں اندر
سے ذرا خفیف سا ہوا۔

”تم راہ میں کوئی گل کھلانے کی اسکیم پر غور کر رہے
ہو۔“ وہ زہریلے لہجے میں دوبارہ بولا۔ ”مگر یاد رکھنا یہ تمہاری
مخ نام خیالی ہوگی۔“ کہتے ہوئے وہ لارہ کی جانب گھوما۔
”تم ہر میں منٹ بعد ٹرا ٹریسٹر پر مجھ سے اور نرؤی
سے رابطے میں رہو گی۔ جہاں بھی دیر ہوں کچھ لینا اس نے
ٹانے ساتھ کوئی دھوکا کیا ہے۔ سزا کے طور پر نہ صرف اس

کی زخمی ساتھی (شینا) کو بلکہ اس مکان کو کراک لگا دینا۔ اس
کے میزبانوں کو کسی پھر زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔“
اس رڈیل کی بات نے مجھے تھوڑا پریشان کر دیا۔ وہ
بے شک ایک درندہ صفت انسان تھا مگر اصل سے بددل بھی
نہیں تھا۔ وہ نہ تو اس فطرت کے لوگ دروغ اور اصل کا کم ہی
استعمال کرتے ہیں۔ تاہم میں پھر بھی ناامید نہ تھا۔

”تم سن رہے ہو؟ شیان؟ اسی نے کسی جالاک کا خیال
بھی اپنے دل میں مت لا۔“ جنگلی نے مجھے بھی تہدید کر ڈالی۔
”اور باس کا کیا کریں؟ وہ یہاں کچھ رہا ہے۔“ لارہ
نے سوالیہ نگاہوں سے جنگلی کی طرف دیکھا۔
”جتنے دوا سے ہم نکل جاتے ہیں۔“ جنگلی نے بے
پردہ لہجے میں کہا۔

”میں باس کا انتظار کر لیتا جاؤں۔ اتنی جلد بازی
ٹھیک نہیں۔ باس ناراض ہو سکتا ہے۔ تم اپنا پلان اس کے
سامنے رکھ دینا۔“ لارے نے کہا۔ جنگلی نے ہونٹ میچھ لیے۔
لارہ نے بات جاری رکھی۔
”وہ کھنڈہ اب تک روانہ ہو چکا ہوگا۔ ڈیڑھ
سے دو گھنٹے یہاں تک پہنچنے میں لگ ہی جائیں گے۔“

میں اس کی بات پر ہلکا اور بے سوچے پھر نہ زور سکا کہ
اس منوں جیسے بوسور کا کئی اہمیت کی کران کا باس خود اس
کے حصول کے لیے میدان میں اترا ہوا تھا۔ یہ لوگ غیر ملکی
تھے۔ یورپین یا امریکی ہو سکتے تھے۔ ضرور ان کا اصل
ٹھکانہ کورہ غطوں میں کہیں ہو سکتا تھا۔

”چلو، پھر کچھ شیان ہی اڑاتے ہیں۔“ جنگلی نے
ایک دم تہمت لگا یا اور صوبی سے پوچھ کمانے پنے کولانے کا حکم
دیا۔ وہ بے جا رہی خاموشی سے اٹھی اور جنگلی کی طرف بڑھ گئی۔
میون نے کچن میں بیوی کے پیچھے جانے کی کوشش کی
مگر مرد جنگلی نے اسے روک دیا۔ البتہ دونوں بچوں کو اس
نے ماں کے پیچھے بھاگ دیا۔

میں جنگلی کی بدعاشی اور جالاکا پر اندر ہی اندر
کھولنے لگا۔ جگڑہ کھولنے کی میری خاموشی اور دھمکی تک
دو دو جا رہی تھی۔ میں بار بار گردن تھوڑی گھما کر ہینا کو دیکھنے
لگا تو مکار لارہ اور جنگلی مجھے غور سے نکتے لگتے۔
ہینا کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے جس جان کنی کے
آچار تھے، وہ اب بدترنم کھولنے لگے تھے۔ صوبی کا یہ
احسان تھا کہ اس نازک اور خطرناک حالات میں بھی وہ ہینا
کی تیار داری کرتی رہی تھی حالانکہ خود اس کی فیملی پر غصہ
منڈلا رہا تھا۔

شاید کے آخری پہر ان روٹیوں نے دھوکے میں
 دھکیلا تھا۔ اب شاید صبح ہونے والی تھی۔ صوبی بے چاری
 کچھ دیر بعد سب کے لیے ناشا بنالائی۔ وہ چاروں مشینوں
 پر مشینوں کی طرح تھپتھپاتے پر ٹوٹ پڑے۔ مجھے باکی اور کو ان
 روٹیوں نے پوچھا کہ میں اور سب جٹ کر گئے۔
 جنگی نے ایک ڈکالری اور اٹھ کھڑا ہوا اور لارے
 بولا۔ ”میں اور نرڈی اس کے ساتھ روانہ ہو رہے ہیں۔“
 اس نے جیسے فیصلہ سنا۔ اشارہ میری طرف تھا اور پھر میونخ
 سے جھکنا دیکھ رہی تھی۔
 ”جاؤ، جا کر اپنا جھنڈا تیار کرو۔“ میونخ نے اثبات
 میں سر ہلایا اور بالکل جنگی، نرڈی کو کچھ ہدایات دینے
 کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”جی ہاں۔“

”میں مارٹر؟“ جیٹ نے متوجہ بنایا۔
 ”مادام لارا کا خیال رکھنا۔ اسے تسلی دیتے رہنا۔ یہ
 جلد پریشان ہو جائی ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے پاس کھڑی
 لارا کو آگے ماری۔ وہ مسنوی لنگھی سے مسکادی۔ جنگی نے بے
 لنگھی سے آگے بڑھ کر اس کا پورے لے لیا۔
 ”ڈارنگ! پریشان مت ہونا۔ جنگی کی طاقت پر
 تمہیں بھروسہ ہے؟“
 ”دو تھے لیکن جنگی ڈیرے بغیر بہت خطرناک معلوم
 ہوتا ہے۔ اس پر گڑی نظر رکھنا۔“ لارے نے اس سے کہا۔ اس
 کا اشارہ میری طرف تھا۔ وہ مجھ سے ڈری ہوئی تھی۔ شاید
 اس کی وجہ گزشتہ شب اپنے منہ پر مجھے سما کی جنگی کا میرے
 اٹھوٹے ہونے دیکھنا تھی۔
 ”تم گھر نہ کرو ڈارنگ!“ جنگی میری جانب ایک
 تھپک آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے لارے بولا۔ ”میں ایسوں
 کو کھیل ڈالنا اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”اس دوران میں پاس یہاں آ پہنچا تو اسے ہم کیا
 جواب دی؟“ یہ سوال جیٹ نے جنگی سے پوچھا۔
 ”کہہ دیا کہ مجھے بومبورگ کے مجھے کا ایک فوری
 سرائل مل گیا تھا۔“ جنگی سنجیدگی سے اس کی طرف مغموم کر
 بولا۔ ”تاہم یہ صورت میں وہ ہاتھ سے نکل جاتا۔ مجھے یقین
 ہے پاس مطمئن ہو جائے گا اور یوں بھی میں خالی ہاتھ نہیں
 لوٹوں گا۔ تم لوگ بس یہاں پر گڑی نظر رکھنا اور مسلسل مجھ
 سے رابطے میں رہنا۔“

ڈرا دیر بعد میونخ نے آکر اسے بتایا کہ باہر پھلکا

تیار ہے۔ شاید وہ بھی خوش تھا کہ یہ درندہ مفت آدمی یہاں
 سے جھلٹل جائے لیکن پاس کی آمد اور اس کے دیگر ساتھیوں
 کی بدستور یہاں موجودی پر دونوں غریب میزبان میاں
 بوی بہر حال پریشان ضرور تھے۔
 میں جنگی کے ساتھ جانے پر بالکل بھی رضامند نہیں
 تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں لیکن ”مہلت“ کے سبب میں
 اس درندہ مفت جنگی پر قابو پاؤں گا، مجبور تھا۔ اگرچہ اس
 نے بھی چال چلتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہی خدشہ بدرجہا
 موجود تھا کہ میں اس مہلت سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکا
 ہوں۔ اسی لیے اس نے پہلے ہی یہاں اپنے ساتھیوں کو
 خبردار کر دیا تھا کہ وہ اس سے اور وہ ان سے مسلسل رابطے
 میں رہے۔ رابطہ نہ ہونے کی صورت میں وہ نہ صرف دنیا
 ہلا کر ڈالنے بلکہ میرے ان مہربان میاں بوی کو بھی جان
 سے مار کر ان کے مکان کو آگ لگا دیتے۔ یہ تاہم اد جنگی کی
 میرے خلاف بلاشبہ ایک خطرناک چال تھی۔ سوچنا تھا کہ
 اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ صورت حال سمجھ رہی تھی تاہم
 ایک خیال کے تحت میں نے احتجاج جان سے کہا۔

”دیکھو، مجھے اب بومبورگ کے مجھے سے کوئی دلچسپی
 رہی ہے نہ ہی پیسوں سے۔ اس وقت مجھے اپنی اور اپنی
 سامی کی جان سب سے زیادہ عزیز ہے لیکن راستے میں
 میری جانب سے کسی خطرے سے نمٹنے کا تمہارا یہ طریقہ
 خطرناک ہے۔ ہم کسی موٹی خرابی اور حادثے یا کسی اور
 مصیبت کا بھی تو شکار ہو سکتے ہیں۔ ایسے میں ممکن ہے کہ جنگی
 یا نرڈی، مادام لارا یا جیٹ سے لاسکی رابطہ نہ کر سکیں تو پھر
 میں بھی اس ڈر یا خدشے سے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا
 کہ تم نے یہ سمجھ کر اس مکان کو آگ لگا دی اور میری زندگی
 سامی (حیثیت) کو بھی مار ڈالا۔“

میری یہ احتجاجی گفتگو ان لوگوں نے بڑے غور سے
 سنی پھر لارے نے جنگی کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جیسے اس
 سے کہہ رہی ہو کہ میری بات کا وہی جواب دے۔
 ”مث! اپ!“ جواب میں جنگی میری جانب دیکھ کر
 چرخش آواز میں چپٹا۔ ”زیادہ جالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ تم
 نے وہی کرنا ہے جو ہم بہتر سمجھیں گے۔ چلو آگے بڑھو۔“
 مجھے پورا یقین تھا کہ اسی طرح میرا یہ احتجاج رد کر دیا
 جائے گا لیکن میرا احتجاج انہیں یہ یاد کرانے میں کامیاب
 ہو گیا تھا کہ یہ لوگ (بخصوص لارا) اتنی جلدی یہ خطرناک
 اقدام نہیں اٹھا سکیں گے۔ میں نے جو بات ان کے (لارا)
 کے ذہن میں ڈالنا تھی، وہ ڈال دی تھی۔

وہ مارا اور جالاک ضرور تھی لیکن جنگی اور نرڈی وغیرہ
 کی طرح جوش سے کام لینے کی بہر حال عادی نہ تھی۔ یہ میرا
 محض قیاس تھا، یقین نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ میں بے بسی میں
 محض کچھ چھوڑے ہوئے خطرات کو جس قدر کم کر سکتا تھا اس
 اپنے کچھ کوشش تو کی تھی۔ اب آگے اللہ مالک تھا۔
 کی میں نے باور کروانا بھی مقصود تھا کہ ایسی صورت میں، میں
 لارا کو یہ یاد کروانا بھی مقصود تھا کہ مجھے جیٹ کا شکار رہنا
 جنگی اور نرڈی کے ہمراہ چلا تو کیا تھا مگر یہ جیٹ کا شکار رہنا
 پھر جیٹ کے اور متوقع صورت حال میں، میں بھی ان کے
 ”کام“ آئے میں پھر پھر سے کام لے سکتا تھا جب تک کسی
 نلی کی تصدیق نہ ہو جاتی۔۔۔۔۔ وغیرہ۔
 ☆☆☆

القہ۔ مجھے اسی طرح رن بستہ حالت میں ہی لے
 جایا۔ نرڈی نے جنگی کے اشارے پر مجھے کھڑا کیا اور پھر
 ہم تینوں باہر آگئے۔ باہر کاٹ دار سرد ہوا میں چل رہی
 تھی۔ ہر طرف برف زار کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ٹیڈ
 منڈر دھنوں کی میڑمی میڑمی شاخوں پر جمی ہوئی برف عجیب
 منظر پیش کر رہی تھی۔ ہم نے گرم لباس پہن کر رکے تھے۔
 باہر پھلکا تیار تھا۔ میونخ کو شاید اپنے پچھلے پیار تھا۔
 اس نے اسے سردی سے بچانے کے لیے اس کے جسم پر موٹا
 سا پورا ڈال رکھا تھا حالانکہ اس جانور کو اس کی ضرورت نہ تھی۔
 ہلی برف باری ہو رہی تھی۔ چاروں طرف جائزہ
 لینے کے دوران ایک طرف مجھے سفید سفید برف کی چادر پر
 سرخ خون کے دھبے پڑے نظر آئے۔ اس پر بھی برف
 پڑی ہوئی تھی۔ میرا دل گھٹ گیا۔ وہ میرے غریب
 میزبانوں کے ہاتھ کتے کا ہی ہو سکتا تھا جسے سفاک جنگی کے
 سامی نرڈی نے اسی کے کہنے پر باہر لے جا کر پھینک دیا۔ شاید
 اس بے زبان کو ذبح کر کے برف میں ہی اس کی لاش دبا دی
 تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ جنگی سیت نرڈی کی پوٹیاں
 لوچ ڈالے۔

چمچ کا چوبی تختہ خاصا کشادہ تھا۔ اس پر چاروں طرف
 موٹی چادر کا خمیر بنایا گیا تھا۔ اس سے آگے ایک چھوٹے
 اضافی تختے کا پلیٹ فارم تھا جس پر پچھلے چمچ کی لگا میں تمام
 لی جاتی تھیں۔

میونخ کو ساتھ لے لیا گیا تھا۔ رخصت ہونے سے
 پہلے اسے اپنی بوی اور دونوں بچوں سے ملنے دیا گیا تھا۔ وہ
 سب پریشان تھے۔ ہم تینوں اندر نیچے میں جا بیٹھے اور میونخ
 نے ایک شاخ نما چاک باکھ میں تمام کیا اور چوبی پلیٹ
 فارم پر چڑھ کر چمچ کی لگا میں تمام لیں۔

سرد خیم میں ہمارا پھر خطر اور اندیشہ ک دھنوں سے
 بھرا سفر شروع ہوا۔ میں نے اس پہاڑی ٹالے کی یک
 درست نشاندہی کر دی تھی کہ میری ترشید غرضی کہانی کے
 مطابق بومبورگ کا جسر شرقی آب تھا۔
 پھر یہی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ میونخ یہاں کے
 راستوں کا وہیہ دور تھا۔ ہلی برف باری بھی اب رک گئی تھی۔
 سرد ہواؤں میں بھی کی واضح ہونے لگی۔ موسم کچھ بہتر ہونے
 کی وجہ سے جنگی نے خیمے سے نکل کر باہر کی راہ لی اور وہ اس
 چوبی پلیٹ فارم پر میونخ کے برابر میں جا بیٹھا۔ کبھی کبھی
 ہلی اوجھ کی چمک نظر آنے لگتی۔

اب میں اور نرڈی خیمے کے اندر تھے۔ نرڈی کبھی
 مجھے گھور گھور کر دیکھتا تھا پھر اس نے سگریٹ نکال کر سٹکا لیا۔
 ایک اور سگریٹ سٹکا کر اس نے اندر سے ہی باہر جنگی کو بھی
 تھکادیا۔ میرے اندازے کے مطابق میں مطلوبہ مقام تک
 پہنچنے میں نصف سے یوں گھٹا یا اس سے بھی زیادہ کا وقت
 لگ سکتا تھا۔ رات بھر بھی تیر، کبھی ہلی برف باری ہوتی رہی
 تھی اور راتے ڈھک گئے تھے۔ سفر جاری رہا۔

میں نے اس ”پلیٹ بھرت“ کے دوران اپنے
 ہاتھوں کی جگہ بندوں پر دوبارہ اور اس بار ”آزادانہ“ زور
 آزما کر شروع کر دی کیونکہ مجھے گاڑی میں اب بٹنے جلنے
 کے دوران مجھے زور آزما کر کاٹنا ہی حاصل رہا تھا۔ اگرچہ نرڈی
 نے مجھ پر بھی نگاہ رکھی تھی لیکن وہ بہر حال جنگی کی طرح
 ہوشیار اور چونکا کم ہی نظر آتا تھا۔ وہ زیادہ تر تباہ کوشش کیے
 جا رہا تھا۔

ایک بار مجھے ذرا پھنسی ہوئی موٹی گرہ توڑنے یا
 کھولنے کے لیے کچھ زیادہ ہی زور لگا کر پڑا تو میرے جسم کی
 مخصوص حرکت نے نرڈی کو شہے میں جھٹکا کر دیا۔ وہ ایک دم
 میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میں ڈر سا گیا۔ اگر یہ گھنٹ
 شہے میں پڑ جاتا تو مشکل پڑ سکتی تھی۔ جب ہی اس کا دھیان
 ہٹانے کے لیے میں نے سٹکا کر اس سے کہا۔

”دوست! تم اکیلے ہی سٹکا کر اس سے جا رہے ہو۔ کیا
 مجھے نہیں پوچھو گے؟“

میری بات پر اس کی توجہ بٹ گئی۔ زہر خنہ لہجے میں
 بولا۔ ”تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتے اور یہ تم کیا کر رہے ہو؟“
 ”کیا کر رہا ہوں؟“ میں نے بھی ہنسنے بن کر پوچھا۔
 ”تم کچھ زیادہ مل جل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“
 ”مجھے پیشاب آ رہا تھا۔ اسے روکنے کی کوشش کر رہا
 تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ اندر سے میں ڈرتا رہا۔ اگر اسے

رہا۔ معاملہ اور صورت حال مزید کسبیر ہو چکی تھی۔ ستر جاری تھا کہ جاری طور پر کسی منزل بدل گئی تھی۔
 کافی دیر بعد میرے تھوڑے سے تھیں اور آگ کی بو مگرانے لگی۔ نیچے کے سو رانوں سے میں نے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ دھوپ کی چمک اور سفیدی میں مجھے ٹھکانا پر محسوس ہوا۔ یہ سیاہ دھوپ کے بادل تھے جو ان میں مدغم ہو رہے تھے۔

مجھ کی تیز آواز میں میوٹ کو چمکڑا روکنے کا کہا۔ وہ رک گیا۔
 ”نڑی! باہر اترو۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔“ جیسا چلا یا۔ نڑی فوراً حرکت میں آیا اور چمکڑے سے اتر گیا۔ میں بھی باہر کا ”تماشا“ دیکھنے کا تھی تھا کہ اوڑھائی البرٹ رمنڈ کا بیلی کا پٹر تھا اور ہم کیا اس کے تباہ حال لیے کے قریب پہنچ چکے تھے؟

چمکڑے کے نیچے کے اندر تھا ہوتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنی سی ٹیگ دو شروع کر دی۔ اس بار کچنوں نے مجھے باندھنے میں ذرا سی بھی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں بھی اپنے جسم کا پورا زور پوری طاقت صرف کرنے میں لگا رہا۔ آزادی تھی۔ میری اس کوشش کو دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ وقت ضائع کیے بغیر میں اسی میں لگا رہا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں گوندا۔ میں نے ہولے سے میوٹ کو آواز دی۔ جیسا اور نڑی شاید بدحواسی یا پریشانی میں اسے وہیں چھوڑ گئے تھے۔
 ”میوٹ۔۔۔۔۔ میوٹ۔۔۔۔۔!“ میں نے پھر دو تین بار پکارا تو اس نے ہولے سے سرگوشی میں جواب دیا۔

”خدا کے لیے خاموش رہو۔ انہوں نے مجھ پر غصہ رکھی ہوئی ہے۔ مجھے یہاں سے ہٹنے سے بھی منع کر رکھا ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے انہوں سے دوست!“ میں دانستہ نہیں کر رہا تھا لیکن ناامید ہونا تو میں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے یہ موقع مجھے دوبارہ نہیں ملے گا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

”میوٹ! اس طرح بزدل اور بے بس رہے تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ کوئی تیز آگ یا چاقو وغیرہ اندر پھینک گئے ہوتو کوشش ضرور کرو لیکن ذرا جلدی۔“
 ”تنت۔۔۔۔۔ تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ خوف سے ہٹا یا۔ اس کی بزدلی اور بے وقوفی پر میں اندر ہی اندر تاؤ کھا کر رہ گیا۔

”تمہارا سر کاٹوں گا۔ بے وقوف آدمی! اپنے ہاتھوں میں دی کی رسیاں کاٹنے کی کوشش کروں گا۔“ میں جھلا کر بولا۔

”دل۔۔۔۔۔ لیکن وہ مجھے ایسی ویسی حرکت کرسٹے دیکھ کر کوئی مار دیں گے۔“
 ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک برف زار سٹائے میں ایک دھماکے کی آواز ابھری۔ یہ کوئی خانے کی آواز تھی۔ میرا دل دھک سے دھکا۔ لیکن اس نے چارے میوٹ کو گولی تو نہیں مار دی تھی ان رڈیلوں نے؟ پہلا اندیشہ ابھی ابھرا۔ میں نے میوٹ کو آواز دی۔

”تم ٹھیک تو ہوتا؟“
 ”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“
 میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ ”گوئی کس نے چلائی تھی؟“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک اور فائر ہوا۔ پھر تیسرا فائر۔ اس کے بعد باہر کسی کے زور سے بولنے اور چلانے کی آوازیں ابھریں۔ میری بھوپیں پرمسوج انداز میں ستر گئیں۔ یہ باہر کون سا خوشی مہل شروع ہو گیا تھا۔

دفعتاً کسی کے برف میں بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی ہمارے چمکڑے کے قریب آ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نیچے کے اندر ہونے کی وجہ سے میں باہر دیکھنے سے قاصر تھا۔ مجھے پرتشیش سی بے چینی نے آن گھیرا۔ میں بے بس تھا۔ ایسی حالت میں کسی بھی اچانک بجلی ہوئی خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

”میوٹ! اسے سنبھالو۔۔۔۔۔ اس کی مرہم پٹی کرو۔ جلدی۔۔۔۔۔ خبردار کسی چالاکی کا سوچنا مجھے نہیں ورنہ میں سب کچھ چھوڑ چھاؤں کہ تمہارے گھر کا رخ کروں گا اور بڑی بیدردی سے تمہارے بیوی بچوں کو جان سے مار ڈالوں گا، سمجھے۔۔۔۔۔ میں آتا ہوں۔“

یہ بجلی تھا۔ اس کا سانس نڑی شاید کسی نامعلوم جگہ میں ڈھکی ہو چکا تھا۔ میں بھی اندازہ لگا سکا تھا۔ پھر اچانک نیچے کا پردہ ہٹا اور میوٹ نے کراہتے ہوئے نڑی کو اندر میرے قریب ڈال دیا۔ میں بھی پٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھنے لگا۔ نڑی کے داغیں پہلو سے خون جاری تھا۔ وہاں پر شاید گولی لگی تھی۔

وہ کراہتے ہوئے گھر سے گھر سے سانس بھی کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور ہاتھ برف کے ذرات سے تھڑے ہوئے تھے۔ میوٹ نے اسے لٹا دیا اور ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ اس کے بعد باہر کود گیا۔ میں نے اپنی سی کوشش جاری رکھی اور نڑی کو آواز دی۔

”نڑی! ہوا کیا تھا؟ کس نے تم لوگوں پر ہٹا بولا ہے اور تمہیں گولی کس نے ماری؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فقط ہانپتے اور کراہتے ہوئے دھکا اور پھر اپنے پہلو کے زخم کو سہلانے لگا۔ مجھے میں عجیب قسم کی کھڑ بڑ ہونے لگی۔ میں چوٹکا۔ یہ چمکڑے کے نیچے سے آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھنے کے نیچے آواز اس کے نیچے سے آ رہی تھی۔ شاید یہ میوٹ تھا۔ مجھ اٹھانی سامان یا ٹول کی جگہ ہوتی ہے۔ شاید یہ میوٹ تھا۔ برف اٹھ کا پس یا اس قسم کی کوئی شے نکال رہا تھا۔

چھوڑی دیر بعد پھر ہر طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ چھوڑی دیر بعد پھر ہر طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ ہاں لگا جیسے کوئی اتنا سناٹا سنبھال گیا تھا یا پھر وہ آپس میں لڑتے مرنے ختم ہو چکے تھے۔

میوٹ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا کھال کا بنا تھا۔ مجھے اس نے وقف اور بزدل آدمی پر بری طرح طش آ رہا تھا۔ وہ نڑی کی مرہم پٹی کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے ایک بار پھر نڑی کی موجودگی کی بھی پروا کیے بغیر میوٹ کو پٹا۔

”یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو میوٹ! ہم پہلے سے زیادہ خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اسے چھوڑو اور میری رسیاں کھولو۔“

میوٹ نے ڈری سہی نظروں سے نڑی اور پھر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس سے اس قدر غصہ کی امید نہ تھی۔ زانی زنی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں ہونے کے باوجود بری بات پر غصے سے غرایا مگر کچھ نہ پایا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ مسلسل بے ہوشی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”میوٹ! کیا سوچ رہے ہو؟“ میں نے پھر اسے دکھا دیا۔ وہ نیچے کے پردے سے باہر خوفزدہ سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس پر شاید ان لوگوں کا مخصوص جنگی کا خوف بٹھا ہوا تھا۔
 دلالتے اور پردوں کو لیاں چلیں۔ ایک کوئی بد قسمتی ہے شاید پھر کے کہیں لگی یا پھر قریب کہیں برف میں دھنس گئی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے پھر چلا یا، اچھلا اور پھر اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ چمکڑے کو جھٹکا لٹکنے سے میں رن بہت حالت میں لڑاک کر نڑی کے اوپر آ رہا۔۔۔۔۔ اس کے حلق سے کراہت پھیل گئی۔ میوٹ بھی لڑھک گیا۔

چمکڑا اندھا دھند دوڑا جا رہا تھا۔ میں نڑی سمیت ان پلٹ رہا تھا۔ بندھے ہوئے ہونے کے سبب میں خود کو اپنے پنجے کر گرنے اور ادھر ادھر لڑھکنے سے نہیں بچا پارہا۔ نازک نڑی اور نیم بے ہوش نڑی کی حالت مجھ سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی۔

کے ڈھکی پہلو سے خون بہہ بہہ کر چمکڑے کے چوٹی فرش کو رنگین اور اس پر بھی خیال گولی ہوئی جاری تھی۔ میوٹ کا حال بھی میری ہی طرح تھا لیکن وہ سنبھالا لینے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرف کو کھینچ رہا تھا۔ وہ صبر بھر گھبرانے والا چوٹی پلٹ فارم تھا۔ وہ جا کر بدست چمکڑا قابو کرنے کی کوشش میں تھا۔

بڑی عجیب اور لاٹھیل کی صورت حال تھی۔ چمکڑا الٹ بھی سنبھال گیا مگر کسی گھر سے کھڑ میں جا کر نہ۔ جب تک میوٹ سنبھالا کے کراہتا، اسی وقت چمکڑے کو جیسے ایک طوفانی جھٹکا لگا۔ میرے انداز سے کے مطابق وہ کوئی دو تین فٹ سے بھی زیادہ اچھلا ہوا گا اور پھر دوبارہ بریلی زمین پر بیڑا تھا تو اس کے نیچے ہی ادھر کھڑے گئے۔ میں نے میوٹ کی چوٹی۔ خود میں بھی چلا اٹھا۔ میرا سر زور سے ایک چوٹی ڈنڈے سے ٹکرایا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆ ☆ ☆
 آٹھ گھنٹے پہلا احساس کاٹ دار سردی کا ہوا۔ اس کے بعد حواس اور بحال ہوئے تو زور کا احساس شدید ہو گیا۔ ایک دور کی شدید میں اس قدر ابھری کہ میرے وجود کو پٹا کر رکھ دیا۔ میں نے اس گہری چوٹ کو سہلانے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا۔ میں ہلے جلتے سے ہی قاصر تھا۔ سہلانے سے قاصر ہونے کے سبب دروند ہی محسوس ہوا۔

میں نے تکلیف کی شدت کو لیا اور سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ عقدہ کھلا کر سر پر ہی گہری چوٹ کی ٹیکہ لگا سے ہلانے کے سبب دروند گنا محسوس ہوا۔ اس قدر کہ میرے سر سے مارے اذیت کے چوٹی نکل گئی۔ سر پھوڑنے کی طرح دیکھنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے چوٹی ہوئی تاریکی کی چادر دوبارہ تن گئی۔ دماغ ایک بار پھر آؤف ہونے لگا۔

میں اپنے اندر بہت کمزوری اور تباہت محسوس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ مجھ پر نیم بے ہوش طاری ہو گئی۔ حواس پھر معطل ہونے لگے لیکن میں نے قوت ارادی کے بل پر خود کو بیداری کے عالم میں رکھا اور سر کو اس بار تھوڑا تھوڑا جھٹک دی۔ شکر رہا کہ میں دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہونے لگا۔

دن کا اچھلا ہوا طاری تھا۔ ہم کسی برف کے گڑھے میں گرے تھے لیکن نہیں، صرف میں تھا۔ مجھے یاد آیا میرے ہمراہ چمکڑے میں میوٹ اور نڑی بھی تھے۔ نڑی کی حالت تو غریبی لیکن وہ دونوں ہی نظر نہیں آتے۔
 گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن انہوں نے سر میں رن بہت حالت میں تھا۔ بل میں نہیں سنبھال تھا اور چٹانیں میں نہیں رہا۔

☆ ☆ ☆
 مارچ 2024

www.parthlo.com

انہام کنی آگ ہمیشہ کسی ناانصافی کے نتیجے میں بھڑکنی ہے... اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا کہ دل کی دنیا میں تلاطم برپا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسی آندھی چلی کہ تمام وعدے اور قسمیں ایک طرف اور بدلے کی آگ دوسری جانب... بالآخر محبت کے نام پر ہونے والی سازشوں نے نقاب اتارا اور انتقام کا چہرہ پہنا... پھر نتیجہ تو یہی نکلتا تھا جو نکلا۔

دلداروں کی بدعتی پر مبنی ایک دوشیزہ کا انتقام

چشمِ سیاہ

عائزہ احمد



”بہن مرتضیٰ! (دیکھیں تو مرتضیٰ) مجھے ایک بھی اچھا ہوئی نہیں مل رہا ہے۔ ہم اپنے اپنی مومن پر ایران تو جا رہے ہیں پر ہوئی کا مسئلہ ہی مل نہیں ہو رہا۔“ زلیخا ایران جانے کے لیے بہت ایکساٹڈ تھی۔

صبح سے زلیخا اپنے موبائل پر ایران کے شہر تہران میں ہونے والے مصروف تھی۔ شام ہو چکی تھی اور اسے ابھی تک کوئی ہوئی پسند نہیں آیا تھا۔ اتنے میں مرتضیٰ کمرے کے اندر آئے اور تھکا ہارا دفتر سے آیا تھا۔

میں تو میں خود بھی جھٹکا تھا کہ یہ اس بزرگ اور سنگین وقت میں کون سی بلا چاک میرے سامنے آئی تھی۔
”یقیناً میرا ہی گھر ہے لیکن تم اسے بارے میں کیا کہنا پند کرو گی؟“ میں نے پوچھا۔ اس کی بات پر میں نے ہلکے سے چوکا ضرور تھا کہ آخرا سے کیوں پریشانی ہو رہی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ میرے محسوس اور غریب میرا نام اس وقت جو بہت کس بیماریاں خطرے سے دوچار تھے؟
”تم کب سے اپنے گھر سے باہر نہ ہو؟“ اس نے

میرا دل دھڑکا دینے والا ایک اور سوال کیا۔ مجھے اپنے اندر سستی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ آخر ایسے سوالات کیوں کر رہی تھی۔ اسے اس مکان سے آخر کیا لینا دینا تھا؟ اب ہی کی خیال سے میں چوٹا۔ اس بار محاط ہو کر جواب دیا۔
”دور دور تو ہو گئے ہیں۔ دراصل میرا کام ہی ایسا ہے۔ قریب قریب قریب میں مزدوری کرتا ہوں۔ کام زیادہ تھا، مگر ڈکٹ سکا۔ ایسا اکثر میرے ساتھ ہو جاتا ہے تو میری بیوی ناراض ہو جاتی ہے۔“

وہ بری طرح الجھ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ اس مکان اور اس کے کینوں کے بارے میں کچھ جانکاری رکھتی ہے اور وہ خود بھی تو یہاں گھات لگائے کب سے بیٹھی ہوئی مگر کیوں؟ اس دوران کاٹ دار برقی ہواؤں میں تیزی آنے لگی، ہوا زور پکڑنے لگی، ہلکے طوفان کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ عجیب منظر اور ماحول تھا۔

میں نے اسے خاموش پا کر دو بارہ پوچھا۔ ”میرا خیال ہے اب تم بھی میرے سوال کا جواب دے ہی دو۔ آخر نہیں اتنی حیرت کیوں ہے... اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“
”میں... میں...“ وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ چاک مکان کے اندر دھماکا ہوا۔ میں بری طرح چونک پڑا اور پلانے مکان کے اندر سے تیز نسوانی چیخ مچی ابھری تھی۔ میں وہل گیا۔ یہ چیخ میرے میزبان بیوٹ کی بیوی صوفی کی تھی۔ ساتھ ہی بچوں کے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔
میں اس لڑکی اور اس کی میری جانب آگئی ہوئی گئی کی پروا کیے بغیر مکان کی جانب دیوانہ وار دوڑ پڑا۔ ابھی میں دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ مچا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ جس شخص کو میں نے گرتے پڑتے باہر نکلے دیکھا، وہ میرے لیے اجنبی ہی تھا۔

معاشی دسویں اور دسویں کی خون ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلہلا داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

اس نے جلدی جلدی میرے لباس کی تلاش کی۔ اس کے لیے ہالوں کی جنگ کو میں نے بہر حال لہرائے دیکھا تھا۔ میں اس پر یہ آسانی تو پاس کا کر کے مسکرت کے تحت ایسا نہیں کیا۔ نہ جانے کون کی عورت۔ ان کی ساسی یا بھرنی اور... مگر یہاں کیا کر رہی تھی؟
”میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ کیا تم اپنے بارے میں بتاؤ؟“ کون ہو تم؟ میں نے پتلی آواز میں اس سے کہا۔
”میری زبان بند رکھو اور آہستہ آہستہ میری جانب مڑو۔“ اس نے دوسرا گھر مارد کیا۔ وہ اب مجھ سے چند قدم بچے ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے خود بھی اسے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ دیکھا تو چونک پڑا۔ وہ ایک عجیب اور غیر صورت تنوش کی حامل واقعی ایک جوان سال لڑکی تھی۔
اسے کمر لگن اعزاز و اطوار سے نہایت ہی تیز طرار معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ہلکے براؤن بال غامض کئے تھے اور ایک دین سے بندھے ہوئے تھے۔ رنگت سرخ دھند تھی۔ اس حراج نے اسے لطافت آمیز حسن عطا کیا تھا۔
اس لڑکی طرح اس کے چہرے پر سختی اور نہ ہی مردوں جیسا سہا پنا بلکہ اس کی جگہ لطافت اور نزاکت ہی نظر آتی تھی۔
قد بلند تھا اور اس کے کٹھن کشادہ براؤن۔ وہ بھی غیر ملکی تھی۔ اس نے چست گرم لباس یعنی جینز کی پنٹ پر سمور کی جینٹ اور سر پر ادنی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں مونے گرم دستانے، ہیروں میں لائٹ بوٹ جو برف سے اٹنے ہوئے تھے بلکہ وہ ساری ہی برف سے اٹی ہوئی تھی۔

”میں نے پوچھا ہے تم ہو کون اور اس مکان کی جانب یوں چھوڑوں کی طرح کیوں بڑھے جا رہے تھے؟“ اس نے دوبارہ روشنی سے کہا۔ اس کی آواز کی تہ میں وہی نہایت تھی جس میں جی پر کش اور کم عمر لڑکی کا خاصہ ہوتی ہے۔
میں ہولے سے مسکرایا۔ ”وہ ہوئی تھی مجھے لوٹنے میں۔ ہوئی نیچے جاگ نہ جائیں اسی لیے خاموشی سے اپنے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا۔“ میں نے اس سر پر سراجی مگر اسلحہ پرست حیرت کو بلف کرنا چاہا۔ ابھی اس کی اصل حقیقت سامنے نہیں آئی تھی۔

”اپنے گھر؟“ وہ ہولے سے اٹھنے میں سے بڑبڑائی۔
”کیوں تم میرے گھر میں داخل ہونا مجرم ہے؟“ میں نے دانت مسکرا کر کہا۔
”کیا یہ گھر تمہارا ہے؟“ اس نے حیرت اور الجھن کے لیے بے تاثرات تلے پوچھا۔ ایک الجھن آمیز حیرت

میں نے دانت مسکرا کر کہا۔

”چرچر چرچر دو ایران جانے کی ضد۔ ہم کہیں اور چلے
 ہیں۔ ویسے بھی لوگ اپنے اپنی موناں کے لیے پوری ممالک کا
 انتخاب کرتے ہیں۔ ہمیں ایران جانے کی پڑی ہے جبکہ تمھے تو
 کوئی شوق نہیں۔“ مرتضیٰ نے بیزار سے کہا۔
 ”ایران ہمارے آباؤ اجداد کا ملک ہے۔ میں ایک بار
 بھی نہیں گئی۔ میں تو ضرور جاؤں گی اور آپ بھی چلیں گے۔“
 اس نے جیسے مرتضیٰ کو قسم دیا۔
 ”ٹھیک ہے۔ پر ابھی میرے لیے ایک کپ چائے کا
 کبرو۔ سرد سے پیٹ رہا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“

☆ ☆ ☆
 مرتضیٰ حسنی اپنے والدین کا کلوٹا بیٹا تھا۔ اس کا تعلق
 بنیادی طور پر ایران سے تھا پر بہت عرصہ پہلے اس کے والدین
 شہر عرب امارات کے شہر عجمان میں شفٹ ہو چکے تھے۔
 مرتضیٰ کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن میں ہو گیا تھا۔
 ایران میں مرتضیٰ کا کوئی نہیں تھا سوائے ایک دوست
 مراد کے جس سے اس کی دوستی عجمان میں ہوئی پر وہ بھی کچھ
 عرصہ پہلے عجمان چھوڑ کر ایران واپس چلا گیا تھا۔ مرتضیٰ نے
 تعلیم عجمان سے حاصل کی اور پھر وہیں پر اپنے والد کا کاروبار
 سنبھالا۔ کچھ عرصے بعد کاروبار میں نقصان ہونا شروع ہوا۔ اسی
 دوران مرتضیٰ کے والد چلے بے اور وہ اکیلا رہ گیا پھر اس کی
 شادی کر لی گئی۔ اس شادی سے مرتضیٰ کے بڑے کو کافی
 فائدہ ہوئے یا تو کہنا چاہیے کہ اس نے یہ شادی اسی بڑے
 کے لیے کی تھی کیونکہ مرتضیٰ کو زلیخا ذرا بھی پسند نہیں تھی کیونکہ وہ
 عام شکل و صورت کی تھی جبکہ مرتضیٰ خوش شکل و جوان تھا۔
 زلیخا کو بھی تعلق ایران سے تھا اور وہ بھی عجمان میں پلی
 بڑھی تھی۔ زلیخا بھی ایران میں گئی پر وہ فارسی زبان بول بھی سکتی
 تھی اور سمجھ بھی سکتی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے اپنی موناں پر ایران جانا
 چاہتی تھی۔ مرتضیٰ اس کے سامنے کچھ نہیں بول سکا کیونکہ وہ بہت
 ضد مان کی تھی۔ اپنے باپ کی لاڈلی بیٹی کی اور مرتضیٰ نے اس کی
 ضد مان کی کیونکہ مرتضیٰ بھی اپنے بڑے کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا
 تھا۔ مرتضیٰ کو ایران کا ذکر پسند نہیں تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ
 ایسا کیوں ہے۔

☆ ☆ ☆
 ”ماشاء اللہ۔ بھدر زیباست! (ماشاء اللہ! کتنا
 خوبصورت ہے!)“ ازپورٹ سے نکلے ہی تھیں ایران کی خوبصورتی
 دیکھ کر زلیخا کے پہلے الفاظ تھے۔
 لیکن مرتضیٰ بالکل خوش نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک

طرح کا خوف تھا۔ ایران کے اس شہر سے موسم میں بھی
 سینے سے شراور تھا۔ زلیخا نے اسے دیکھا تو وہ حیران رہ گئی
 ”مرتضیٰ! کیا ہوا ہے؟“ اس نے اپنا ہاتھ مرتضیٰ کے
 ہاتھ پر رکھا تو وہ اپنے ڈر سے باہر آیا۔
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے جیب سے روٹل نکال کر اپنی
 پیشانی سے پینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ”آئی ڈر میں وہاں ایک کرسی
 آکر رک گئی۔ وہ اس کرسی میں بیٹھ گئے۔“
 ”کہاں جانا ہے آپ لوگوں کو؟“
 ”ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں۔ آپ ہمیں کیا ایسے ہوئے
 کا بتائیں جو سنان ایریا میں ہو، خاموشی ہو، سکون ہو۔“
 ”سکراتے ہوئے کہا۔“
 ”ایک جگہ ہے میڈم! لیکن وہ ہوٹل نہیں ہے، کالچ ہے۔“
 کالچ کا سننے ہی مرتضیٰ کے ہاتھ سے اس کا موبائل
 گر گیا۔ زلیخا اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ مرتضیٰ نے مشکل
 سے خود کو سنبھالا اور ذرا تیر سے سخت لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”ہم
 نے آپ سے ہوٹل کا پوچھا تھا، کالچ کا نہیں۔“ زلیخا کو اس کا
 رویہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔
 ”صاحب! لیکن.....“

”بھائی! آپ اسی کالچ چلیں۔“ زلیخا نے غصے سے
 مرتضیٰ کو دیکھا۔ صبح سے وہ اس کا یہ رویہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔
 اب اس کے برداشت کی حد ہو چکی تھی۔ ”زلیخا! ہم نہیں
 جا رہے کالچ۔“ مرتضیٰ نے سخت لہجے میں کہا۔
 ”ہم جا رہے ہیں کیونکہ آپ کو جو آرام چاہیے اپنا دماغ
 درست کرنے کے لیے، وہ آپ کو کالچ جیسی جگہ پر ہی لے گا۔“
 ”پر زلی..... بس دیک (بس بہت ہوا)۔“ زلیخا نے
 اس کی بات سچ میں کاٹ کر اسے چپ کرایا۔ مرتضیٰ اس کی
 بدتمیزیوں صرف اپنے مفاد کے لیے برداشت کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
 کالچ پہنچے ہی اس کے مالک عزیز سے بھی زلیخا نے خو
 ہی بات کی اور کالچ ایک ہفتے کے لیے بک کر لیا۔ مرتضیٰ بالکل
 کالچ کے مالک کو دیکھ رہا تھا۔
 ”یہ وہ نہیں ہے جو میں سوچ رہا تھا۔ یہ تو کوئی ادب ہے۔“
 تو کیا یہ جگہ وہی جگہ نہیں ہے؟ لیکن نہیں، جگہ تو وہی ہے۔ کالچ
 کے پاس جو گھر تھا وہ بھی ہے پھر یہ نیا مالک کون ہے؟ ”مرتضیٰ
 دل ہی دل میں کچھ سوچ رہا تھا۔
 زلیخا نے اسے بلایا اور باہر سے کالچ کو دیکھنے کے بعد
 دونوں اندر چلے گئے۔
 ”مرتضیٰ! اندر بھی بڑے کونو سے دیکھ رہا تھا لیکن اسے کوئی

بھی چیز وہ نہیں لگی جو اس نے سوچی تھی۔
 یہ کالچ شہر سے بہت دور تھا۔ اس کالچ کے آس پاس ہر
 وقت سنا رہا تھا۔ دور دور تک یہاں کوئی آباد نہیں تھا۔ لوگ یہاں
 پرسکون کے لیے آتے تھے۔ کالچ کے سامنے والے گھر میں
 صرف اس کا مالک عزیز اور دو کورہ رہتے تھے۔
 زلیخا کالچ کی خوبصورتی میں کھو گئی۔ اس دلکش کالچ نے
 زلیخا کو مسحور کر دیا تھا۔
 ”ارے واہ۔ یہاں بھی گراموفون ہے۔ میں نے اپنی
 دوست سے سنا تھا کہ تھران کے ہر ہوٹل میں گراموفون ہوتا ہے
 لیکن یہاں تو کالچ میں بھی ہے۔“ زلیخا تھوڑی سی کوشش کے
 بعد آخر کار اسے آن کرنے میں کامیاب ہو گئی۔
 (گروٹ چشم سیاہی تو خوش می آید..... خوش می آید)
 (تمہاری سیاہ آنکھوں کی گردش مجھے بہت پسند ہے۔)

”ارے واہ، میرا پسندیدہ گانا ہے یہ تو۔“ زلیخا اس کا
 گانے سرد میں کھو گئی لیکن مرتضیٰ نے جب یہ سنا، اس کی سانسیں
 تڑپ اٹھیں اور وہ بھی جیسے اس کے خوف کے بوجھ سے اس کا
 دم ٹٹ رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں کانوں
 پر رکھ دیے اور زور سے چلایا۔
 ”این! آہنگ رابست (بند کر دو اس گانے کو)۔“
 زلیخا اس کی چیخ سن کر ایک دم ڈر گئی جیسے اس نے کوئی
 ہولناک دیکھ لیا ہو۔
 ”مرتضیٰ! مسلسل کانپ رہا تھا اور بھر دے ہوش ہو گیا۔“

☆ ☆ ☆
 مرتضیٰ اب بھی بے ہوش بستر پر لیٹا تھا۔ مراد کو زلیخا نے
 لڑن کر کے بلوایا تھا۔ مراد اپنے دوست کے پاس بیٹھ کر اس کے
 ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زلیخا کالچ سے باہر اپنے
 والدین سے فون پر بات کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مرتضیٰ کو
 ہوش آ گیا اور وہ ایک دم سے ڈر کے مارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
 ”مرتضیٰ! بھائی! ریٹیکس کر۔ کیا ہو گیا ہے۔“ مراد نے
 اسے بھگایا۔
 ”مراد! وہ یہیں ہے۔ میں اسے محسوس کر سکتا ہوں۔“
 زلیخا نے مرتضیٰ کے ہونٹ پکپکا رہے تھے۔
 ”میں چہ چیز دیوانہ شداست؟ (تو پاگل ہے کیا؟)
 ”ارہا ہے۔ 2 سال ہو چکے ہیں۔ اس بات کو اب بھول جاؤ
 انہی تم یہاں بھائی کے ساتھ ہی موناں پر آئے ہو۔ اپنا وقت
 غائب کر دے سچا تو کی میری بات؟“
 ”اگر وہ یہاں نہیں ہے تو وہ گیت جو میں اس کے لیے
 لایا تھا وہاں کہاں سے آیا؟“ مرتضیٰ پر اس کے یہاں ہونے

کا خوف طاری تھا۔
 ”یار! وہ ایک شہر کا گانا ہے۔ اسی لیے تو نے بھی اس کے
 لیے گایا..... اور چلو مان لیا اس کی روح جبکہ رہی ہے تو تیرا کام
 وہ بک کا عجمان میں تمام کر چکی ہوئی کیونکہ اگر موت وغیرہ کچھ
 ہوتا بھی ہے تو وہ ہر جگہ جاسکتے ہیں۔ کم از کم بچپن میں ہم نے تو
 یہی سنا تھا اور ایک بہت ہی عجیب بات یہ ہے کہ اگر وہ یہاں
 ہے تو کیا گانے گائے گی؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے زوردار قبضہ
 لگا لیا اور دل کھول کر مرتضیٰ پر بھسا۔
 ”مرتضیٰ! اسے غصے سے دیکھ رہا تھا۔“ اچھا سوری! خواہ
 اور تیار ہو جا۔ آج میں تم لوگوں کو کھانے لے کر جاؤں گا، چل
 اٹھ۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی مرتضیٰ کو اس کا ماننا پڑی۔

☆ ☆ ☆
 دو سال قبل۔
 سردیوں کی خنڈی رات تھی۔ مرتضیٰ اور اس کے دوست
 الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ کالچ کا مالک حلیل بھی بیٹھا
 تھا۔ حلیل کی بیٹی پریرہ ان کے اور مہمانوں کے لیے چائے
 لے کر آئی۔
 ”مرتضیٰ! اور اس کے کچھ دوست عجمان سے یہاں ایک
 مہینے کے لیے بڑے کے سلسلے میں آئے تھے اور ساتھ ساتھ
 کھونا پھرنا بھی لگا تھا۔ یہ کالچ مرتضیٰ کے دوست فرحان کے
 جاننے والے نے ان کے لیے بک کر لیا تھا۔ پہلے ہی دن جب
 مرتضیٰ نے پریرہ کو دیکھا تو اپنی دل چھینک طبیعت کی وجہ سے
 اس پر عاشق ہو گیا۔

پریرہ بہت خوبصورت تھی۔ کمال کا حسن تھا اس
 کا۔ دوڑھ چمکی رنگت، سیاہ چمکی ہوئی آنکھیں اسے باقی فارسی
 لڑکیوں سے مختلف کرتے تھے۔ کالے لہاس میں وہ بالکل کالی
 رات میں چمکتے چاند کے مانند لگ رہی تھی۔ ان ہی چشم سیاہ کا
 مرتضیٰ دیوانہ تھا۔ پریرہ بھی اس کی آنکھوں میں چھپی اپنے لیے
 پسندیدگی کو پہچانتی تھی۔
 سب کو چائے دینے کے بعد مرتضیٰ کی باری تھی۔ اس
 نے چائے کا کپ اٹھا کر مرتضیٰ کو دیا تو بے اختیار نظر اٹھا کر اسے
 دیکھنا چاہا لیکن مرتضیٰ کی آنکھیں پہلے ہی اس کی صورت پر جمی
 تھیں۔ ”مرتضیٰ کی نظروں کی تپش سے پریرہ کے گالوں پر لالی
 آگئی اور نظر چرا کر ہاتھ میں شرے لیے وہاں سے چلی گئی۔ اس
 کا گھر یہیں کالچ کے پاس تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی
 مرتضیٰ کی آنکھیں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔
 ”یار! مرتضیٰ! کوئی اچھا سا گانا تو سناؤ کہ مزہ آجائے۔“
 مراد نے فرمائش کی۔

”ٹھیک ہے۔“ مرتضیٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔
 پریراے اپنے باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھ رہی
 تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مرتضیٰ اسے کس نظروں سے دیکھ رہا ہے۔
 اسے یہ احساس اچھا لگتا تھا۔
 مرتضیٰ کی نظر اس پر پڑی تو مرتضیٰ نے اپنا گیت شروع کیا۔
 گردش چشم سیاہی تو خوش می آید

خوش می آید
 مجھ کو حسن کرب نے مرتضیٰ کی تعریف کی۔ مرتضیٰ کو بچپن
 سے گانے کا شوق تھا۔ سب نے مرتضیٰ کے گانے کو سراہا لیکن
 اس کی نظریں تو صرف پریرہ پر جمی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا
 تھا کہ وہ پریرہ سے اپنے دل کی بات کرے۔
 پریرہ جانتی تھی کہ یہ گانا صرف ایک گانا نہیں بلکہ مرتضیٰ کے
 بے محنت دل کا ایک پیغام ہے جو وہ اس تک پہنچانا چاہتا ہے۔
 مرتضیٰ کے اس گیت نے اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھادیں۔ چاہے
 جانے کے احساس نے اسے بہت خوش کر دیا تھا۔
 مرتضیٰ کے گون پر اس کے والد کی کال آئی تو وہ غلطی سے
 اجازت کے کرنوٹ سننے کے لیے وہاں سے اٹھ گیا کیونکہ اس
 جگہ پر نیٹ ورک کا مسئلہ تھا۔

وہ کچھ سے تھوڑی دور پریرہ کے گھر کے پاس آگیا مگر
 اس کے موبائل کا نیٹ ورک اب بھی بحال نہ ہو سکا۔ بھی
 اچانک اسے پریرہ کی آواز سنائی دی جو چمن میں کھڑی مبینی گانا
 گھنٹا رہی تھی۔ چمن کی کھڑکی سے اس نے پریرہ کو دیکھا۔ وہ
 جب جب پریرہ کو دیکھتا، اس کا حسن اسے مسحور کر دیتا۔ وہ دے
 پاؤں چمن کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور پریرہ کی توجہ پانے
 کے لیے چمن کے دروازے پر ہانکی کی دستک دی۔ پریرہ اسے
 دیکھ کر چونک گئی اور حیرانہ اس کی نظریں جھک گئیں۔
 ”آپ کو کچھ۔۔۔ کچھ۔۔۔ چاہیے؟“ پریرہ نے یہ مشکل اس
 سے سوال کیا۔

”وہ دراصل میرے موبائل میں نیٹ ورک کا ایڈو تھا۔
 اسی لیے اس طرف آیا تھا۔“ مرتضیٰ نے بتایا۔
 دونوں کے سچ ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ بولنے کو الفاظ
 تو بہت تھے پر نہ جانے کیوں وہ خاموش تھے۔
 ”آپ نے بہت اچھا گایا۔“ پریرہ نے دھیمی آواز سے
 کہا۔ مرتضیٰ وہ دماغی شخص تھا جس کے لیے اسے کچھ محسوس ہو رہا تھا۔
 ”میں سمجھ لیں کہ میرے دل کی آواز تھی۔ کسی کی کالی
 کالی آنکھوں نے مجھے اپنا گریویدہ بنالیا ہے۔“ مرتضیٰ نے ڈھٹے
 چمپے الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کیا۔

☆☆☆

رات وصل رہی تھی۔ غریب ہوتے سورج کی سرسرا
 کر میں اوپر آسمان کو روشن کر رہی تھی۔ شام کے وقت سہرا
 ڈھلکا اور مرتضیٰ کو ساحل سمندر پر لے آیا تھا۔
 جلد ہی سورج اٹھ کے چمپے غائب ہو گیا اور آسمان پر
 اندھیرا ہو گیا۔ سب رات ہوئی چنانچہ نہیں چلا۔ ڈھلکا ساحل پر
 سمندر پر بھی اسی جگہ کو دیکھتی رہی جہاں سورج غروب ہوا تھا۔
 اس کے لیے غریب آفتاب محسوس نہ تھا۔
 ”رات ہونے والی ہے ڈھلکا اٹھ لگتا اب ہمیں چلنا
 چاہیے۔“ مرتضیٰ نے کہا۔
 ”جے جائیں گے، اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ مجھے اس
 منظر کا لطف تو اٹھانے دو۔ تمہیں جانا ہے تو تم جاؤ، میں خود
 آ جاؤں گی۔“ ڈھلکا نے اسے سختی سے جواب دیا۔ مراد جو مرتضیٰ
 کے پاس کھڑا تھا، ڈھلکا کا یہ رویہ دیکھ کر حیران تھا۔
 ”بھائی تیری بہت کو داد دینی پڑے گی۔ بھائی تو بڑی
 غصے والی ہیں۔“ مراد نے مرتضیٰ کے کان میں سرگوشی کی۔
 ”بس کیا کروں۔“ مرتضیٰ نے بے بسی سے جواب دیا۔
 ”دیسو تو اتنی جلدی کا کچھ واپس کیوں جانا چاہتا ہے؟
 ابھی تو ہمیں ریت تودوان جانا ہے۔ یہاں کی مشہور ڈش ”کباب
 کوئیدہ“ بھائی کو کھانا ہے۔“ مرتضیٰ نے کہا۔

”نہیں یارا! میں تم تک گیا ہوں۔ کچھ جا کر آرام کرنا چاہتا
 ہوں۔“ مرتضیٰ نے شرت کی پاکت سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔
 ”کہیں ایسا تو نہیں کر رات ہونے کی وجہ سے تم ڈر رہے
 ہو؟“ مراد نے سوال کیا۔
 مراد کا سوال اسے عجیب لگا۔
 ”اس بات کا کیا مطلب؟“
 ”مطلب یہ کہ کہیں تمہیں یہ ڈر تو نہیں کہ پریرہ کی روح
 آکر تمہیں تنگ کرے گی۔ گردش چشم سیاہ کا گناہ۔“ یہ کہہ کر اس
 نے زوردار ہتھکڑیا لگا۔ ڈھلکا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
 مراد شرمندہ ہو گیا۔
 ”کچھ نہیں بھائی! ہم پرانے دوست بس آپس میں
 مذاق کر رہے ہیں۔“ اس نے بات کو چھلایا۔
 ”اچھا ہے، تمہارا نہیں جانے کی کوشش کیجئے تاکہ ان کا
 بھی موڈ اچھا رہے اور دوسروں کا بھی۔“ ڈھلکا نے پھر طنز کیا۔
 ڈھلکا کے موبائل پر اس کی ماں کی کال آئی تو وہ کال
 اٹھاتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی۔
 مراد نے مرتضیٰ کی طرف دیکھا جو غصے میں سگریٹ کے
 کش لگا رہا تھا۔
 ”اچھا یا سوری اتفاق کر رہا تھا۔“ مراد نے معافی مانگی۔

مرتضیٰ وہاں پر کھڑا، سمندر کی لہروں کو دیکھتا ڈھلکا کا
 اظہار کر رہا تھا بھی اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کالے لباس
 میں لباس تھی۔ سر پر اس کا رول تھا جیسے مونا ناز کی لڑکیوں کا ہوتا
 ہے۔ وہ سمندر کی طرف جا رہی تھی۔ مرتضیٰ اس کا چہرہ نہیں دیکھ
 سکتا تھا کیونکہ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا لیکن اس نے دیکھا
 کہ اس کے ہاتھ سے بریسلٹ پھسل کر گر گیا۔ وہ اس لڑکی کی
 جانب بڑھ گیا تاکہ اس کا بریسلٹ اٹھا کر دے سکے۔
 ”بڑھ لطف! (بات سننے بلینز)۔“ اس نے لڑکی کو روکا تو
 لڑکی اس کی آواز سن کر کرک گئی۔
 ”وجہ نہ۔۔۔۔۔ (آپ کا بریسلٹ)۔“ ابھی وہ کچھ
 کہنے ہی والا تھا کہ بریسلٹ دیکھ کر وہ چونک گیا۔
 لڑکی نے جب مراد کو مرتضیٰ کو دیکھا تو مرتضیٰ کی آنکھیں
 پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ وہ پریرہ کی۔ وہ پریرہ کو پہچاننے میں غلطی
 نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان سیاہ آنکھوں کو پہچانتا تھا۔
 پریرہ کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا خوف ایک ٹیوس زندہ
 قوت بن گیا جو کسی جھوٹے دوندے کی طرح اس پر چھا گیا،
 اسے متحیر کر دیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔
 ”مرتضیٰ!“ اس نے مرتضیٰ کو پکارا۔
 مرتضیٰ یہ مشکل قدم پیچھے ہٹا رہا تھا تاکہ وہ اس سے
 بھاگ سکے۔
 ”تم مجھ سے دور نہیں جاسکتے مرتضیٰ! میں پھر آؤں گی۔“
 اس کی یہ بات سن کر خوف نے مرتضیٰ بے ہوش ہو گیا۔
 ☆☆☆

دوسرا قسط۔
 ”بابا! میں بس ابھی گل کے گھر سے ہو کر آتی ہوں۔ اس
 نے کہا تھا، اسے کچھ کام ہے۔ دیکھتی ہوں شاید اس کے گھر کل
 یہاں آ رہے ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے بیٹا! بس جلدی آنا۔“
 پریرہ نے جلدی سے اپنی بیٹی کی چادر پھینکی اور گھر سے
 نکل گئی۔
 آج پہلی بار اس نے اپنے والد سے جھوٹ بولا تھا،
 صرف مرتضیٰ سے ملنے کے لیے۔ مرتضیٰ اور پریرہ کے درمیان
 محبت کا بہت گہرا تعلق بن چکا تھا۔ دونوں چپ چاپ کر ملتے
 تھے لیکن آج مرتضیٰ نے اسے ساحل سمندر پر بلایا تھا اور محبوب
 کے بلانے پر پریرہ دوڑ کر جا رہی تھی۔ پریرہ کے دل کا حال اور
 ان کی محبت کا قصہ پریرہ کی بہن فاطمہ کو بھی معلوم تھا جو ایران
 کے شہر مشهد میں پڑھ رہی تھی۔ پریرہ اسے اپنے اور مرتضیٰ کے
 تعلق کی ساری باتیں بتاتی۔ فاطمہ اسے سمجھاتی تھی کہ عقل سے کام

لو۔ مرتضیٰ ایک مسافر ہے۔ وہ کیا جانتی ہے اس کے بارے
 میں لیکن پریرہ کی آنکھوں میں محبت کی لہریں تھیں۔ اسے
 مرتضیٰ نے پوری طرح اپنی محبت کے سہاگن میں جھنپایا تھا۔
 کچھ ہی وقت میں وہ ساحل سمندر پر پہنچی گئی۔ وہاں پر
 مرتضیٰ پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے دونوں میں پریرہ
 اپنی نادانی سے پوری طرح مرتضیٰ کے پھسل چکے ہاتھس پکائی تھی۔
 ”ماشاء اللہ! بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ دوست محل
 ماہ کامل در شب تاویک (سیاہ رات میں پچھلے پاند کی طرح لگ
 رہی ہو)۔“ مرتضیٰ اس کے حسن کا دوبارہ تعریف

پریرہ اس کی بات سن کر شرمائی اور آنکھیں جھکا لیں۔
 مرتضیٰ نے غمی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں
 لیے۔ ”میں ایمان اس کی خوبصورتی دیکھنے کے لیے آیا تھا اور
 واقعی ایمان کی سب سے خوبصورت لڑکی اس وقت میرے
 سامنے کھڑی ہے۔“ مرتضیٰ کی بیارہ مری بات پر پریرہ کے دل کی
 دھڑکن بے ترتیب کرتی تھیں۔ اسے یہ پیار کا احساس ایک
 انجانی خوشی میں جلا کر دیتا تھا۔
 مرتضیٰ نے اپنی جیب سے ایک خوبصورت سا بریسلٹ
 نکال کر پریرہ کو پہنایا۔
 ”بہت خوبصورت ہے یہ مرتضیٰ!“ پریرہ نے
 بریسلٹ کی طرف دیکھا۔
 ”میں کوشش کی ہے کہ تمہاری طرح خوبصورت ہو۔“
 مرتضیٰ نے کہا۔

”یہ میری طرف سے تمہارے لیے میری محبت کی نشانی
 ہے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا اور تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا پیارا
 کرنے لگا جاؤں گا۔“ مرتضیٰ نے اس کے ہاتھوں کو مسسوی سے
 قلم کر کہا۔
 پریرہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا
 کہ وہ ایک ہونے والے ہیں۔

پریرہ مرتضیٰ کے کمر غریب سے بے خبر اپنی نئی زندگی کے
 خواب بجا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ زندگی اس کے لیے پھولوں
 کی تاج بننے والی ہے لیکن اس کے لیے تو کچھ اور ہی اس کا منتظر تھا۔
 ☆☆☆

اس واقعے کے دو دن گزرنے کے بعد آج مرتضیٰ کی
 طبیعت کچھ بہتر تھی۔ وہ کچھ بولنے کے قابل تھا۔ وہ خوف کی
 وجہ سے بار بار بے ہوش ہو جاتا تھا۔ مرتضیٰ نے کسی کو کچھ نہیں
 بتایا، بس یہی کہا اسے خود بھی پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ڈھلکا
 نے اسے بہتر دیکھا تو اس سے باہر جانے کی ضد کی کیونکہ وہ
 یہاں پورا شہر گھومتے آئی تھی۔ مرتضیٰ نے جانے سے منع کر دیا تو

وہ تیار ہو کر اس کی ہی جانے والی تھی مگر مراد نے اپنی بہن کو اس کے ساتھ بیچ دیا اور خود مرثیٰ کے پاس بیٹھ گیا۔

”خدا کا شکر ہے اب تم ٹھیک ہو۔“ مراد نے کہا۔

”ہاں، لیکن پریرہ.....“ مرثیٰ اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مراد نے روک لیا۔

”یار ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف تیرا دم ہے۔“

”یہ میرا دم نہیں ہو سکا مراد! میں نے اسے خود اپنی ہاتھوں سے دیکھا تھا اور تجھے پتا ہے اس کے ہاتھ میں وہ بریلیٹ بھی تھا جس میں نے اسے تجھے میں دیا تھا پھر کیسے سب میرا دم ہو سکتا ہے؟“ مرثیٰ کو پریرہ کی موجودگی کا یقین تھا۔

”اچھا، اگر ایسا ہے تو وہ صرف تیرے پیچھے کیوں پڑی ہے؟“

”جیسا کہ مکمل میں تیرے ساتھ میں اور فرحان کی مثال تھی؟“

”تو کہاں ہے آج فرحان؟ کیا وہ زعمہ ہے؟ کس قسم کی دردناک موت مرا تھا۔ یاد نہیں تجھے؟“ مرثیٰ کے ایران سے جانے کے بعد فرحان کا بہت خطرہ لگا ایک ٹیکسٹ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت واضح ہو گئی تھی۔

”فرحان کے ساتھ جو بھی ہوا وہ ایک حادثہ تھا۔ اس کا پریرہ سے کیا لینا دینا؟ تم ان سب باتوں کے بارے میں مت سوچو۔ میں تو کہہ رہا ہوں اگر اسے واقعی اپنا بدلہ لینا ہے تو آجائے پھر ہم دونوں سے بدلہ لے کیونکہ میں برابر کا شریک ہوں۔“ مراد نے بے خوف ہو کر کہا۔

”یہ سوچ سوچ کر میرا سر پھٹ جائے گا۔“ مرثیٰ نے دونوں باتوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

”مرثیٰ برا برا! شکرانہ شاید (تم غمگین کرو)۔ میں بس تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں پھر شام کو نہیں ڈانکے کے پاس بھی جاتا ہے۔“ مراد یہ کہہ کر وہاں سے جانے والا تھا مگر مرثیٰ نے اسے روک لیا۔

”کہیں مت جانا مراد! کھانا آرڈر کرلو۔ ہم یہیں کھالیں گے۔“ مرثیٰ نے جیسے اس کی مت کی۔ مراد اس کے کہنے پر رُک گیا اور کھانا آرڈر کروا لیا۔

کھانا کھانے کے بعد مراد نے مرثیٰ سے اجازت لی اور وہ چلا گیا۔ کالج سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اپنے گھر جانے لگا تب ہی کچھ دیر میں اسے اندازہ ہوا کہ گاڑی کے بریکس ٹل ہو چکے ہیں۔ اس کی گاڑی کالج سے تھوڑی ہی دور جا کر ٹھکرائی اور وہ شدید زخمی ہوا۔ اس نے یہاں وہاں مدد کے لیے دیکھا مگر چاہا کہ کسی کو آواز دینا چاہی لیکن درد کی شدت سے وہ آواز نہ دے سکا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆☆☆

دو سال قبل۔

”یار مرثیٰ! افسوس سے تو ماسٹر ماسٹر ہے۔ ہاں، افسوس کیسے اس لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا لیا۔“ فرحان اور مراد سے ہنس رہا تھا۔

”کہا تھا میں نے مراد کو، مجھے چیلنج مت کرنا میں لڑا کی فخر سے کہا۔“

مراد نے مرثیٰ کے ایران آنے کے بعد اسے چیلنج کیا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں لا کر دکھائے جو مراد اتنے سالوں میں نہیں کر سکا۔

”ہاں یار! ماننا پڑے گا تجھے تو۔ صرف کچھ ہی دنوں میں تم نے اس لڑکی پر ایسا جادو کر دیا کہ وہ تمہاری ہو گئی۔“ فرحان بھی حیران تھا۔

”بس یہ سب اس کی چرب زبانی کا کمال ہے۔“ مراد نے کہا۔

”دیسے پریرہ بڑی سادہ سی لڑکی ہے۔ کسی ماڈرن لڑکی کو پھنساتے تو بات بنتی۔“ مراد نے کہا۔

”اب تجھے علم ہو رہی ہے کیونکہ تو بھی تو ہے یہاں پر۔“ وہ ہماری دیوانی ہو گئی۔

”چل چل، جلن کسی؟ اتنی بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ وہ۔“ مراد اب شرط ہارنے کے بعد جل رہا تھا۔

”اچھا یہ سب چھوڑو۔ ایک خوشخبری سنو۔ میرے والد نے لپٹی کا اور میرا رشتہ پکا کر دیا ہے۔“ مرثیٰ نے خوشی سے سب کو بتایا۔

”ارے واہ، کیا بات ہے۔“ مراد فرحان اور مرثیٰ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور مرثیٰ کو مبارکباد دی۔

”لپٹی، مرثیٰ کی عجمان میں کلاس فیلو تھی جس سے مرثیٰ محبت کرتا تھا۔“

”چل پھر بھائی، ہم نکلے ہیں۔ کہیں فلائٹ مس نہ ہو جائے۔ تو بھی کچھ دنوں میں کام ختم کر کے آ جانا۔ جب تک ہم عجمان میں کام نہ دیکھ لیں گے۔“ فرحان اور مراد خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

مرثیٰ کے لیے آج کا دن یادگار تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس کی محبت سے اب اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ دروازے پر کھڑی پریرہ ان کی ساری گفتگو سن چکی تھی۔ وہ اندر سے اس قدر روتی ہوئی تھی کہ اب اس کے دل میں مرثیٰ کے لیے صرف انتقام کی آگ بجھ کر رہی تھی۔

☆☆☆

”ایلی! مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ ہم ایک ہونے والے ہیں۔“ رات کے وقت اپنے کمرے میں مرثیٰ فون پر بات کرنے میں لگن تھا بھی پریرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی سربس اور اجزا وجود کچھ کمر مرثیٰ حیران تھا۔

مرثیٰ نے بغیر کچھ کہے فون بند کر دیا مگر وہ بند نہ ہو سکا۔

”دروازہ ہوا پریرہ کی طرف گیا۔“

”پریرہ! کیا ہوا؟ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ مکمل نے دیکھا تو۔ “مرثیٰ کا منہ کچلے جانے کا ڈر تھا۔

”مرثیٰ! اکیوں کیا تم نے ایسا؟“ پریرہ نے اس سے سوال کیا۔

”پریرہ؟“ مرثیٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس بارے میں بات کر رہی ہے۔

”جہیں کیا میری زندگی برباد کر کے۔ میرے ساتھ چار کا ناک کر کے کیا حاصل ہوا تمہیں؟ مجھے اس طرح سے زعمہ لائی بنا کر کیا سکون ملا تمہیں؟“ پریرہ چیخ کر اس سے پوچھ رہی تھی۔

”پریرہ! میری جان.....“ وہ اس کا ہاتھ پکڑنے والا تھا

”جی پریرہ نے زور دیا پھر اس کے منہ پر مار دیا۔

”ہاتھ مت لگانا مجھے گھٹیا انسان! تمہیں کوئی حق نہیں مجھے چھوئے گا۔ میں تمہاری اور تمہارے دوستوں کی ساری بکواس سن چکی ہوں۔“

”اچھا ہے کہ تم نے سن لیا۔ تمہیں کیسے لگا کہ تم جیسی بہانہ دلاتے میں رہے والی سادہ سی ان پڑھ لڑکی سے میں شادی کروں گا۔ کیوں نہیں تم اتنی بے وقوف جو اس طرح کے خواب دیکھ رہی تھیں۔“ مرثیٰ نے اس پر طنز کیا۔

”تم ایک بے غیرت انسان ہو۔ ایک شرط کے لیے تم نے مجھے برباد کر دیا۔“ پریرہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”غلطی تمہاری ہے پریرہ! تمہیں اتنی جلدی کسی کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا لیکن پھر بھی تمہارا شکر ہے۔ تمہاری وجہ سے اب اچھا گزرا۔ میرا تم سے ناک ہی تھی پر دل بہل گیا۔“ مرثیٰ نے ایک زوردار تہقیر لگایا۔

پریرہ کی نظر روتے روتے مرثیٰ کے موبائل پر پڑی جہاں پر لپٹی اب بھی کال پر موجود تھی۔

پریرہ نے اپنے کسی مرثیٰ اسے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

”کیا تم باگل ہو گئی ہو جو اب میرے ہنس رہی ہو؟“

”تمہاری محبوبہ نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ اب وہ تمہیں چھوڑ دے گی، جیسے تم نے مجھے چھوڑا۔“ پریرہ نے اس

کے موبائل کی طرف اشارہ کیا جہاں اب کال بند ہونے کے بعد بیچ آیا تھا کہ لپٹی اب اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔

”بیچ! کچھ کمر مرثیٰ منے سے آگ بولنا ہوگا اور پریرہ کو مکی جہاں اس کے سر پر شدید جھوٹ آئی۔ اس نے مرثیٰ سے انتقام کی کیا ہے؟ اٹھائے عمر مرثیٰ پھر کا من چکا تھا اور پھر پریرہ کی دونوں آنکھیں ہنسنے سے ہوا زکری۔

مرثیٰ نے دیکھ کر خوش ہو گیا کیونکہ اس وقت اسے پریرہ سے شدید نفرت ہو رہی تھی۔ لپٹی کی اذان سن کر مرثیٰ نے اپنا سامان پانچواں اور وہاں سے بھاگ گیا کیونکہ وہ جانتا تھا یہ پریرہ کے والد کے اٹھنے کا وقت ہے۔ مرثیٰ کی ہانپوں کی وجہ سے اس کی زندگی کا سب سے خوشگوار دن اس کے لیے بدترین بن گیا۔

☆☆☆

مراد کو دنانے کے بعد لپٹی اور مرثیٰ کا بیچ واپس آچکے تھے۔ لپٹی کی والدہ کا فون آیا تو فون سننے پر چلی گئی۔

مرثیٰ کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے بھی مرثیٰ کو وہ گیت پھر سے یاد آیا۔

مگر وہ چشم سیاہی تو ختم ہی آئی۔

خوشی آئی۔

”بس، بس کرو۔ کیا چاہتی ہو تم مجھ سے؟ سب کچھ تو جھین لیا تم نے۔ میرے دوست، میری محبت..... اور کیا چاہتی ہو؟“ مرثیٰ جیسے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

ایک دم سے کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر آگئی۔ آج مرثیٰ اس سے نہیں زور دیا تھا بلکہ وہ شرمندہ تھا اس کے سامنے۔

”تمہاری زندگی چاہتی ہوں۔“ پریرہ نے اس سے کہا۔

”تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ ایک حادثہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری جان جائے۔“ مرثیٰ نے اسے یقین دلانا چاہا۔

”بکواس بند کر دینی۔ اب تمہیں میرے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ پریرہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی لپٹی وہاں آگئی۔

”کون ہو تم؟“ لپٹی ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”لپٹی! کیا تم بھی اسے دیکھ سکتی ہو؟“ مرثیٰ نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں، مجھے سب دیکھ سکے ہیں کیونکہ میں پریرہ نہیں

اس کی جڑوں میں فاطمہ ہوں۔ فاطمہ نے پریرہ کا انتقام لینے کے لیے پریرہ کا روپ سوار تھا۔
 یہ سن کر مرتضیٰ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ فاطمہ کی شکل پریرہ سے قطعی تھی۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔
 ”ایسا نہیں ہو سکتا اس نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ اس کی جڑوں میں کون سا ہے۔“ مرتضیٰ کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔
 ”تم بھی اس کی باتیں سننے تو وہ نہیں بتائی تھیں۔ اگر دل سے اسے چاہتے تو اسے سننے نہ۔“
 ”نہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ جہیں کہے تھیں ایران

آ رہا ہوں؟“
 ”ہاں، نہیں پتا تھا مجھے لیکن میری بہن کو جس دن تم نے مارا، میں اس کے اگلے دن شہر سے یہاں آ گئی تھی۔ تمہاری ایک ایک بات وہ مجھے بتاتی تھی۔ تمہاری تصویر تک اس نے مجھے بھی دکھائی تھی۔ کس کس طرح کی حرکتیں کر کے تم نے میری بہن کو بہاد کر کے موت سے ملا دیا، میں سب جانتی ہوں۔ یہ کونج اب میرا اور میرے شوہر عزیز کا ہے۔ تمہاری وجہ سے۔ صرف تمہاری وجہ سے میں نے کچھ ہی عرصے بعد اپنے باپا کو بھی کھو دیا۔ وہ پریرہ کا دکھ برداشت نہ کر سکے اور چلے گئے۔ نہیں لگتا ہے میں نہیں چھوڑ دوں گی؟ تمہارے دوست کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اب تمہاری باری ہے۔“

”یہ کیا کہو اس ہے مرتضیٰ؟ کیا اس لیے تم ایران کے نام سے اسے خوار رہتے؟“ زلیخا کی کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔
 مرتضیٰ اسے کوئی بھی جواب نہیں دے پایا۔
 ”کیا یہ سب کچھ واقعی تم نے کیا؟ میرے دوستوں کو تم نے مارا اور سمندر پر بھی تم آئی تھیں میرے سامنے؟“

”ہاں، سب میں نے کیا تھا۔ جس دن سے تم کا بچ آئے ہو وہ اسی دن سے میں تمہارے پیچھے ہوں۔ اللہ میرے ساتھ تھا اسی لیے میں نے تمہیں دیکھ لیا اور میں تمہاری اس گھٹیا صورت کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں تمہاری ساری باتیں خود کان لگا کر سنتی تھی۔ میں سمندر کنارے بھی تم سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ میرا وہی گاڑی کے بریک بھی میں نے ہی خراب کر کے رکھا تھا۔ جس دن تم یہاں آئے، اس گرامفون میں وہ گانا لگانے کے لیے بھی میں نے ملازم سے کہا تھا۔ اب میں بہت ہو گیا۔ آج تمہارا آخری دن ہے۔“ یہ کہتے ہوئے فاطمہ نے پستول تان لیا۔
 مرتضیٰ گھبرا گیا اور فاطمہ سے پستول چھیننے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ فاطمہ پر پستول تانے لگا تھا۔

”ہاں، میں نے ہی مارا ہے تمہاری بہن کو۔ اس سبب قوف کو ایسے بھی جینے کا حق نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے میری موت مجھ سے روکھ گئی۔ میرے لیشن میں ہونے کی وجہ سے میرا بزنس ڈوب گیا۔ میرے والد اس دنیا سے چلے گئے اور مجھے اس کے بھی بدلہ لینا اور تک چڑھی لڑکی سے شادی کرنا پڑی جس سے میں نفرت کرتا ہوں۔ بہت محبت ہے ہمارے آپس میں لیکن مجھے بھی سمجھنا پڑتا ہے۔“ مرتضیٰ کو لی چلانے والا تھا تبھی زلیخا آ کر بڑھی اور زلیخا نے مرتضیٰ کو زوردار پھیر دیا۔
 ”بے غیرت انسان! میں نے اور میرے والد نے کیا کچھ نہیں کیا تمہارے لیے۔۔۔ اور تم مجھے کہتے ہو کہ تمہاری حرکتیں کر کے ہو مجھ سے؟ زبردستی نکاح ہوا ہے ہمارا؟ تمہیں شرم نہیں آتی۔“
 زلیخا اس کی باتوں سے بری طرح سے ٹوٹ چکی تھی۔
 ”تو تم خود کو دیکھو۔ کہاں سے تم میرے لائق ہو۔ ہاں پتاؤ کہاں سے؟ میری مجبوری نہ ہوتی تو میں تمہاری طرف دیکھتی بھی نہیں۔“ مرتضیٰ نے نفارت سے کہا۔ ”خیر، اچھا ہے آج کے دن تم دونوں سے میری جان بچوت جائے گی۔ نہیں میں مطلق دے کر اسے مار دوں گا۔“

مرتضیٰ کے کچھ کرنے سے پہلے ہی عزیز وہاں آ چکا تھا۔ عزیز نے اس کے بازو پر گولی مار کر اسے زخمی کر دیا۔ مرتضیٰ کے ہاتھ سے پستول گر گیا جسے فاطمہ نے اٹھا لیا اور مرتضیٰ پر گولیوں کی بارش کر دی جس سے موقع پر ہی مرتضیٰ کی موت واقع ہو گئی۔
 فاطمہ کے ہاتھ سے پستول گر چکا تھا۔ وہ زور و قہار زور رہی تھی۔ عزیز نے آگے بڑھ کر اسے چلے لگایا۔
 ”میں نے اپنی بہن کا بدلہ لے لیا عزیز! اب تو میری بہن سکون میں ہو گئی تھی؟“ اس نے عزیز سے پوچھا تو عزیز نے اثبات میں سر ہلایا۔

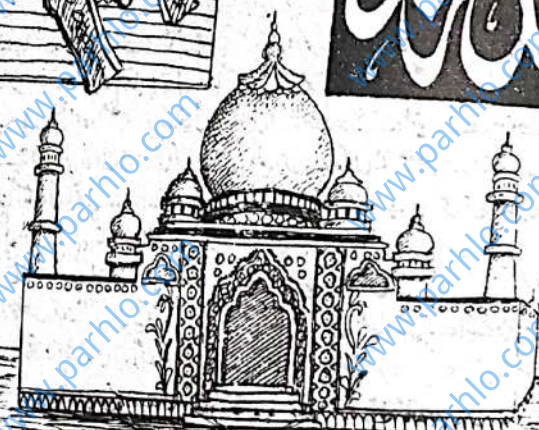
زلیخا اس کی لاش کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ فاطمہ، زلیخا کے پاس آئی اور کہا۔
 ”میں نے اپنی بہن کا انتقام لے لیا ہے زلیخا! چاہو تو مجھے پولیس کے حوالے کر سکتی ہو۔“
 زلیخا نے اس کی طرف دیکھے ہوئے کہا۔
 ”یہ آدمی ایک معصوم لڑکی کا قاتل تھا۔ یہ اسی لائق تھا۔“
 یہ کہتے ہوئے زلیخا وہاں سے چلی گئی۔
 فاطمہ اب سکون محسوس کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی اب پریرہ جب اس کے خواب میں آئے گی تو اس کی پیاری کالی کالی آنکھوں میں آنسو اور درد نہیں بلکہ خوشی ہوگی۔

سجرات کے شیخ کبیر کی خدمت میں میریوں اور امداد مندوں کا جہوم قابل دید تھا۔ برصغیر کے ہر حصے اور گوشے کے آدمی اس دربار میں موجود تھے۔ شیخ و خط و تلمیذ میں شہک، دنیا والیہا سے دور، حالت مذہب و شوق میں اسرار سے ہمہ افسانے میں مشغول تھے۔ ان کا موضوع تھا حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ پر دل چاہنے کے لیے جواب دے فرمایا۔
 ”مفیز ذواللہ اپنے بندے کے ان گناہوں کو معاف نہیں کرے گا جن کا تعلق کسی دوسرے کے حق میں ہے ہوگا۔ ناگور کے ایک مشہور صوفی خاندان کے چشم و چراغ۔۔۔ ان کی عظمت اور بزرگی کی سند یہ تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کی رہنمائی فرمائی۔ وہ بھی بعد وصال۔ گجرات اور دوسرے شہروں میں گھومنے پھرنے والا یہ جوان صوفی اپنے پیر مرشد کی ہدایت پر اجمیر گیا اور وہاں سے انہیں جو ہدایت ملی اس پر عمل کیا۔ خواجہ چشتیؒ نے انہیں ان کے آبائی وطن ناگور بھیج دیا۔ پھر یہاں سے رشد و ہدایت کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی۔“



خواجه حسین ناگوری

میا نسیم بگاری



بندوں کے حقوق بندے کی طرح تک کرتے ہیں؟ سنو، قلی کر کے، حق غصب کر کے، جسم کے کسی عضو یا حصے کو نقصان پہنچانے کے بہت زیادہ کام لیاں دے کر۔ ان کے علاوہ اللہ کے ایسے عالم بندے بھی ہیں جو اپنے ایماندار اور متقی بھائیوں کے دین اور دنیا پر تکلف کر رہے ہیں، یہ بھی حق غصب ہے۔ "شیخ ادرین اور لڈہ اب کی حق غصب کا ملبوم اپنی سمجھ میں نہیں آیا، ذرا اس کی وضاحت ایک نوجوان کو کراہو کیا اور سوال کیا۔"

فرار پر۔ "نوجوان نے اس طرح تک کرتے ہیں؟ سنو، قلی کر کے، حق غصب کر کے، جسم کے کسی عضو یا حصے کو نقصان پہنچانے کے بہت زیادہ کام لیاں دے کر۔ ان کے علاوہ اللہ کے ایسے عالم بندے بھی ہیں جو اپنے ایماندار اور متقی بھائیوں کے دین اور دنیا پر تکلف کر رہے ہیں، یہ بھی حق غصب ہے۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "شیخ! میں نے آپ سے جو کچھ پوچھا ہے، اس کا آپ کے سوال سے کوئی تعلق نہیں۔ میں کوئی ہوں اور کہاں سے آیا ہوں، سرورست ان دونوں سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

ہوں اور کہاں سے آیا ہوں، سرورست ان دونوں سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

شیخ نے شفقت سے فرمایا۔ "نوجوان! تیرے سوال میں حمید الدین سوالی ناگوری کی یاد آ رہی ہے۔"

نوجوان پر مسکراہٹ ہو گیا، بولا۔ "حضرت! آپ نے تو کمال کر دیا۔ بخدا جس کو آپ جانتے ہیں اس سے اس کا تعارف کیوں چاہتے ہیں؟"

شیخ مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے نوجوان کو آواز دی۔ "خواجه حسین! تم وہاں کہاں بیٹھے ہو، یہاں میرے پاس آؤ، تمہارے جد امجد امجد الدین ناگوری سوالی تھے۔ ان سے سوال کیے بھی جاتے تھے اور وہ خود بھی سوال کیا کرتے تھے۔ تم نے آج بڑے بھروسہ میں میری شخصیت سے مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر جو سوال کر دیا ہے اس میں جرأت، دیانت اور جس کی روشنی پائی جاتی ہے۔"

نوجوان حسین ناگوری بھروسے سے کل کر شیخ کے پاس چلا گیا۔ شیخ نے اسے اپنے گلے سے لگایا اور یہ آواز بلند کر کے کہا۔ "بابا حسین! تم نے کیا پوچھا تھا؟ ذرا اپنی آواز میں ایک بار پھر اپنا سوال دہراؤ تاکہ جو تمہارا سوال سن نہ سکے ہوں، سن لیں۔ اس کے بعد میں جواب دوں گا۔"

نوجوان حسین نے غلو سے ہو کر اپنا سوال دہرا دیا۔ "میں یہ پوچھ رہا تھا کہ بن اور مذہب میں حق غصب کی کس طرح ہوتی ہے؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "بابا حسین! اور سامعین حضرات! اگر کوئی شخص کسی شیخ العقیدہ اور متبع سنت مسلمان کو کسر اہی اور بدعت کی دعوت دے اور اس کو اپنی چٹکی چڑی، بدل باتوں سے کہنا ہوں کی طرف لے جائے تو یہ اس کے دین کی حق غصب کی اور اس کی پرکاش اور گہرا کرنے والے کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔"

سامعین نے واہ واہ، ہجان اللہ کی صدائے حسین سے اپنے ہر رشک کی تعریف کی اور نوجوان حسین کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہ نوجوان جو شاید ناگور سے چل کر پہلی بار اس مجلس میں شریک ہوا تھا، شیخ کی نظروں میں اتنا برگزیدہ اور عزت دار ہو گیا تھا کہ آپ نے اس کو بھروسے سے بلو کر اپنے سینے سے لگایا اور اپنے پاس بٹھایا۔

نوجوان حسین نے شیخ سے عرض کیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو اس ضمن میں کچھ یہ ناچیز بھی عرض کر دے۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "بالکل، بالکل۔ اجازت ہے۔ کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

نوجوان حسین نے جواب دیا۔ "آج کل بعض دانشمندان بھی حق غصب کرتے ہیں۔"

شیخ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "وہ کس طرح؟ کیا ان میں میں بھی شامل ہوں؟"

حسین نے جواب دیا۔ "ہاں! میں آپ ان میں شامل ہیں یا نہیں لیکن دوسرے بہت سے دانشمندان ان میں ضرور شامل ہیں۔"

شیخ کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، پوچھا۔ "بابا حسین! کس طرح؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

حسین نے جواب دیا۔ "شیخ! دو دو مصلحتیں جو اللہ تعالیٰ کے حلال اور نعمت اور خوف و خشیت کے پہلو کو دبا کر اس کی رحمت اور مغفرت کے پہلو کو بھار دیتے ہیں۔ یہ بندوں کی حق غصب کرتے ہیں کیونکہ اس سے لوگوں میں مصیبت کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔"

شیخ نور اور نوجوان حسین کی باتوں سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ "حسین! اپنے جد امجد امجد الدین سوالی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ اس کی بجائے اور ہر مزمہ ہائیں حمید الدین سوالی کا خون ہی کر سکتا ہے۔"

حسین نے کہا۔ "شیخ! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب آپ اپنا وعظ جاری رکھیں۔"

شیخ نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ "تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں سے ایک دفتر ایسا ہے جو بخشش نہیں پاسکتا اور یہ ہے کہ رشک کا دفتر۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف نہیں کرے گا۔ دوسرا دفتر وہ ہے جو بخشش پاسکتا ہے اور اس دفتر کا

حلال ہے ان حقوق اور فرائض سے جو اللہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بندوں پر فرض ہیں۔ تیسرا دفتر وہ ہے جسے رشک نہیں پاسکتا اور یہی وہ دفتر ہے جس کا تعلق بندوں سے ہے یعنی بندوں کے حقوق بندوں پر۔ اگر کسی بندے کے حقوق تک کیے گئے ہیں تو اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا جب تک متعلقہ بندہ یا بندے خود معاف نہ کر دیں۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اے لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟" آپ ﷺ کے صحابیوں نے جواب دیا۔ "ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ سارہ سامان۔"

آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں، دنیا کی نظروں میں یہی مفلس ہوگا لیکن میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور حج و زکوٰۃ اپنے ساتھ لائے گا مگر اس حال میں کہ اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی پر اتہام لگایا ہو، کسی کا مال کھایا ہو، کسی کا خون بہایا ہو، کسی کو مارا ہو، کسی کو مارا ہو، کسی کی عینیاں دی جا رہی ہیں اور اگر تمام مطالبات پورے ہونے سے پہلے اس کی عینیاں ختم ہو جائیں گی تو ان لوگوں کے گناہوں کا پوچھنا ہی ناممکن ہو جائے گا، روزے دار، صائم، زکوٰۃ دار، نماز پڑھنے والے پر ڈال دیا جائے گا جس نے ان کے حقوق تلف کیے ہوں گے اور یہ مفلس شخص جس میں جھوٹا دیا جائے گا۔"

مجلس میں سناٹا مچا رہا تھا۔ اس پر اثر و عمل نے سامعین کو خوفزدہ کر دیا۔ ان کے دل و دماغ میں خشیت الہی نے جبکہ بتائی تھی۔ ان میں بعض تو اپنے کھنٹوں میں سر ڈالے زار و قطار رو رہے تھے۔ انہیں اپنا نامی، اپنا کردار یا دہرا تھا اور حق تلفیاں جو نادرہ ننگی میں ان سے سرزد ہو چکی تھیں۔ اس گناہ خیز وعظ نے سننے والوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا اور انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان لوگوں سے معافیاں مانگیں گے جن کی ان سے حق تلفیاں ہو چکی ہیں اور اس وقت تک معافی مانگنے رہیں گے جب تک انہیں معاف نہیں کر دیا جائے گا۔

شیخ کو حسین ناگوری بہت اچھے لگے تھے۔ انہوں نے تحفے میں حسین سے پوچھا۔ "بابا حسین! اب تم کہاں جاؤ گے؟"

حسین نے جواب دیا۔ "حضرت! ناگور سے چل کر کجرات آیا ہوں۔ اب یہاں سے کہاں جاؤں گا؟"

شیخ بہت خوش ہوئے، بولے۔ "حسین! تم یہاں رہو، میرے بیٹے کی طرح، صائم، نیک اور جاشین بیٹے کی طرح۔ میں تم پر فخر کر سکوں گا۔"

اس وقت تک حسین نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ شیخ نے انہیں ظاہری علوم کے ساتھ ہی باطنی علوم کا درس دینا شروع کر دیا۔ اکتساب علوم کا یہ حال تھا کہ شیخ حیران رہ جاتے۔ انہیں ہمیشہ بھی محسوس ہوا کہ حسین کو وہ پڑھانیں رہے ہیں بلکہ پڑھے ہوئے اساتذ کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ آخر کچھ عرصے بعد شیخ نے ان سے کہہ دیا۔ "بابا حسین! میں تمہیں کیا پڑھاؤں۔ ایسا لگتا ہے کہ گویا اب کچھ تو تمہارا پڑھا ہوا ہے۔"

حسین نے عاجز انداز میں کہا۔ "حافظے اور مذاق نے آپ کو مخاطبے میں ڈال دیا ہے ورنہ ایماندار کی بات تو یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی حاصل کر رہا ہوں، آپ ہی سے حاصل کر رہا ہوں۔"

شیخ نے اپنے ہونہار مرید میں تقریر اور وعظ کی زبردست صلاحیت اور دن سے ہی محسوس کر لی تھی۔ جب کسی موضوع پر بولتے تھے تو موسیقی رونے چلے جاتے تھے۔ لفظوں کا برکھل اور مناسب ترین انتخاب اور استعمال ان کے مافی الضمیر کی شاندار ترجمانی کرتا تھا۔ بعض مریدوں کو شیخ کی خصوصی توجہ کراں گزرتی تھی اور وہ آجس میں بیٹھ کر حسین اور شیخ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

کسی مرید نے دوسرے سے پوچھا۔ "کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ شیخ اس نور اور ایمانی نوجوان پر اتنے زیادہ کیوں مہربان ہیں؟"

کسی دوسرے مرید نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں۔"

پہلے مرید نے پوچھا۔ "جب پھر چپ کیوں ہو، بتاؤ ذرا میں بھی تو وہ خاص بات سنوں جس نے حسین کو شیخ کی نظروں میں تارنا بنا کر رکھ دیا ہے۔"

دوسرے مرید نے جواب دیا۔ "سنئے ہیں حسین مشہور صوفی شیخ حمید الدین ناگوری سوالی کے اخلاف میں سے ہیں۔ ان کی نسبت خاص ان کے لیے کافی ہے۔"

ایک اور مرید سرد آہ بھر کر بولا۔ "اے کاش ہم بھی کسی مشہور خانوادے یا مشہور شخص کے بیٹے ہوتے، ہمیں بھی ایسی عزت اور توقیر حاصل ہو جاتی۔"

یہ باتیں شیخ کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک دن آپ نے ایسے تمام مریدوں کو اپنے سامنے بٹھایا اور ان سے

پوچھا۔ ”ہم نے سنا ہے تم سب آپس میں پوچھتے رہتے ہو کہ میں کون سا عرصہ میں کون سی چیز کا مالک ہوں؟“

مریدوں کے چہرے قہقہے اٹھ اٹھے اور ان میں سے اتنی جرات مٹ گئی کہ وہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیتا کہ ہاں ہم وہ چہرہ خصوصیت اور اہمیت جانتا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے آپ نے اس نوادہ کو اپنے سر پر چڑھا لیا ہے اور اپنے دل میں بٹھا لیا ہے۔

اب اپنے مترس مریدوں کی چٹکیں دیکھتے رہے۔

پھر دیر بعد انہوں نے اپنے مترس مریدوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ کمالِ محبت پر تقرر کرے۔ انہیں تقریر جو وہ بتائے، وہ خط لکھائے۔

وہ مرید کھڑا ہو گیا۔ ”مجھ کو یہ کہنا ہے کہ میں اس کی قوت کو اپنی جیسے سب ہو کر رہ گئی ہوں۔“

کہتے ہیں اس جذبہ کو جو۔۔۔۔۔ اور اس کی قوت کو اپنی جیسے سب ہو کر رہ گئی ہوں۔

آپ نے ایک دوسرے مرید کو حکم دیا۔ ”تم وہاں شروع کر دو جہاں سے تم نے شروع کیا دیکھتے ہو؟“

یہ مرید بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی بولنے کی بار بار کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ خط کے لیے اس کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

اب بیٹھنے لگا اور فرمایا۔ ”تم میں کوئی ایسا ہے جو کمالِ محبت پر لب کشائی کر سکے؟“

مریدوں میں مصافحہ بھی ہوئی اور ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو سامعین کو سہرا اور اخروہ پیش کر دیتا۔

آخر خواجہ حسین کا تیرا آگیا۔ مرشد نے انہیں مخاطب کیا اور کہا۔ ”بابا حسین! خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ آؤ اور میری طرح انہیں بھی سہرا کرو۔“

حسین اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے شہد کے قدموں میں کھڑے ہو گئے۔ دل و دماغ میں اتر جانے والی نگاہ سامعین پر ڈالی اور بولنا شروع کر دیا۔ ”سامعین کرام! کیا آپ جانتے ہیں کہ محبت اور ملکیت ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اپنی جان، اپنا مال اور اپنا نفس سب کچھ اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کے تصرفات پر اعتراض نہیں کرتا۔ اللہ کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے، اسے قبول کر لیتا ہے۔ ایک سمت (یعنی اللہ) کے سوا جملہ سمتیں اس کے لیے بند ہو جاتی ہیں۔ اسے اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والے اچانک تیرے حق میں جملہ اطراف مسدود ہو کر صرف ایک طرف باقی نہ رہ جائے گی، تیری محبت کا دل نہ ہوگی۔ جب محبت رنگ رنگ میں سما جاتی ہے اس وقت کسی کی بھی صیحت ایسی لگتی ہے گویا شخص نے لوہے پر چوٹ لگی تھی ہو۔ صیحت بیکاروے اثر ہو جاتی ہے۔“

حسین کی تقریر سننے والوں کے دلوں میں اترتی جا رہی تھی۔ اچانک تقریر نے ایک عجیب انداز اختیار کر لیا۔ حسین اپنی تقریر کے نئے میں ڈوب چلے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”اے اللہ! ہمیں اپنی رحمت سے مایوس نہ کر کیونکہ اس صورت میں ہم دنیا اور وجود کے دریا میں ڈوب جائیں گے۔ اے کریم، عقل اور تقریر کے پتھنے والے! ہمیں ہمارا دے اور اے وہ شخص جو میری باتیں سن رہا ہے، میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا تو میری باتوں پر عمل کرے گا؟ عمل تو، تو اس وقت کرے گا جب تو میری باتیں سمجھ کر لکھیں گے گا لیکن میں جانتا ہوں کہ تو مجھ سے حسن ظن نہیں رکھتا۔ جب تو مجھ سے حسن ظن رکھے گا تو میری بات بھی سمجھے گا لیکن جب حسن ظن ہی نہیں اور میں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر تیرا یقین ہی نہیں تو پھر تو میری بات کس طرح سمجھے گا؟ تو بھوکا ہے اور میرے سامنے کھڑا ہے۔ تو میرے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتا مگر تیرا پیٹ کیونکر بھرے گا؟

”لوگو! تم بیمار ہو مگر خوش نہیں سے خود کو تندرست سمجھتے ہو۔ تمہارے پاس کھوت ہے مگر تم اس کو اصل اور جوہر سمجھتے ہو۔ تم مجھ سے پوچھو گے کہ کچھ کیا ہے اور میں اس کو کس طرح پرکھتا ہوں؟ تو سنو، میری باتیں بہت غور سے سنو۔ میرے پاس تین کسوٹیاں ہیں، کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے لیے۔ اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور میرا قلب۔ آخری کسوٹی یعنی قلب پر عمل پزیر ہونا ہے۔ قلب اس وقت تک مطمئن اور راضی نہیں ہوتا جب تک کتاب اور سنت سے اس کی تصدیق نہیں ہو جاتی۔ سامعین کرام! علم پر عمل کرنا علم کا تاج ہے۔ علم پر عمل کرنا علم کا نور ہے۔ منافی کی منافی، جوہر کا جوہر اور مضر کا مضر ہے۔ علم پر عمل کر کے قلب پاک صاف ہو جاتا ہے۔ جب قلب درست ہوتا ہے تو بقیہ اعضاء بھی درست اور پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ جب قلب کو خلعت (تقویٰ) عطا ہوتا ہے تو جسم کو بھی خلعت مل جاتا ہے۔ جب کوشت کے اس کھڑے کی اصلاح ہو جاتی

نے تو بدن کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ قلب کی صحت اس باطن کی صحت پر موقوف ہے جو پروردگار اور انسان کے درمیان ہے۔ باطن پرندہ ہے اور دل اس کا بچہ، دل پرندہ ہے تو بدن اس کا بچہ، قبر ساری مخلوق کا بچہ ہے کیونکہ انجام کار سبھی کو اس میں جانا ہے۔“

انہیں ان کے مخالفین اور حامدین کو ان کے مترسے اور مقام کا کچھ اندازہ ہوا تھا۔

خارج بھی اس بحر میں گرفتار تھے۔ جب سکوت ہوا تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے حاضرین سے پوچھا۔ ”تم لوگ اب حسین کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

کئی مریدوں نے کھڑے ہو کر معافی مانگی اور کہا۔ ”بھئی ہمیں حسین کی اس عظمت کا کوئی علم ہی نہ تھا۔ آج ہم بہت شرمندہ ہیں۔“

خارج نے جواب دیا۔ ”شرمندہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ بابا حسین بہت نیک ہے۔ اس سے معافی مانگ لو، معاف کر دے گا۔ تم لوگوں نے اس کا بہت دل دکھایا ہے۔ اب اس کی ٹٹائی اسی طرح ممکن ہے کہ تم اس شریف انسان سے معافی مانگ لو۔“

معافی چاہنے والوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور معافی مانگنے لگے۔ آپ نے ہر شخص کو بہت آسانی سے معاف کر دیا۔

خارج نے ان سے کہا۔ ”بابا حسین! میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ خدا نے تمہیں جو کچھ دے رکھا ہے، وہ کافی ہے اور میں اس میں مزید اضافہ نہیں کر سکتا۔“

حسین اپنے بچہ مرشد کی منشا سمجھ گئے، پوچھا۔ ”پھر اب میں کہاں جاؤں؟“

خارج نے جواب دیا۔ ”پہلے اجیر جاؤ اور سلطان الہند کے دربار میں حاضری دو۔ وہی تمہارے جدِ اعلیٰ کے مرشد تھے، وہیں سے تمہیں کل کے لیے حکم اور اجازت ملے گی۔“

ان کا بی تو نہیں چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے سے جدا ہوں لیکن مرشد کی ایما پانچانے کے بعد وہ کجرات میں مزید رک بھی نہیں سکتے تھے۔ چپ چاپ اجیر کے لیے روانہ ہو گئے۔

خواجہ حسین پہلی بار اجیر جا رہے تھے۔ آپ اس مشہور اور مقدس جگہ کے لیے اپنے دل میں بے پناہ جذبہ عقیدت محسوس کر رہے تھے۔ ان دنوں یہ جگہ زیادہ آباد نہیں تھی۔ آپ ایک جنگل کے کنارے پر تھا جو ڈوبے گئے جس کا قلعے نے آپ کو یہاں تک پہنچایا تھا اس نے اس جنگل کے پاس سے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ قلعے والوں نے اس جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب! اس جنگل کے اس پار اجیر ہے اور قلعہ اس جنگل میں نہیں جائے گا۔“

خواجہ حسین نے پوچھا۔ ”کیوں، اس جنگل میں کیا خاص بات ہے؟“

میر قافلہ نے جواب دیا۔ ”یہ جنگل درندوں کا مسکن ہے اس لیے انسان اس جنگل میں نہیں جاتے۔“

خواجہ حسین نے اس ہرے بھرے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اجیر میں واسطے کا اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے؟“

میر قافلہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، کئی راستے ہیں لیکن ہر راستے میں اس قسم کا جنگل ضرور ہے اور یہ جنگل درندوں کے مسکن ہیں۔“

خواجہ حسین نے قافلے والوں کو چھوڑ دیا اور جنگل کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ ”جنگل میں شیر ہوں یا بھیڑیے، مجھے تو خواجہ معین الدین چشتی کے دربار میں حاضری دینا ہی ہے۔“

میر قافلہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، بولا۔ ”جو انسان انہیں مجھے ضرورت سے زیادہ عاقبت ناامید نظر آتا ہے۔ درندے تجھے کھا جائیں گے۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں جس کے دربار میں جا رہا ہوں وہ ہندوستان کا سلطان ہے اور اس سلطان کا اقبال ہر جگہ کار فرما ہے۔ یہاں تک کہ جنگل کے درندے بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں اس سلطان کے اقبال کے ذریعہ مایہ نفاقت اجیر میں داخل ہو جاؤں گا۔“

تاقے والے انہوں ہی کر سکتے تھے، وہ انہوں کرتے رہے اور آپ اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ غرور اور غیظ اور ہود کی جہازیاں ان کا راستہ روک رہی تھیں اور بڑے بڑے اونچے اونچے کھمبے درختوں سے شام کی سیاحی جیسے اندھیرا پکڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک طرف سے بھی ان پر حملہ ہو سکتا تھا۔ احتیاط اور حفاظت کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ چلنے چلنے جب کچھ مکان محسوس ہوئی تو آپ ایک درخت کے سامنے میں آرام کرنے لگے۔ جھنڈی جھنڈی پر لٹک ہو اؤں نے سکون پہنچا اور ان کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد پرندوں کے شور سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں اپنے قریب ہی کچھ آہٹ کی محسوس ہوئی۔ آس پاس کا جائزہ جولیا تو دیکھا ان سے دس بارہ قدم دور ایک شیر لیٹا ہوا ہے اور اس کے آس پاس درختوں پر پرندے شور کر رہے ہیں۔ جب یہ شیر کی طرف دیکھ رہے تھے تو شیر نے بھی ان کی طرف دیکھا۔ اس کی لاشیں بتا رہی تھیں کہ اس کو حسین کی کوئی عمر نہیں اور نہ وہ حسین میں کسی قسم کی وجہی لے رہا ہے۔ حسین اٹھ کر بیٹھ گئے اور شیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تو یہاں کیوں لیٹا ہے عمر تیری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ہندوستان کے بادشاہ خواجہ حسین الدین بخاری چشتی کے دربار میں جا رہا ہوں۔“

حسین الدین بخاری چشتی کے دربار میں جا رہا ہوں۔ ان کی تیر اور چھس اپنی باتوں کے دوران حسین کو یہ احساس ہوا کہ ان کے گرد پیش شیر کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ ان کی تیر اور چھس لگا ہوں نے ان بھڑکیوں، جیڑوں اور دوسرے درندوں کو بھی دیکھ لیا جو شیر کے آس پاس اس سے دور گویا موقع کی تلاش میں کھڑے تھے لیکن شیر کی موجودگی انہیں آگے نہیں آنے دے رہی تھی۔ حسین کو پہلے تو کسی قدر خوف سا محسوس ہوا مگر اللہ کو اپنے دل میں بسا کے اور اس کا نام لے کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں شیر کے پاس سے گزرنے کا شوق تھا۔ حسین نے شیر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اے درندے! مجھے نہیں معلوم کہ تو کس کے حکم اور کس نیت سے یہاں آیا ہے لیکن میں اپنی نیت سے آگاہ ہوں۔ میں اللہ کا بندہ، اللہ ہی کے حکم سے ہند کے سلطان کے دربار میں جا رہا ہوں۔ اگر تجھ کو اللہ کی طرف سے یہ حکم مل چکا ہے کہ تو مجھے ہلاک کر کے اپنی غذا بنالے تو میں راضی رہنے والی ہوں۔ تو اپنا کام کر۔ میں دم بھی نہ ماروں گا اور اگر تجھ کو میری ہلاکت اور تفتد یہ حکم نہیں ملا ہے تو مجھ کو جانے دے اور دوسرے درندوں سے میری حفاظت کر۔“

انہیں کر آپ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ شیر بھی آپ کے آگے آگے چلنے لگا۔ شیر کی موجودگی میں کسی بھی درندے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حسین کے قریب آتا۔ حسین اس خطرناک جنگل سے بخیر و خوبی اور آرام کے ساتھ نکل گئے۔ اب امیر ان کے سامنے تھا۔ یہاں حضرت خواجہ کے حرار پاس وقت تک کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے حرار پر حاضری دی اور دست بستہ عرض کیا۔ ”حضرت! میرے بعد اعلیٰ حمید الدین ناگوری آپ کے مرید تھے۔ انہوں نے آپ سے فیض پایا۔ اب میں آپ کے پاس امید کرم لے کر حاضر ہوا ہوں۔ مجھ پر بھی لطف و کرم کی پوری پوری جائے، آپ کی نوازش زبان و خطاطی ہے۔“

آپ نے خواجہ غریب نواز کے رونے کی نصیر کا آغاز کیا۔ آپ نے رونے کی عمارت کی بنیاد ڈالی اور محنت و مشقت کے دوران فرماتے رہے۔ ”یہ کیا بات ہے کہ سلطان الہند کی آخری آرام گاہ یوں بے عمارت رہے۔“

آپ اس عمارت کی جتنی تعمیر تنہا کر سکتے تھے، کرتے رہے۔ خواجہ حسین کے بیچنے نے ان سے کہا تھا کہ تمہیں اب جو کچھ ملے گا، امیر سے ملے گا چنانچہ خواجہ حسین اللہ سے لولگے خواجہ کے در پر پڑے ہوئے تھے۔

دو پہر کی شدید گرمی میں خواجہ حسین نے چند مسافروں کو پالی پلایا اور پھر عمارت کے طاق میں اور دیواروں پر پرندوں کے لیے پانی سے لبریز پیالے رکھ دیے۔ دھوپ اور گرمی کے ستارے ہوئے پرند اس پانی سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ اس دن دو پہر کے بعد ظہر کی نماز حضرت خواجہ کے حرار کے پاس ادا کی اور وہیں قدموں میں سو گئے۔ خواجہ حسین کو ایسا لگا کہ یادہ سو نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے خواب میں دیکھا حضرت خواجہ غریب نواز ان کے پاس کھڑے انہیں فورے و کچھ رہے ہیں۔ خواجہ حسین ادب سے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ خواجہ غریب نواز نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا۔ ”خواجہ حسین! تجھے جس طرح ہماری خدمت کی ہے، خدا اس کا شاندار اجر عطا فرمائے گا۔“

خواجہ حسین نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں تو گمراہ کے شیخ کبیر کے پاس گیا تھا۔ ان سے میں نے فیض بھی حاصل کیا لیکن بعد میں انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں امیر جاؤں، چنانچہ میں آگیا اور اب آپ کے سامنے موجود ہوں۔“

حضرت خواجہ امیر بخاری نے فرمایا۔ ”بابا حسین! اچھا کیا جو یہاں آئے۔ کچھ دن یہیں میرے قریب رہو، اس کے بعد اپنے

دل ناگور چلے جانا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ناگوری کو پسند فرمایا ہے۔ وہاں جا کر شدہ ہدایت کا سلسلہ شروع کرنا۔“ خواجہ حسین نے عرض کیا۔ ”مختصر بندہ دوازا بندے کی تو یہ خواہش تھی کہ اسے یہیں اجیری میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔“

جواب ملا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو ناگور جائے گا اور وہاں کے لوگوں کو اپنی تعلیمات سے فائدہ پہنچائے گا۔“ خواجہ حسین کو اس وقت چنانہ سکون اور جتنی خوشی میسر آرہی تھی، وہ نا قابل بیان تھی۔ پورا ماحول، پوری فضا ایک ری خمی۔ ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ ایک کیف، ایک نشہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ان کا پورا وجود اس کیف، اس نشے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ خواجہ حسین نے ایک باغیچہ جا جڑی سے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھے امیر بھی میں رہنے دیجیے۔ اس مقدس اور پاک جہتی میں۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میری آنکھوں کا تارا اور دل کو پیارا ہے۔“

خواجہ غریب نواز نے جواب دیا۔ ”مسا جوا سے! مشیت الہی نے تیرے لیے ہر کچھ محسوس کر دیا ہے۔ اب اس زمین میں تو چنے گا اور سلوک کی راہ طے کرے گا۔ جا، ناگور جا، تیرے ہم وطن تیرا انتظار کر رہے ہیں اور اپنی محبت اور ریاضت سے تونے جو کچھ جانتا کچھ حاصل کر لیا ہے اس سے ہا لیا ان ناگوری کو فیض پہنچانا ہے۔“

خواجہ حسین نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ اسی وقت آنکھ کھل گئی۔ وہاں وہ چہا پڑے ہوئے تھے اور وہاں کی فضا خوشبو سے بہک رہی تھی۔ اب انہیں ناگور جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ خواجہ حسین نے یہاں کچھ دن حریہ قیام کیا اور پھر ناگور چلے گئے۔ ناگور والوں کو آپ کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ یہاں آپ نے شادی بھی کر لی اور پہلے سے بھی زیادہ ریاضت کرنے لگے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیلی جا رہی تھی۔ ناگور والے آپ پر جان چڑھتے تھے۔ کچھ دنوں بعد خواجہ حسین نے اپنے ارادت مندوں سے مشورہ کیا، کہا۔ ”دوستو! جیسا کہ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں مولا نا حمید الدین سواہی کی نالائقی اولاد ہوں۔“

ابھی آپ یہیں تک ہی کہہ سکے تھے کہ ایک ارادت مند کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”شیخ! آپ کا جو منصب ہے، وہ آپ کو جموٹ نہیں بولنے دے گا۔ کیا آپ مجھے یہ بتا سکیں گے کہ آپ نے ہم سے یہ تعارف کیوں نہیں کرایا تھا کہ آپ حضرت حمید الدین ناگوری سواہی کی اولاد میں سے ہیں۔ اور یہ کہ۔“

آپ نے اس کی بات کاٹ دی، فرمایا۔ ”اے بھولے بھالے انسان! مجھے ذاتی طور پر وہ تعارف پسند نہیں، جس میں کسی کی تعریف و توصیف اس کے اعلیٰ خاندان اور ولی مفت انسانوں کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ حالانکہ کسی کا تعارف یہ ہے کہ انسان کی شناخت اور پہچان اس کے اپنے نام اور کام کے حوالے سے کی جائے۔“

آپ کے ارادت مند آپ کی باتوں سے اس حد تک متاثر اور مرعوب تھے کہ اب ان میں سے کسی کی بھی بولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا۔ ”لوگو! میں اپنی بات کو بلا وجہ کیوں طول دوں، میں اپنے جواہر کا عرس کرنا چاہتا ہوں اور لوگوں کو اس عرس کا کھانا کھانا چاہتا ہوں کیونکہ اس وقت میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کے لطف و کرم سے ہوں۔“

کئی مریدوں نے بڑی سرگرمی اور جوش سے جواب دیا۔ ”آپ یہ عرس ضرور کریں، ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ ہم سے جو خدمت لینا چاہیں، ہم انجام دینے کو تیار ہیں۔“

آپ نے مریدوں اور ارادت مندوں کی سرگرمی اور جوش کو دیکھتے ہوئے شاندار عرس کی تقریب منعقد کر دی۔ اس تقریب میں آپ نے اپنی طرف سے جو کھانا تیار کرایا تھا وہ تو تھا ہی، اس کے علاوہ ناگور والوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر چھ لیا۔ ان لوگوں نے چاول اور سبزی کی کئی دیکھیں اپنی طرف سے پکوائیں تھیں۔ پورا ناگور اور قرب و جوار کے لوگوں نے اس کمانے کو جی بھر کے کھایا۔ آپ نے اس روز روزہ رکھ لیا تھا اور اس کمانے میں سے اپنا حصہ الگ کر کے اپنی اطوار کا بندوبست کر لیا تھا۔

شام کا اظفار سے کچھ دیر پہلے چار بھئی آپ کے پاس آئے اور دوزی سے آواز بلند کی۔ ”خواجہ حسین کہاں ہیں؟ ذرا انہیں بلواتو۔“

خواجہ حسین اعظمی کے اظہار میں بیٹے تھے۔ جب آپ نے یہ آواز سنی تو کسی مرید سے کہا۔ ”باہر جا کر دیکھنا تو کسی مرید نے کہا۔ ”کون لوگ ہیں؟“ اور کیا چاہتے ہیں؟“

مرید باہر گیا تو وہاں چار ابھری چہرے اس کے اظہار میں کھڑے تھے۔ مرید نے پوچھا۔ ”تم لوگ کون ہو؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”اللہ کے بندے۔“

مرید نے دوسرا سوال کیا۔ ”کہاں سے آئے ہو؟“

دوسرے نے جواب دیا۔ ”اللہ کے شہر سے۔“

مرید نے تیسرا سوال کر دیا۔ ”کیوں آئے ہو؟“

تیسرے نے جواب دیا۔ ”اللہ کے ایک نیک بندے سے ملاقات کرنے۔“

مرید نے کہا۔ ”تب مجھ کو لوگ اللہ کے اس نیک بندے کا انتظار کرو۔ اظہار اور نماز کے بعد ملاقات ہو جائے گی۔“

چوتھے نے ٹھٹھا کیا۔ ”واہ بابا! یہ کیا بات ہوئی۔ اللہ کا نیک بندہ اکیلے اکیلے اظہار کرے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا، ہم بھی تو اس کے پاس بیٹھ کر آئے ہیں۔ اس سے کہہ دو کہ یہ مدت سے بعید ہے، ملتا ہے تو ابھی ملے۔ اس کے بعد تو ہم خود بھی ملیں گے۔“

مرید نے ان چاروں میں ایک مرض مشترک دیکھا۔ یہ چاروں کسی جلدی مرض میں مبتلا تھے اور ان کے ہاتھ ٹھنڈے لاق نہیں تھے کوئی صحت مند انسان ان کے پاس یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھا پیتا۔ مرید نے سوچا ان چاروں کو مرشد سے نہیں ملنا چاہیے۔ بیٹھنے سے نال دینا چاہیے۔ چنانچہ مرید نے کہا۔ ”صاحبان! آپ کے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ کچھ توقف فرمائیں۔ وہ کیا اظہار اور کھانے کا مسئلہ تو اس کا انتظام میں خود کروں گا۔“

ایک نے ذرا بے مروتی اختیار کی، بولا۔ ”تو کون ہوتا ہے پھر پھر کرنے والا۔ ہم خواجہ حسین کے پاس آئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے بارے میں جو کچھ پوچھا تھا، تجھ کو بتا دیا گیا۔ اب تو اندر جا اور ہماری باتیں ان تک پہنچا دے۔ بابا حسین ہم سے ملنا چاہیں گے تو ملیں گے۔ نہیں ملنا چاہیں گے تو دیا بتا دیں گے۔“

مرید جڑ بوز کر اندر گیا اور آپ سے کہا۔ ”مرشد! عجیب گندے اور ضدی مہمان آئے ہیں۔ چاروں کے ساتھ کوئی شرف آدمی گولی دو گولی بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرے گا پھر جائیکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پیتا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ کہتے کیا ہیں؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”وہ کہتے ہیں ہم اسی وقت آپ سے ملاقات کریں گے۔ جب میں نے ان سے یہ کہا کہ میرے مرشد نے آج روز رکھا ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہم بھی روزے سے ہیں اور ہم چاروں ان کے ساتھ ہی اظہار بھی کریں گے اور کھانا بھی کھائیں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”یہ بات ہے تو میں ان کے پاس جاتا ہوں۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”میرے مرشد! جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت آپ کا ان کے پاس جانا ٹھیک نہیں ہے۔ بھلا ان کا کھانا دنا مرض آپ کو پریشان کر دے گا اور آپ مہینوں اپنی طبیعت پر قابو نہیں پاسکیں گے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”کوئی بات نہیں۔ وہ چاروں میرے مہمان ہیں۔ مجھ سے ملنے آئے ہیں چنانچہ میرا فرض ہے کہ میں ان کی تواضع کروں، دل جوئی کروں، میں ان سے ابھی اور اسی وقت ملوں گا۔“

مرید نے آخری بار کوشش کی کہ یہ باہر نہ جائیں۔ اس نے کہا۔ ”حضرت! خدا کے لیے آپ ان کے پاس نہ جائیں۔ وہ بڑے ذہین اور گمانے لوگ ہیں۔ آپ خواہوا پریشان ہو جائیں گے ان سے مل کر۔“

لیکن آپ نہیں مانے اور باہر چلے گئے۔ چاروں درویش انہیں دیکھتے ہی بڑبڑلا کہنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”بابا حسین! ہم نے تو آپ کا بڑا شہرہ سنا تھا لیکن آپ کے مرید نے تو آپ کی تصویر ہی بگاڑ کر رکھ دی۔“

دوسرے نے کہا۔ ”بابا! وہ تو ہم سے اسکی بحث کرنے لگا کہ ہم کیا کہیں۔“

تیسرا بولا۔ ”اور کمال تو یہ ہے کہ اس نے ہمیں کھانے تک نہ پوچھا۔“

چوتھے نے کہا۔ ”ہم نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ جب ناگوار آئے ہیں تو ہم آپ سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔ چاہے ہمیں کتنا ہی انتظار کرنا پڑے۔“

خواجہ حسین نے دیکھا، ان کی اٹیوں سے خون رس رہا ہے۔ انہیں کراہت تو ہوئی لیکن پھر بھی بڑے تحمل سے جواب

دیا۔ ”بزرگوار! میرے مرید نے اگر آپ کو کسی قسم کی تکلیف پہنچائی ہے تو میں اس پر شرمندہ ہوں اور حافی چاہتا ہوں۔“

درویش مسکراتے لگے۔ ایک نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کہا۔ ”بابا! تم بھی کیا کہو گے۔ چلو صاف کیا لیکن شرط یہ ہے کہ میں اظہار کر دوں گا کھانا کھاؤ لیکن تم خود بعد میں کھاؤ وہ بھی نہیں خود۔ ہم جو کھانا چاہوں گے وہ تم کھاؤ گے۔“

یہ بڑے ظلم و کراہت کی بات تھی لیکن آپ نے ان کی یہ شرط مان لی۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے اپنے حصے کا کھانا ان کے پاس ہی بنگوا لیا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ ان درویشوں نے ہاتھ دھوئے بغیر کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے سوچا، یہ کیسے درویش ہیں کہ مغرب کی اذان کا بھی انتظار نہیں کیا اور کھانا کھانے لگے۔

وہ کھا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ایک نے آپس ہی میں کہا۔ ”بھائیو! بابا حسین بہت پریشان ہے کہ ہم نے ذرا پہلے ہی اظہار کیوں کر لی۔ اب اس کو بتاؤ کہ ہم مسافر ہیں اور حالت مسافرت میں روز فرض ہی نہیں۔“

آپ شرمندہ ہو گئے۔ وہ چاروں کھانا کھاتے رہے اور آپ پر ہنسنے رہے۔ آخر میں ایک چھوٹا چھوٹا سا کھانا ان کے لیے چھوڑ دیا، بولے۔ ”بابا! ہم نا انصاف لوگ نہیں ہیں، یہ تمہارا صلہ ہے۔ اس کو تم کھاؤ۔“

خواجہ حسین نے ان کا پس خوردہ لے لیا اور جیسے ہی اذان ہوئی، اس سے اظہار کرنے لگے اور اظہار کے بعد نماز ادا کی اور سلام پھیرنے کے بعد اپنے پیچھے دیکھا تو وہ چاروں درویش شاید کہیں ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ آپ کو حیرت تو ہوئی لیکن کچھ نماز کے بعد آپ نے کھانا کھا لیا اور اب جو دوبارہ مڑ کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چاروں درویش موجود ہیں اور انہیں کھانا کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ وہ چاروں بہت خوش ہوئے۔

ایک نے پوچھا۔ ”بابا حسین! ہم نے ہماری یہ زخمی انگلیاں دیکھیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں دیکھیں، کیوں پھر؟“

دوسرے نے پوچھا۔ ”تمہیں ان سے کمن نہیں آتی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو آپ اللہ والے لوگ ٹھہرے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔“

تیسرے نے اٹھ کر آپ کو گلے لگالیا، کہا۔ ”شاباش بابا حسین! تم امتحان میں پورے اترے۔ اللہ نے چاہا تو آج کے بعد تم کال ہو جاؤ گے۔“

اس کے بعد تیسرے نے بھی انہیں باری باری گلے سے لگا لیا اور انہیں دعا میں دیں۔ اب جو آپ نے انہیں دیکھا تو وہ مارے کے مارے اچھے خاصے صاف شہرے کھڑے تھے۔ ان کی انگلیاں بالکل صحیح تھیں۔ ان سے خون نہیں بہک رہا تھا۔ خوبصورت، پاک صاف، شہزادوں جیسے۔

آپ کو وہ چاروں دعا میں دیتے رہے۔

اب تو آپ نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی طمانیت محسوس کی۔ آپ خود کو بالمال محسوس کر رہے تھے۔

آپ نے ان سے پوچھا۔ ”بزرگو! آپ نے اپنا تعارف تو کر دیا ہی نہیں۔“

ایک درویش نے جواب دیا۔ ”ہم عالم بالا کے لوگ، کبھی بھی اللہ کے نیک بندوں کو اس کے حکم سے جب کچھ دینے آتے ہیں تو اسی طرح پہلے انہیں آزمائش میں ڈال دیتے ہیں پھر جب وہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو جو کچھ انہیں دینا ہوتا ہے، انہیں کر پٹے جاتے ہیں۔“

بائیں کرتے کرتے آپ نے دیکھا وہ چاروں درویش ہوا میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اب ان کا کہیں وجود تک نہ تھا۔ آپ ناہوش سے اندر گئے اور مرید سے کہا۔ ”آج تو نے ان درویشوں کو ناراض کر کے ہمارا بڑا نقصان کر دیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہم اسے بگڑے معاملے کو سنبھال لیا۔“

مرید نے کہا۔ ”کیا آپ نے ان زخمی گھٹاؤں سے درویشوں پر غور نہیں کیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”غور کرنا کیا معنی؟ میں نے تو ان چاروں کا پس خوردہ تک کھایا ہے۔“

مرید کو حیرت تھی کہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”اللہ کے بندے انظر پیدا کر، حوصلہ پیدا کر، اللہ کے بندوں کو بچانے والی نظریں پیدا کر۔ وہ کون تھے، کیا دینے آئے تھے، کس کے حکم سے آئے تھے؟ یہ ساری راہ کی باتیں میں

اور میں خوش ہوں کہ میں نے انہیں سمجھنے اور پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔
 میرے حضرت سے آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔ وہ کچھ دیر بعد باہر گیا اور درویشوں کو تلاش کیا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میرے
 سوا چاہے تھا کہ وہ درویش کہاں چلے گئے اور یہ خبر مرشدان کے لیے کیا فرما رہے ہیں۔
 ناگور میں یہ دستور تھا کہ ان کے ساز و سامان میں ایک گھوڑا گاڑی کا ہونا بہت ضروری تھا اور لوگ سوچتے تھے کہ اس کا
 انتظام کر لیتے تھے۔ آپ کے پاس بھی ایک گھوڑا گاڑی تھی اور اسے آپ خود چلایا کرتے تھے۔ اس گاڑی میں بھی کئی نکل
 بھی جرت لیے جاتے تھے۔ آپ درویشوں کے کاموں کو اس کی مدد سے انجام دیا کرتے تھے۔
 انہیں ساز کا بے حد شوق تھا۔ آپ محفل ساز خود بھی دیکھا تھا۔ ان میں اور خواجہ حسین میں زمین
 خاکروب ایک مدت سے آپ کو کچھ رہا تھا۔ اس نے ریشموں اور امیروں کو بھی دیکھا تھا۔ ان میں اور خواجہ حسین میں زمین
 آسمان کا فرق پایا جاتا تھا۔ وہ اکثر آپ کے اس پاس رہنے لگا تھا اور آپ کی باتیں اور صحبت اپنا کام کیے جا رہی تھیں۔
 ایک دن غصے میں یہ خاکروب حاضر تھا اور حسب معمول باتیں بہت دہکھی سے کر رہا تھا۔ جب آپ باتیں کر چکے تو
 خاکروب نے آپ سے کہا۔ ”حضرت! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“
 آپ نے فرمایا۔ ”ضرور کہ تو ایک نہیں ہزار بار میری صحبت میں اٹھتا بیٹھتا رہو۔ اب مجھے ذرا تہہ کو تہہ میری ہم نشینی
 نے تھوڑا اثر دکھایا؟“
 خاکروب نے جواب دیا۔ ”یہ کہ اب میں اپنے آبائی دین کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا چاہتا ہوں اور آپ کے دست حق
 پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔“
 آپ کو اس کی باتوں پر نہ تو حیرت ہوئی اور نہ ہی دشت۔ آپ نے پوچھا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو اسلام کیوں
 قبول کرنا چاہتا ہے؟“
 اس نے جواب دیا۔ ”میرا دل اسلام کی طرف مائل نہیں کیوں کچھ رہتا ہے۔ اسلام کا سحر مجھ پر اثر کر چکا ہے۔“
 آپ نے خاکروب کو مسلمان کر لیا۔ یہ پاک صاف رہنے والا انسان مسلمان ہو جانے کے بعد آپ کے کھانے پینے
 میں اس طرح شریک و شامل رہتا جیسے وہ بھی اس گھر کا ایک فرد ہے۔ وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بہت زیادہ معزز ہو گیا تھا۔
 وہ آپ کے مشاغل کا ایک ضروری اور لازمی سامع تھا۔
 آپ کے ایک ارادت مند نے محفل ساز منعقد کیا اور اس میں شرکت کی آپ کو بھی دعوت دی گئی۔
 جب آپ اس محفل میں شریک ہوئے تو آپ کے ساتھ یہ خاکروب بھی تھا اور دوسرے مرید اور ارادت مند بھی۔
 قوالوں نے محفل کا شروع کیا اور آپ پر اس کا اثر شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب قوالی ختم ہوئی تو آپ اس کے
 زیر اثر جھل کی طرف چل دیے۔ خاکروب آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جھل سے پہلے مگر ناگور کے باہر ایک خوش تھا اور
 اس خوش میں ہر وقت پانی رہتا تھا۔ آپ اس خوش پر چلے گئے۔ پانی کی سطح پر پوں چلے جیسے وہ کسی سچے پر چل رہے
 ہوں۔ خاکروب نے بھی آپ کی ابتلا کی اور وہ بھی اسی طرح چلتا ہوا خوش میں داخل ہو گیا۔ اس کو بھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ لوگ
 اس غیر معمولی نشان پر دھک دھک میں جھلا رہے تھے۔
 آپ کے پاس غیر مسلموں کا مانتا تھکے لگے۔ یہ لوگ اسلام قبول کر رہے تھے اور خاکروب بھی حیثیت حاصل کرنا چاہتے
 تھے۔ لیکن۔

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر بدعتی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

ان دنوں مانڈو پر غیاث الدین غنی کی حکومت تھی۔ سلطان کو آپ کی ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ایک دن اس نے
 اپنے کی آڈی آپ کے پاس بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ میں آپ کی قدم پوسی کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں اس لیے آنے کی
 اجازت دی جائے۔

آپ نے ان آدمیوں سے کہہ دیا کہ ”اپنے بادشاہ کے پاس واپس جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ وہ اپنی دنیا میں کن رہے،
 میں اپنی دنیا میں خوش ہوں۔ ہمیں اس سے تباہ و برباد نہیں کرنا چاہیے۔“

سلطان وفد کے ایک رکن نے کہا۔ ”وہ تو آپ بجا فرما رہے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچے کہ مانڈو کا سلطان یہ درخواست کر رہا

ہے درود اگر چاہے تو یہ بات شاہی فرمان کی صورت میں مسلما کر سکتا ہے۔
 آپ نے جواب دیا۔ ”ابا اہم درویشوں کی دنیا میں شاہی فرمان نہیں چلے سکتے۔ کیونکہ یہاں تو کسی اور ہی کی بادشاہت ہوتی
 ہے اور کسی جگہ ایک وقت دو بادشاہوں کے فرمان نافذ نہیں ہو سکتے۔“
 اس شخص نے کہا۔ ”جناب والا! میں آپ کو حضور درویشوں کا کہہ رہا ہوں کہ خدا نے سچے اور بادشاہ کو رحمت نہ بھیجے بلکہ آپ خود میرے
 ساتھ چلے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں سلطان سے آپ کو کوئی لاکھ کی جاگیر دوں گا۔“
 آپ کو کھنسا آ گیا۔ جوش میں فرمایا۔ ”ابا! میں اس بات کا خیال کر رہا ہوں کہ تم لوگ میرے پاس چل کر آئے ہو۔ اگر
 یہ بات نہ ہوتی تو میں تم لوگوں کو یہاں سے بھی نہیں نہ دیتا۔“
 وفد کے عاقبت نااندیش رکن نے پوچھا۔ ”ورنہ آپ کیا کرتے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں کیا کرتا، جو کچھ کرتا میرا خدا، میرا اللہ کرتا۔ میں کیا کرتا۔“
 اس شخص نے کہا۔ ”تو یہ سچے سچے ہیں کہ آپ شرافت سے سلطان کے پاس نہیں جائیں گے؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میرا یہی جواب ہے۔“
 سلطان نما سجدے نے کہا۔ ”اے شخص! یہاں شور نہ کر۔ ہم نے ابھی تک انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیا ہے۔ اپنی حدود
 میں رہو اور بات اتنی نہ بڑھا کہ ہمیں بھی کچھ کرنا پڑ جائے۔“

شاہی وفد کے دوسرے ارکان آپ کی حمایت میں بولنے لگے۔
 آپ نے ان سب سے کہا۔ ”صاحبان! آپ لوگ معمولی سی رقم کے عوض زندگی میری غلامی خرید لیتے ہیں۔ بڑی بہت
 کا کام ہے۔ یہ خدا تم پر رحم فرمائے اور اس کی توہین دے کہ تم ان سے محفوظ رہو اور اپنے دین دنیا کی تحریف نہ کرو۔“
 ایک اعتدال پسند رکن نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ ناراض نہ ہوں۔ بھائی! آپ کن خیالوں میں پھنس گئے ہیں
 جو ہم غریبوں پر تو جہنم دیتے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”فضول باتیں نہ کر۔ تجھے تیرے سوالوں کے جواب مل گئے۔ اب واپس جا اور ہمارا وقت برباد نہ کر۔“
 وہ لوگ واپس چلے گئے تو آپ نے مریدوں سے کہا۔ ”ملاحظہ فرمایا آپ نے، یہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ فقیروں کو سلطانی
 ہم خوار، ادنیٰ سی سپاہ و دھمکیاں دیتی پھر رہی ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے، کیا میں اللہ دوں مانڈو کو۔“
 لوگ آپ کی پھر خاموشی میں کرنے لگے۔ کئی مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت! ان بادلوں کو معاف فرمادیں۔ انہیں
 کچھ معلوم نہیں ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اللہ نے چاہا تو ایک بار سلطان سے ضرور ملوں گا۔ نہ وہ۔۔۔۔۔“
 خاکروب نے پوچھا۔ ”کیا آپ سلطان کے پاس تشریف لے جائیں گے؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں وہاں کیوں جانے لگا۔“
 خاکروب نے پوچھا۔ ”کیا سلطان آپ کے پاس آئے گا؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، وہ میرے پاس کیوں آئے گا۔“
 خاکروب نے کہا۔ ”پھر دونوں کی ملاقات کس طرح ہوگی؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”وہ جس طرح چاہے گا، ملاقات کرادے گا۔“

کچھ عرصے بعد ہر طرف خبر پھیل گئی کہ سلطان غیاث الدین غنی کے پاس کہیں سے رسول مقبول ﷺ کی ریش
 مبارک کا ایک بال آیا ہوا ہے۔ آپ کو اس خبر نے بے چین کر دیا۔ آپ نے جلدی جلدی کپڑے پہنے گاڑی میں بٹل جوتے
 اور ان پر بیٹھ کر چل دیے۔

خاکروب نے پوچھا۔ ”حضرت! کہاں؟ یہ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں آپ؟“
 آپ نے جواب دیا۔ ”میں رسول اللہ ﷺ کی ریش مبارک کے بال کی زیارت کو جا رہا ہوں۔“
 خاکروب خاموش ہو گیا۔

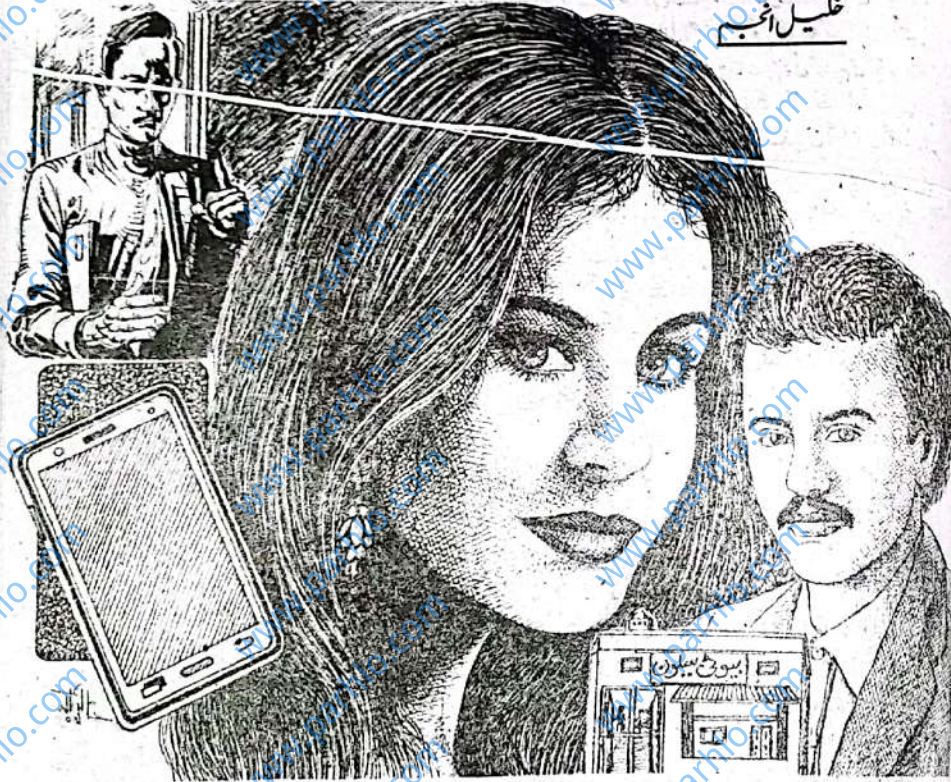
سلطان یہ بال لے کر آپ کے پاس آ رہا تھا۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔
 سلطان کے مضافوں نے آپ کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ارے یہ خواجہ حسین کہاں سے آ رہے ہیں؟“

جو آنکھیں اپنے محبوب کے ساتھ کا خواب دیکھ لیتی ہیں ان میں کسی دوسرے کا وجود چھتا ہی نہیں ہے... لیکن جب خواب اور مقدر میں جنگ ہو جائے تو وقت کا فیصلہ مقدر کے حق میں ہو جاتا ہے اور خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں... وہ بھی کرچیوں کو چلتے چلتے زخمی ہو گئی تھی لیکن... یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مریم رکھنے کے لیے مسیحا بھی جلد مل گیا۔

بے سمت بھٹکتی حیرت کو ملنے والے راہنما کی دل جوئی کا قصہ

دورِ ابا

خلیل اعجب



”فارگاز ڈیک بلال! کچھ کرو... جلدی۔ امی ابو میری انجمنٹ کے درے ہیں۔“ کنزئی التجانیہ نظروں سے بال کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور کاشف بھائی کے ساتھ ملٹی بھائی بھی۔“ اس نے منہ بھلایا۔
بلال نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بہت پاش نظروں سے کنزئی کو دیکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”کنزئی! فرسٹی... میں ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دوں گا۔ بس بابا کو پاکستان آ لینے دو۔ میں پہلی فرصت میں انہیں تمہارے ہاں بھجواؤں گا۔“
”لیکن وہ کب امریکا سے آرہے ہیں؟“ کنزئی رو دینے کے قریب تھی۔
”بہت جلد۔“ اس کا لہجہ پُر اعتماد تھا۔

سلطان نے پوچھا۔ ”خواجہ حسین؟ کہاں ہیں وہ؟“ ایک صاحب نے ان کی تیل گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ رہے خواجہ حسین!“ سلطان نے اس گاڑی کو پر مشرق نظروں سے دیکھا۔ اس نے گاڑی میں ایک ایسے شخص کو بیٹھ دیکھا جس کا لباس ریاضی صاف نہیں تھا اور لباس میں کئی بے پرواہی موزوں تھے۔ سلطان نے کہا۔ ”یہ تو کوئی دیہاتی یا توکر معلوم ہوتا ہے کی گا۔“ سلطان کے مصاحب نے بادشاہ کو تعجب دلایا۔ ”حضور والا! آپ یقین کریں، یہی خواجہ حسین ہیں۔“ سلطان نے کہا۔ ”خوب، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ہماری اچانک ان سے ملاقات ہو گئی کہ یہ یہاں تک آئے کیوں ہیں؟“ مصاحب نے جواب دیا۔ ”موسم مبارک کی زیارت کرنے۔ انہیں یہ بات اپنے کشف سے معلوم ہو گئی ہوگی۔“ سلطان نے حیرت سے کہا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔ خوب، تو انہیں موسم مبارک کا پتا چل گیا۔ جب میں نے انہیں بلوایا تھا تو یہ نہیں آئے تھے لیکن آج یہ میں بلائے مہمان بن کر نازل ہو گئے ہیں۔ دیکھتا ہوں یہ موسم مبارک کی کس طرح زیارت کرتے ہیں۔“

آپ نے سلطان کے ایک سیای سے کیا۔ ”پہا سلطان سے کہہ دوں کہ وہ ہمیں کیا زیارت کرائے گا۔ اس وقت وہ موسم مبارک ہمارے پاس ہے۔ اگر سلطان چاہے تو میں اس کی زیارت کرا سکتا ہوں۔“

جب یہ بات سلطان کے کانوں تک پہنچی تو اس نے گہرا کر موسم مبارک کی ڈیبا نکالی اور اسے کھول کر بال تلاش کیا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بال غائب تھا۔

سلطان گاڑی کو آگے بڑھا لے گیا۔ بالکل آپ کے پاس۔ سلطان نے ان سے کہا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کچھ دیر پہلے ایک چیز ہمارے پاس تھی۔ اب وہ جہ آپ کے پاس ہے۔ ایسا ہوا کیونکر؟“

خواجہ حسین نے جواب دیا۔ ”کیا ہم نے جھپٹے دنوں یہ نہیں کہا تھا کہ یہاں دو بادشاہوں کے فرمان میں چلیں گے۔ سلطان تو دکھاوے کا بادشاہ ہے۔ یہاں کا سلطان تو کوئی اور ہی ہے۔“

جب بادشاہ کے کہنے پر آپ نے موسم مبارک دکھایا تو بادشاہ کا حال ہی کچھ اور ہو گیا۔ اس دن بادشاہ نے آپ کی بے حد تعظیم کی۔

☆☆☆

آپ کی کوششوں سے آس پاس اور دور دور تک اسلام پھیل گیا۔ سلطان غیاث الدین خلجی نے بار بار بہت کچھ دینا چاہا مگر آپ نے انکار کر دیا۔ سرکاری دربار سے ہمیشہ نفور رہے۔ ایک مرتبہ سلطان نے آپ سے معلوم کیا کہ کشف سے بتائے قہر میں میرے باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔

آپ نے سلطان کے باپ کی قبر پر جا کر مراقبہ کیا اور سلطان کو بتایا کہ صاحب قبر اچھے حال میں ہے۔ انہوں نے اس پر بڑی مہربانیاں کی تھیں۔

خواجہ حسین 1390ء میں پیدا ہوئے تھے اور 1495ء میں معمولی علالت سے انتقال فرما گئے۔ ان کے وصال سے چھ طرف کرام برپا ہو گیا۔ سلطان غیاث الدین خلجی نے جنازے میں شرکت کی اور آپ کے مزار اور عمارت کی تعمیر اپنی نگرانی میں کروائی۔

کہتے ہیں ان کے جد اعلیٰ حمید الدین سوانی ناموری کا مزار سلطان محمد تغلق نے تعمیر کرایا تھا۔ حالانکہ سلطان محمد تغلق صوفیائے کرام سے چڑھا تھا۔ بات پھر دہلی پہنچ جاتی ہے۔ ایک ہی ملک میں دو بادشاہ ہوتے ہیں۔ بظاہر حکم کی کاجیتا ہے اور یہ باطن حکومت کی باگ ڈور کی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ نہ دکھائی دینے والے حکمران ایسے ایسے فرمان جاری کر دیتے ہیں کہ جب ان کی نسل ہو جاتی ہے تو اس پر محدود رجحان ہوتی ہے۔ ایسا کیونکر ہو گیا ہے؟ ایک ایسا سوال جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ جس کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہوتا۔

ساخداات

اخبار الاخبار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ سکینتہ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ۔ سفینۃ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ۔ الفتح الربانی۔ ملفوظات حضرت غوث الاعظم

بڑے لوگ بڑی باتیں

☆ ماں باپ کی خوشنودی دنیا میں موجب دولت اور عاقبت میں باعث نجات ہے۔
☆ خود کو گناہ گار نہ سمجھنا بڑی کامیابی ہے۔
☆ بد بخت سے وہ شخص جو خود مر جائے مگر اس کا گناہ نہ مرے یعنی کوئی بڑی بات جاری کر جائے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑی چیز عزت اور سب سے قیمتی چیز دوستی ہے۔
(مرسلہ: محمد انور رحمہ اللہ، حوالی لکھا، اوکاڑہ)

نے روز روز سے چلانا شروع کر دیا۔ وہ اس کی چیخ و پکار سن کر بھونچکا رہ گیا۔

نئی نوٹی لبین کی بیچوں نے وہاں جمع لگا دیا۔ وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

بلال ہکا بکا کزن کی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ان تپڑوں کا بھی ادراک نہ ہو سکا جو پانچ کمر کمر سے اس کے سر اور گردن کے پیچھے سے پڑے تھے۔ اسے گریبان سے پکڑ کر وہاں سے بھاگ کر لے جایا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ قار قار اندر آیا تو وہ سب باہر چلے گئے۔

وقار تھوڑا سا جھلا ہوا تھا۔ اس کا دل اندر سے بہت بری طرح ڈر رہا تھا۔ نہ جانے بلال نے وقار کو اس کے بارے میں کیا کیا بتایا تھا۔ وہ دیر سے دیر سے لرز رہی تھی۔ تمام نیک نامی اور عزت اسے مٹی میں مٹی نظر آ رہی تھی۔ بلال نے اسے کہیں کانٹیں چھوڑا تھا۔ اس کا سانس سینے میں ایک کر رہ گیا تھا۔ پھر اسے وقار کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا۔

”پتا نہیں کدھر سے منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں۔ ایسے ہی اول نول بک رہا تھا۔ بہر کیف تم پریشان مت ہو۔ اونے پولیس کوفوں کر دیا ہے۔ پولیس پہنچے ہی والی ہوگی۔“ وہ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا۔ ”میرے دوست کے بیوی سیلون میں کام کرتا ہے۔ آج صبح دلہا کے لیے اسی نے مجھے تیار کیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کل ویسے میں بھی اسی سے تیاری کرواؤں گا مگر یہ بد بخت تو بہت کم طرف لگا۔“ وہ وقار کی بات پر حیرت سے اسے کہنے لگی۔ اس کے دیرے پوتے کے پھر اٹھنے سے سرو وقار کے شانے پر کھڑکھڑا رہے۔

”اچھا کیا آگئے۔“ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ دور رہے سے منزل کی طرف مڑ چکی تھی۔

باقی قسط لبین اس کی رضا کے لیے سب کو خفا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی اس سے دوبارہ نہ ملنے کا سوچ کر آگئی۔
دل میں طوفان اٹھائیں بار بار تھا۔ بلکوں کے کوشے بار بار دھناک ہو رہے تھے لیکن ایک جبر مسلسل تھا جو اسے چھوٹ چھوٹ کر رونے سے روک رہا تھا۔ اس نے خود کو وقت کے دھارے کے سپرد کر دیا۔ خالق کی رضا پر شاکر ہو گئی تھی۔

تمام عمر کی پاکیزگی کا روپ کزن کی لبین کے نکھار میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ وہ جی سنوئی وقار کی لبین کی بیٹی تھی۔ ہر طرف معطر خوشبو میں رقصاں تھیں۔ خوبصورت تھی۔ ہر طرف کی قیاس پر بیٹی کزن نے گھونٹ لے رکھا تھا۔ پھر ان کی باتوں میں اپنے مجازی خدا کی شہرہ تھی۔ جذبات سے اور بیا کھر میں اک کھک نے بے پروا ڈال رکھا تھا۔ خوابوں کی عاری وجود میں اس کی آنکھوں میں چھپ رہی تھی۔ چہن کر چہن کے مانند اس کی آنکھوں میں چھپ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی آیا تھا۔ وہ آنے والے کو نہ دیکھ پائی۔ اپنے وجود میں سٹ گئی۔ آنے والا وقار کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

”کزن!“ یہ آواز تو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اس نے فوراً نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے بلال کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر شش در رہ گئی۔

وہ دیگر کون حالت میں اس کے سامنے موجود تھا۔ الجھے بال اور سرخ آنکھیں اس کی حالت زار کا قصہ سن رہی تھی۔ ”بلال تم؟“ وہ حیرت و بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

بلال اس کے کہہ کر کچھ کر پاتی، وہ سہری پر اس کے رو بہ چہن چکا تھا۔

”کزن!“ اتم نے مجھ سے بے وفائی کی ہے۔ تمہاری خوشامی میں بھی اجیرن کر دوں گا۔“ وہ اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر جھجھوتے ہوئے کہنے لگا۔ وہ انکشت بد مذاں پھٹی ہوئی آنکھوں سے بلال کو تنک رہی تھی۔ یہ اس کا اپنا بلال نہیں تھا جس سے وہ دل و جان سے بڑھ کر محبت کرتی تھی۔ ”تم اگر میری نہ ہو سکی ہو تو میں تمہیں کسی کی بھی نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ غیظ و غضب سے اسے گھورتے ہوئے چھوڑ رہا تھا۔ وہ اس شخص کو جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ بلال کا ہم عمل ضرور تھا مگر وہ بلال نہیں تھا۔ اس کا بلال تو نہایت محل والا اور پیار کرنے والا تھا۔

اس کے اندر پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آئی کہ اس

اس رات وہ جی بھر کر روئی۔ جھپوں کی اسیری میں جب اسیری ہے۔ نہ بھوک لگتی ہے، نہ نیند آتی ہے۔ وہ نہیں ملتا ہے۔ وہ بھی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ سو باں سوچ آف تھا۔ آن ہوتا تو جس کے لیے مضطرب و بے چین تھی، وہ اپنی بے چینی کا اظہار کر کے مزید بے چین کر دیتا۔

بلال کے والد حیات بدر امریکا سے واپس نہیں آئے تھے۔ کروٹار کے والد نے یہ اعلان کر دیا کہ وقار کو ایک مہینے بعد امریکا جانا ہے لہذا شادی کی تاریخ مقرر کی جائے۔ بات چٹ مٹ گئی۔ باہر والی ہو گئی تھی۔ کزن کی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو جائے گا۔ اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی موت کی تاریخ متعین کر دی گئی ہے۔ وہ بلال سے ملی۔ وہ بھی بہت پریشان تھا۔ اسے سب کچھ اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں جب کہہ رہا ہوں کہ کورٹ میرج کر لیتے ہیں تو اس میں کیا قیاحت ہے؟“

”انکل اگر امریکا سے آ کر اب بھی تمہارے لیے میرا ہاتھ مانگ لیں تو اس میں کیا قیاحت ہے؟“ وہ برجستہ بولی۔ ”وہ کاروباری معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔“ وہ دیر سے بولا۔

”تو کیا گھر کی معاملات میں، میں دخل اندازی کرتی اچھی لگوں گی؟“ کزن کی کالج بھینسی تھی۔

”تم بے وفائی والی باتیں کر رہی ہو کزن!“ وہ نظریں چرا کر بولا۔

وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔

”بے وفائی یہ بھی تو ہے کہ تم مجھے جائز طریقہ کار سے حاصل بھی نہیں کر سکتے۔“ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

”کورٹ میرج بھی تو جائز طریقہ کار ہے۔“ بلال نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس طرح کا جائز قدم میرے ابو، میرے بھائی بر کیا اثرات مرتب کرے گا، تمہیں کچھ اندازہ ہے؟“ وہ اسے ٹھونسنے لگی۔

”اوہ۔“ وہ خفگی سے بڑبڑایا۔ ”صاف کیوں نہیں کہتی ہو تم بزدل ہو۔“

”ہاں، میں بزدل ہوں کیونکہ مجھے اپنے ابو کو ذلالت میں جھونکنے سے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے دلیل دی۔

اس بار بلال نے کچھ چلا گیا۔ وہ اس کی خفگی کو بے خوبی

دھارے میں جھکے کے سہارے سے جاری تھی۔ ایسے ہی وقت میں بلال کا پیغام اس کے سو باں فون کی اسکرین پر جھلپایا۔ اس نے بے تابی سے پیغام پڑھا۔ پیغام بیچنے والا اسے بلال کا تھا۔ اس سے ملاقات کی آرزو کر رہا تھا۔

یہ پیغام اس کے لیے تو یہ عمر بھر کی طرح ہوا۔ وہ سوچنے لگی، بلال اب سب سے چکا ہوگا۔ انکل اس کے قائل کر لیا ہوگا، منالیا ہوگا جیسی تو وہ اتنی بڑی خوشخبری اسے سامنے بھرا کر سامنا چاہتا ہوگا۔

پیغام کے جواب میں وہ خود اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا روالاں روالاں سرشار تھا۔

”لیکن وہ پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر روتی۔“

”بلال! مجھے ابھی خبر کے لیے بلایا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے دو لفظی جواب دیا۔ وہ اس کے روبرو بیٹھ گئی۔

”میں تمہارے ابو سے ملا تھا۔“ اس نے اواں نظروں سے باہر دیکھا۔

”پھر کیا کیا تمہوں نے؟“ کزن کی کا دل زور سے جھوک اٹھا۔

”وہ۔۔۔ بہت غصہ ہوئے۔ کہنے لگے کہ تمہیں کچھ شرم، جیا، تمہارے بڑوں نے نہیں سکھائی۔ رشتہ مانگنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ تمہارے بڑے کہاں ہیں؟“

وہ ایک لمحے کے لیے غبرچہ پھر گیا ہوا۔ ”انہوں نے کہا کہ انہوں نے تمہاری شادی کر دی ہے اور جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔“ وہ چپ ہو کر کزن کی کو دیکھنے لگا۔ وہ نم دیدہ اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ چھوٹ چھوٹ کر روئی۔

بلال نے لپک کر کزن کی کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”قسم سے کزن! میں نے آج تک اتنی ہک آئیز باتیں نہیں کہیں۔“

مگر۔۔۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں، کورٹ میرج کر لینے۔“

وہ زور سے ہونے لگی میں گردن ہلانے لگی پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آرزو کا دیا کچھ چکا تھا۔ ہم امید توڑ چکی تھی۔ وہ اپنے محبوب کے شانے پر سر رکھ کر رو دینا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا شعور اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا تھا۔

وہ دیر دیر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ہلانے والا اسے آوازیں دیتا رہا لیکن اس کا بلاوا بے سود تھا، آوازیں بے کار تھیں۔ وہ رشتوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی جو اس کے گردن کی پیریاں بنی ہوئی تھیں۔

دل کے برکاوے میں آکر رہتے اور رشتے بدلنے والے ایک عاشق کی بے کس زندگی کی داستان

ہر انسان کی زندگی بیک وقت کئی محاذوں پر برسرِ پیکار رہتی ہے لیکن...
 تمام حادثات و واقعات کو وہ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتا ہے...
 جبکہ وہ ہر رشتے کو اپنے نظریات کے مطابق ڈیل کرتا ہے جیسے کہ یہاں...
 ایک طویل عمر صحرا کی خاک چھان کر سمجھوتا کرنے والے کو اچانک
 نخلستان میسر آیا تو... صحرا کے سفر کی تکلیف نے اسے بے کس کر دیا...
 پیاسے جیون پر ہونے والی برسات نے اسے بوکھلا دیا تھا... سیراب ہونے کے
 باوجود اسے پیاس کی شدت نے ایسے آزار میں مبتلا کر دیا تھا جس سے چاہ کر
 بھی چھٹکارا ملنے والا نہیں تھا... دل کی طلب عجیب تھی اور دماغ زندگی
 کی الجھی گتھیوں کو سلجھا رہا تھا مگر... نہ طلب سکون ہے رہی تھی اور
 نہ ہی الجھی ڈوریاں سلجھ رہی تھیں اور اسی کھینچا تانی میں ایک روز
 جب ڈوریاں ٹوٹ گئیں تو پوری ہونے والی طلب نے بھی ملنے والے گھاؤ کو نہ
 بھرا... جس تنہائی سے نکل کر وہ دل کی مدھر تالوں پر متوجہ ہوا... اسی
 تنہائی نے آخری بل تک اس کا تعاقب کیا۔

دل کی وبی تنہائی

احمد سلیم



سراج میاں کی عمر پچاس برس ہوئی تو اس کی زندگی میں دو انقلاب آ گئے۔ وہ ترقی پا کر پیر شہنشاہ بن گیا۔ دوسرا یہ کہ اسے ایک بیس سالہ سلطنت خاتون سے طوقائی عشق ہو گیا۔

سراج الدین ایک سرکاری ادارے میں محرک بھرتی ہوا تھا۔ شہنشاہ ترقی کے روایتی طریق کار کے باعث بیس سال بعد پیر شہنشاہ کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ ایک ملازم کو بہت جلد سے ترقی دینے کا فیصلہ ہوا۔ جوانی میں عشق ہو تو کسی کو حیرت کا پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ جوانی میں عشق ہو تو کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔ بندہ ادھر عمر ہو، چار بچوں کا باپ ہو، مگر میں ایک بیوی بھی ہو تب لوگ حیرت کی انگلیاں دانتوں سے داب لیتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے سراج میاں کو عشق ہوا تو کسی کو اگر حیرت ہوئی بھی تو اس بات پر نہیں کہ انہیں ایسی عمر میں خلل دامغ ہوا تھا۔ اس بات پر لوگ حیران تھے کہ موصوف ایک صحت مند اور وجہ شخصیت کے مالک تھے اور ان کی بیگم سنجیدہ خاتون بس گزرا سے لاشی شکل و صورت کی حامل تھیں اور پھر داگی پر نصیحت بھی اور حراج کے بالکل برعکس۔ دن کا بیشتر وقت اس کا تنہا یوں بنا ہوا تھیں کہ کڑے بادام چاری ہو۔

سراج میاں محرک تھا۔ پورے بیس سال محرک رہے۔ کے بعد ترقی... پا کر پیر شہنشاہ بن گیا تھا۔ کام تو اب بھی وہی مگر ترقی کا ہی تھا لیکن لوگوں کے لیے چھوٹا مونا صاحب بن گیا تھا مگر زندگی حسن سے، رنگ روپ سے نا آشنا رہی تھی لیکن اللہ پاک نے اولاد کی صورت میں اسے خاص کرم سے نوازا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب بچے بڑے ہی فرمانبردار اور تیز دار تھے۔ سب سے بڑا بیٹا تھا۔ کمال۔ اس نے ایم اے کیا تھا اور ایک پرائیویٹ ادارے میں اچھی تنخواہ پر ملازم لگا تھا۔ دوسرا بیٹا اور بیٹیاں ابھی پڑھ رہی تھیں۔ سراج الدین نے بھی انہیں کسی چیز کی طرف سے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

مختصر یہ کہ اس کی زندگی کے پچاس برس بغیر کسی غیر معمولی حادثے کے گزر گئے۔ پیر شہنشاہ بننے کے بعد ایک آدھ مہینا تو اسے کسی خاص تبدیلی کا احساس نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ دفتر کے جنیئر اسٹاف کی تعلیم اور خوشامد کے مظاہرے ہوئے اور افسروں کی جانب سے التفات ہوئی تو ایک اس کی کیا پلٹ گئی۔ وجود کی گہرائیوں میں نہ جانے کس نیم روشن کوٹھری میں سو ہوا سراج الدین ہڑ بڑا کر بیدار ہوا اور سراج میاں نے خود کو قہر کر ڈالا۔

دبے دبے سے اور ہلکے کنکڑیوں والے سراج میاں نے راتوں رات جون بدل کر ایک پرجوش اور بادشاہ سراج الدین کا غل چڑھا لیا۔ یہ شاید اسی کا یا کلب کا نتیجہ تھا کہ اسے طوقائی عشق ہوا۔

☆☆☆
اس صبح اس نے آئینہ دیکھا تو اپنی صورت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے صدیاں گزری ہوں اس نے آئینہ نہیں دیکھا ہو۔ حاذب نظر چہرے پر کوئی تازگی نہیں تھی۔ چھوٹی چھوٹی ڈانٹنی نے بال سے تہمتیں بڑھے ہوئے تھے، آدھے سے زیادہ بالوں میں سفیدی ڈیرے ڈال چکی تھی۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود آدھے سے زیادہ بال کالے ہی تھے۔ وہ چہرے آئینے میں خود کو دیکھتا رہا۔ افسوس اور دکھ سے گزرے دنوں کی بے کیف اور بے رنگ زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔

سراج الدین غسل خانے سے باہر آیا۔ اس کی بیٹی نے ناشتا تیار کر کے میز پر رکھ دیا تھا۔ ایک طرف سنجیدہ خاتون بیٹہ پر لٹی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی ہی ناگواری سے بیگم کی طرف دیکھا۔ ایک دم ہی اس کے دل میں کراہت اور نا پسندیدگی کے جذبات پیدا ہوئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے آئینہ دیکھتے دیکھتے اس کے دل و دماغ میں جذبوں نے کچھ سرگوشیاں کی تھیں اسی لیے بیمار بیوی کے لیے لگا ہوں کے تیور بھی بدل گئے تھے۔

اس نے جلدی سے ناشتا ختم کیا۔ بیوی کی طرف دیکھے بنا ہی کمرے سے باہر جانے لگا۔ وہ دروازے کے پاس آیا، پیچھے سے بیوی کی کڑواہٹ ہوئی آواز آئی۔ ”ذرا میری بات سنئے۔“ سراج الدین نے پلٹ کر دیکھا۔ بیوی بولی۔ ”میری دوا میں ختم ہو گئی ہیں۔ دفتر سے ذرا جلدی چھٹی کر کے لے آئیں۔“

☆☆☆
وہ ناگواری سے بولا۔ ”میں وقت سے پہلے نہیں آ سکتا۔ ترقی کے بعد میری ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں۔ تم کمال کو لے کر دوسرے دو دوہ لے آئے گا۔“

سراج الدین نے جیب سے جیسے نکال کر میز پر رکھ دیے اور پلٹ کر تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ سنجیدہ خاتون دکھ سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ آج اسے شوہر کی آنکھوں میں بیگم لگی اور بے مہربانی کے تاثرات نظر آئے تھے جن کی کاث بہت واضح طور پر محسوس کی تھی۔

☆☆☆
شام کو سراج الدین دفتر سے آیا تو ہاتھوں میں بہت

دل کی وہی تنہائی
پتیلیں تھیں جو مختلف چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہونے پڑے، فیض، ہلاکت اور کوٹ تھے۔ ان کے علاوہ شہید، ہیر کل، شیبک کا سامان اور پرتو مگر بھی تھے۔ یہ سب وہ اپنے لیے لے کر آیا تھا۔ اس کی ہدایت پر بیٹیوں نے یہ ساری چیزیں اس کی الماری میں رکھ دیں۔ وہ سب حیران تھیں کہ کیا ایک ابو میں یہ کسی تبدیلی آئی ہے۔ بڑی بیٹی شرجان میں پڑھتی تھی، اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

سراج الدین نے کہا۔ ”ترقی پانے کے بعد بڑے بڑے لوگوں میں اور افسروں میں اٹھنا بیٹنا ہوتا ہے۔ ذہن کے کپڑے نہ ہوں تو سب مذاق اڑائیں گے۔ اس لیے یہ سب لے آیا ہوں۔“
چھوٹی بیٹی مکمل جوتاؤں میں پڑھتی تھی، سراج الدین اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اس نے جیسے ہوئے پوچھا۔ ”ابو! یہ سب تو شیبک ہے مگر یہ ہیر کل اور شیبک کا سامان کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔“
”ارے بیٹا! ظاہر بات ہے اپنے لیے ہی لے کر آیا ہوں۔ تمہاری امی کی طرح جوانی میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب انہیں استعمال کر کے پھر سے جوان بن جاؤں گا۔“
اس کی بیٹیاں کلکھلا کر ہنس پڑیں جبکہ ایک طرف بیٹہ پر لٹی سنجیدہ خاتون کا دل کٹ سا گیا۔ اسے اپنی بیماری اور بے بسی کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا۔

☆☆☆
اگلی صبح سراج الدین تیار ہو کر باہر آیا تو سب مگر دانے دیکھتے رہ گئے۔ وجہ یہ تو وہ شروع سے ہی تھا، اب ذہن کا لباس پہن کر اور اپنا حلیہ درست کر کے وہ ایک دم اپنی عمر سے بہت کم لگنے لگا تھا۔ سنجیدہ خاتون نے شوہر کو اس روپ میں دیکھا تو اپنی کم مائیگی کا احساس کر کے مٹی بھر آیا اور کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجھنے لگیں۔

اس دن کے بعد سے سراج الدین کی روکی بھیگی زندگی میں ایسا رنگ روپ آیا جیسے خزاں رسیدہ پتروں پر ہل پات آتے ہیں اور چند دنوں میں پچاس برس کا شخص اور بچوں سا سراج ایک دم توانا اور خوش مزاج آدمی بن گیا۔ ایسے ہی زندہ دل دوستوں میں شریف صاحب بھی تھے۔ ان کا کلمے میں جزل اسٹور تھا۔ سراج الدین دفتر سے اگر شام کے وقت شریف صاحب کے جزل اسٹور میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہاں دو چار اور بھی باغ و بہار طبیعت کے لوگ مل جاتے۔ رات گئے تک خوش چہلوں اور نئی مذاق نما گفت گزرتے۔

شریف صاحب بڑے مجلسی آدمی تھے۔ ایک ادبی تنہیم کے رکن بھی تھے مگر غضب کے باتوئی تھے۔ ایسی چلمچریاں چھوڑتے کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اگرچہ عمر نے بڑی مسافتیں طے کی تھیں مگر خیالات لو جواؤں جیسے تھے۔ شراب اور شہاب کے قسیدوں کے بغیر ان کی بات مکمل ہی نہیں ہوتی تھی۔ جزل اسٹور ملازم سنجیدہ تھا۔ وہ خود محفل یاراں کو کرم کر دیتے۔

جب سراج الدین وہاں آنے جانے لگا اور شریف صاحب کی باغ و بہار محبت نے اپنا رنگ ڈھنگ دکھا یا تو چند ہی دنوں میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ پھر تو محفل ادیبز عمریں بھی بے باک تھبتے تھے، باد و ساغر اور شعر و ادب کی مشکو کے پردے میں فحش دل کے قصے تھے، چاند چہرہ اور ستارہ آنکھوں کی باتیں اور کھاتیں تھیں۔ شریف صاحب اور دیگر کے احساسات تو وہ جانتیں مگر سراج الدین اپنی بے رنگ اور بے کیف زندگی کی لالچا صلی پرتوٹ پھوٹ سا جاتا۔

ایک روز شریف صاحب بولے۔ ”یار سراج! ایمان سے کہوں، تمہیں دیکھ کر مجھے رنگ آتا ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے لیکن بھر پور جوان لگتے ہو۔ کئی نظریں تمہیں دیکھ کر اب بھی خشک جاتی ہوں گی۔“

”پھر کیا کروں؟ جوانوں کی طرح عشق بازی کروں؟ اس عمر میں کیوں سچ چوراہے میں عزت چھٹاتا چاہتے ہو؟“

شریف صاحب نے ہنس کر کہا۔ ”میرا مطلب نہیں سمجھو۔ خدا تعالیٰ کیوں، تم پر ترس آتا ہے۔ ایک زندہ دل اور بھر پور بیوی سے محروم رہے ہو۔ میں بھابی کا دشمن نہیں مگر اپنے دوست سے ہمدردی ہے۔ تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

سراج الدین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”چھوڑ دو مگر یار! کیوں جذبات کی بھی راہ کریدتے ہو؟ اندر سے صرف لالچا صلی کا دھواں ہی نکلے گا۔ ہماری خواہشیں اور وہ خواب جو ہم یہاں بیٹھ کر دیکھتے ہیں، کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوں گے کیونکہ یہ ساج ہمیں بیوی بچوں والے کے طور پر جانتا ہے اور بیوی بچوں والا خواب تو دیکھ سکتا ہے مگر لوگوں کی جیبتی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔“

☆☆☆
اگلے دن کی بات ہے۔ سراج الدین آفس میں تھا۔ سامنے میز پر فائلوں کے اوپر اس کا موبائل پڑا تھا۔ اس کی

میں نے کہا کہ "میں"۔ دوسری طرف کسی نرم
 دھڑکنے کی آواز میں کسی نے پوچھا۔
 "آپ سراج الدین صاحب بول رہے ہیں؟"
 "جی ہاں، عرض کر رہا ہوں۔"
 "دیکھیے، میں آپ کی بیٹی مکمل کے اسکول سے بات
 کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہوا ہے۔
 بریک فم میں کھینچے ہوئے وہ بڑبڑوں سے گر پڑی ہے۔
 آپ پریزیاں آجائیں۔"
 سراج الدین کا دل دھک سے رو گیا۔ "آپ کون
 ہیں؟ میری بیٹی خیریت سے تو ہے نا؟" اس نے اضطرابی
 لہجے میں پوچھا۔
 "آپ پریشان نہ ہوں۔ اسے معمولی چوٹیں آئی
 ہیں۔ بازو میں کچھ زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہے۔ میں
 اسکول کی داکٹر پر بل ہوں۔ آپ جلدی آگئے ہیں نا؟"
 "میں اس میں ہوں۔ اسے اس کے گہری سانس لے کر بولا۔
 "میں اس میں ہوں۔ آج سے کچھ تک اسکول پہنچ جاؤں گا۔"
 رابطہ قطع کر کے اس نے اپنے اسسٹنٹ کو بلایا۔
 "مورسٹ، حال بتا کر ہدایت دی۔ اگر ڈاکٹر میسر صاحب
 پوچھیں تو جلدی جانے کی وجہ بتا دیتا۔"
 اسکول زیادہ قافلے پر نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے سے کم
 وقت میں وہاں پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی مکمل پر بل کے دفتر میں
 کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسکول کے میڈیکل سینٹر سے اسے ابتدائی
 طبی امداد دی گئی تھی۔ جس بازو میں زیادہ درد تھا اس میں
 فریکچر کا اندیشہ تھا۔ فوری طور پر کسی ڈاکٹر کو کھانا تھا۔ پر بل
 نے اسکول کی دین میں اپنا ہال لے جانے کی پیشکش کی۔
 جس کچھ نے داکٹر پر بل کے حوالے سے اسے فون
 کیا تھا وہ ہر ایک آگئی۔ بڑے پیار اور نرمی سے اس کی بیٹی کا
 ہاتھ پکڑ کر دیکھ لائی۔ درمیانی عمر کی ہر شمس خاتون
 تھیں۔ سچ چہرے سے سادگی، سنجیدگی اور شفقت کے تاثرات
 ساتھ ساتھ پوٹ رہے تھے۔ روئے سے بڑی امداد اور نرم
 مزاج تھی۔ سراج الدین کی نظریں اس کی بار غیر ارادی طور
 پر جھک کر بڑی نرمی سے اس کے چہرے پر مڑ لائی تھیں۔
 اندر وہ جو جذبہ ہونے کے ساتھ ہی بھرا آگیا ہوئے تھے، یہ اسی
 کا اثر تھا۔ اب نہ جانے یہ کیا لگھلائے والا تھا۔
 وہ اسکول کی دین میں اپنی بیٹی کو ہسپتال لے آیا۔
 فون کر کے بڑے بیٹے کمال کو بھی بلا لیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ
 کیا۔ انکسرنے کر دیا۔ اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ بیٹی کے بازو
 میں فریکچر ہوا تھا مگر یہ خوب ہوا کہ بڑی زیادہ متاثر نہیں ہوئی

تھی۔ ہلکی سی ضرب لگی تھی۔ پلاسٹر پچھڑھا کر معمولی دوا دے
 کر دو دن آرام کا بتا دیا اور ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔
 لگے دو دن سراج الدین نے آپس سے مکمل کے اسکول
 فون کیا۔ دوسری طرف مکمل جا رہی تھی مگر کسی کی آواز
 ابھری۔ یہ شاید اس کے دل کی فرمائش تھی کہ دوسری طرف
 وہی نرمی آواز تھی جس نے دل کی خواہش چکاوی کی۔
 سراج الدین بولا۔ "میں مکمل کا والد بول رہا ہوں۔
 اس کی میڈیکل رپورٹ آپ کو بتائی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے دو
 ہفتے آرام کی ہدایت کی ہے۔"
 وہ بولیں۔ "ہماری دعا ہے مکمل جلدی صحت یاب
 ہو جائے۔ آپ مکمل کی میڈیکل رپورٹ کی ایک کاپی کسی
 کے ہاتھ اسکول بھجوا دیں۔"
 بات ختم کر کے وہ گہری گہری سانس لینے لگا۔ دل
 سینے کے اندر دھک دھک دھکن مارنے لگا۔ کالوں میں
 اس کی آواز کی نرمی اب بھی گنگنا رہی تھی۔ اسے یہ سب اچھا
 بھی لگ رہا تھا۔ ایک پچھلا احساس بھی ہوک جگا رہا تھا۔
 اس نے گہری دیکھی۔ اسکول کی چوٹی میں ایک گھنٹہ
 باقی تھا۔ داکٹر پر بل نے مکمل کی میڈیکل رپورٹ جمع
 کرائے کا کہا تھا۔ اس نے بڑے بیٹے کمال کا نمبر بلایا۔
 ایک گھنٹہ بھی تھی، رابطہ کاٹ دیا۔ ایک دم دل میں سرگوشی
 ابھری۔ میڈیکل رپورٹ جمع کرائے وہ خود بھی تو جاسکا
 ہے۔ یہ محض سرگوشی نہیں تھی، سراج الدین کی خاموش زندگی
 میں جذبات کی پہلی سرگوشی بھی تھی۔
 اسی دم خانہ دل سے کوئی کراہتی ہوئی سی صدا
 ابھری۔ "سراج میاں! یہ کیا لگھلا رہے ہو؟ صحت بھلو تم
 ایک بھرے پڑے خاندان کے سربراہ ہو۔ تمہارے چار
 بچے ہیں۔ خواب دیکھنا الگ بات ہے، ان کا سرا پکڑ کر دور
 تک جانا دیا گیا ہے۔"
 اس نے اس احتجاجی آواز کو دبا دیا۔ "میں کیا غلط
 کر رہا ہوں؟ تھذیب کے دائرے میں اپنی بیٹی کی چوٹی
 کے لیے اس کی کچھ سے مل رہا ہوں۔ اس سے میرے دل
 کے صحرا آباد ہو رہے ہیں تو برا کیا ہے؟"
 اسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ خیالات کی سرخوشی اک
 ذرا کھینچی۔ اس کے بیٹے کمال نے فون کیا تھا۔
 "ابو! آپ کی مس کال آئی تھی، خیریت ہے نا؟"
 سراج الدین نے بات بنائی۔ "ہاں بیٹا! خیریت
 ہے۔ کسی اور کو فون کر رہا تھا، غلطی سے تمہارے نمبر پر آگئی
 دب گئی۔"

دل کی وہی تنہائی

وہ اپنے اسسٹنٹ کو بتا کر باہر آیا۔ میڈیکل رپورٹ
 کے ساتھ اسکول پہنچ گیا۔ دھڑکنے والی اور چٹکی آنکھوں کے
 سے مکمل کے آفس میں داخل ہوا۔ پر بل صاحبہ کے
 ساتھ پچھڑدیشی تھیں۔ مقصود نظر نہیں تھی۔ دو گھنٹوں کی
 باس کچھ پچھڑدیشی کے ساتھ میڈیکل رپورٹ منسلک کر کے
 فون کی درخواست کی اور بے کیف سے دل کے ساتھ خدا
 اس نے پر بل کو پیش کی اور بے کیف سے دل کے ساتھ خدا
 حافظہ کھینچ کر باہر نکلا۔ اسی وقت سامنے راہداری میں وہ دکھائی
 دیں۔ ایک سانس پچھڑدیشی کے ساتھ اسی طرف آ رہی تھیں۔
 سراج الدین کے دل میں صبح دم کی شبیہ ناز کی پھیل
 گئی۔ نظریاتی تھی مگر جو ان کی کسی بے باکی نہیں تھی اس
 لیے بے ہوش کو اس کے چہرے پر پڑی پھر جھک گئی۔ اسی اثنا
 میں وہ غریب آگئی تھیں۔
 سراج الدین کی جیسے مراد بر آئی۔ وہ پہچان کر کرک
 ہوئیں۔ سلام کر کے پوچھنے لگیں۔
 "آپ مکمل کے والد ہیں نا؟ اب اس کی صحت کیسی ہے؟"
 سراج الدین عمر کے جس مرحلے میں تھا، وہ احترام
 اور سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اندر دھڑام دھڑام کیسی سی
 دیواریں ٹوٹ رہی ہوں باہر سے خود کو سننا نا پڑتا ہے۔
 اس نے ہمت کر کے کہا۔ "جی ہاں، میں سراج الدین
 ہوں۔ مکمل کا ابو۔ اللہ کا رحم ہوا ہے۔ بازو میں ہلکا سا فریکچر
 ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے دو ہفتے پلاسٹر اتار دیں گے۔"
 وہ ہوردی سے بولیں۔ "میں مکمل کی کلاں کچھ بھی
 ہوں۔ جتنے دن وہ غیر حاضر رہے گی، میں کوشش کروں گی
 بعد میں اسے الگ سے پڑھاؤں۔ باقی کچھ ذمہ ایستخوانوں
 سے پہلے جو اسباق رو جائیں گے، وہ سارا پڑھا جائے گی۔"
 سراج الدین نے اس دل موہ لینے والے سچ چہرے
 پر نہایت حقیقت سے نگاہ ڈالی مگر مومنیت بھرے لہجے میں
 کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔ میں واقعی بہت فکرمند تھا۔
 احتیاطوں سے دو مہینے مکمل اپنے دونوں کے لیے اسکول سے غیر
 حاضر رہا اس کی احتیاطی کارکردگی کو بہت متاثر کر سکتا ہے۔"
 "آپ بے فکر ہیں سراج صاحب! مکمل میری کلاں
 کی ابھی اسٹوڈنٹس میں شامل ہے۔ اس کی طبیعتی کارکردگی
 زاب ہونے نہیں دوں گی۔ اگر اسکول میں کوئی کمی رہ گئی تو
 برے فکر میں آکر بھی اسے دور کر سکتی ہے۔"
 اسی وقت چوٹی کی گھنٹی سن سن بجنے لگی۔ سراج الدین
 کے کالوں میں بھی اس آخری بات سے نرم رو گھٹیاں سی جتنے
 لگے جیسے کوئی قافلہ کسی مسافروں کے بعد منزل آگیا ہوا ہو۔
 ☆☆☆

دو ہفتے گزر گئے۔ ڈاکٹروں نے دوبارہ معائنہ کر کے
 بیٹی کے بازو کا پلاسٹر اتار دیا۔ مزید چند دنوں کے لیے نرم
 مکمل بھرے اسکول کی ہدایت کی۔
 کے مطابق دفتر، مگر اور شریف صاحب کے جہل اسٹور میں
 آتا جاتا رہا۔ مصروفیات بدل میں گئی تھیں، محسوسات بدل
 گئے تھے۔ ایک سانولے چہرے کے مکمل دل سے اتر نہیں رہا
 تھا۔ دل کی کا یا مکمل سے وہ حیران بھی تھا، پریشان بھی۔
 وہ نہیں جانتا تھا مکمل کی وہ کچھ کون ہے؟ اس کا تو نام
 تک معلوم نہیں تھا۔ وہ بظاہر اس کی نظر آتی تھیں کہ اس کے
 جملہ حقوق کی اور کے نام لگے ہوں، اس کا امکان برابر
 برابر لگتا تھا۔
 دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں جذبے
 اگھیلیاں کرنے لگے۔ ایسے میں کسی کے آگے حال دل کہنا
 چاہتا تھا۔ گال رنگوں سے جسے اس چہرے کا گس پیانا خلیہ
 چمکا رہا تھا۔ بالآخر سراج الدین چمک پڑا۔ ایک شریف
 صاحب تھے جن سے قربت تھی اور بے تکلف محبت بھی۔
 سراج الدین نے اس کچھ سے ملاقات، اس کی نرم نرم گفتگو
 اور بے حد جاذب نظر چہرے کے بارے میں بتا دیا۔
 شریف صاحب خاموشی سے اس کی گفتگو سنتے رہے
 پھر ایک زندگی سے بھرپور قبضہ لگا کر بولے۔ "جیو میرے
 بادشاہ ہو! مردانہ دار زندگی گزارنے کی سوچ اب تم میں پیدا
 ہوئی ہے۔ اسی سے تمہاری زندگی باغ و بہار بھی ہوگی۔"
 وہ آہستہ سے بولا۔ "یار شریف! میں نہیں جانتا وہ
 کچھ یوں اچانک میرے لیے اتنی اہم کیوں ہوئی ہے مگر دل
 کی بات بتاؤں، وہ بہت اہم ہوئی ہے۔"
 شریف صاحب نے کہا۔ "میں تمہارا ایک شاعرانہ
 مزاج کا انسان۔ میں تو جذبے کی بات کروں گا اور تم جو کہ
 رہے ہو، اسے جذبہ کی زبان میں محبت کہتے ہیں۔ یہ کوئی
 تعجب کی بات نہیں۔ دل کی زمین پر یہ موسم تو بہن پوچھے اتر
 آتے ہیں۔"
 سراج الدین نے جہل اسٹور سے باہر دور آسمان
 کے ایک گوشے میں منڈلاتے بادل کے ٹکڑے پر نظریں جم
 دیں پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "پچیس سال بیوی نام
 کی ایک بے کیف اور بے رنگ عورت کی قید میں رہا ہوں۔
 ایسے میں اس قید سے ڈر کیا؟ مگر خوف اس بات کا ہے اسے
 پانے کی تمنا کروں تو لوگ مجھے مٹا دیں گے؟"
 "خیر، بعد کی بات بعد میں دیکھتے ہیں۔ ابھی ایک

کام کرو۔ تمہاری بہن بھی تو اسی گزر اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کے ذریعے معلومات حاصل کرو۔ وہ کون ہے؟

اس کا نام کیا ہے؟ میں کس حوالے سے اس کے بارے میں پوچھوں؟

”نام کا تو مجھے خود پتا نہیں۔ بس ایک حوالہ ہے۔ وہ اسکول کی واکس پر نہیں ہے۔“

شریف صاحب نے وعدہ کیا کہ اپنی بہن کے ذریعے اس بچہ کے کوائف معلوم کر لیں گے۔

دو دن بعد آواز آتا تھا۔ سراج الدین ابھی گھر سے نکلا نہیں تھا۔ شریف صاحب نے فون کیا اور فوراً جہل اسٹور پہنچنے کی تاکید کی۔ سراج الدین دھڑکتے دل کے ساتھ شریف صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

چھوٹے ہی بولا۔ ”یار! کوئی اچھی خبر ہے تو فوراً سناؤ۔ میں سخت بے چین ہوں۔“

انہوں نے دیکھی لمحے میں کہا۔ ”بھائی سراج! مجھے افسوس ہے، تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں۔ وہ بچہ شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بچے بھی ہیں۔“

سراج الدین نے سچائی سے ایک ٹک انہیں دیکھتا رہا۔ چہرے پر یوں گہری کھجکھجائی تھی جیسے پتھر آکر لگا ہو پھر ایک ماہوس کن ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”اپنی قسمت ہی خراب ہے یا! اتنے برسوں کے بعد یہ دل دھڑکنے کی لذت سے آشنا ہوا تھا۔ ان آنکھوں کے آئینے میں کسی کی صورت چمکنے لگی تھی۔ افسوس، یہ محض سہرا تھا۔“

”میرے دوست! اس دس میں عورتوں کا کال نہیں پڑا ہے۔ ایک چھوڑا اور بیٹھی گی۔ بس تم دل زندہ رکھو۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں ایسا ممکن ہے۔“

شریف صاحب کا ایک زور زور سے ہنسنے لگے پھر ان کے ہنسنوں پر دھبے سے ہاتھ دارتے ہوئے بولے۔ ”لگا ہے میرا یا بہت تنجید ہے اس بچہ کے لیے۔ کوئی خوشیاں مناؤ۔ میری بات آدھی درست تھی۔ وہ شادی شدہ تو ہے مگر اس کا شوہر اور بچے موجود نہیں۔“

سراج الدین ناچھی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ شریف صاحب نے بات جاری رکھی۔ ”میں مذاق کر رہا تھا۔ میری بہن کی معلومات کے مطابق اس کا نام جیلہ ہے۔ تیس تیس سال اس کی عمر ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر دو بستیوں چھوڑ کر شاداب پور کا جملہ ہے وہاں

کے ستاروں کے خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ پانچ سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کا خاندان عرب امارات میں رہتا تھا۔ شادی کے تین سال بعد ہی اسے طلاق دے دی گئی۔ کیوں دی گئی؟ یہ میری بہن کو معلوم نہیں۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں۔“

سراج الدین کو یوں لگا جیسے اجڑے دل پر ایک دم ہزاروں گلاب گل اٹھے ہوں۔ اچھی چہرے پر اس نے وہ باتوں کے جس گھور اندھیرے میں گھر گیا تھا اب ایک بیک سہ شاعر روشن ہو گئے تھے۔

شریف صاحب بولے۔ ”سراج الدین میرے دوست! کہتے ہیں نایت صاف تو منزل آسمان۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ کیا حسن اتفاق ہے کہ پہلی بار جس لڑکی سے محبت ہوئے تھی وہ شادی شدہ ہو کر بھی کسی مرد کی قید سے آزاد ہے۔ دوسرے محنتوں میں تمہارے جیسے شادی شدہ مرد کے لیے اس کا حصول اتنا مشکل بھی نہیں۔ میں تو کہتا ہوں اس کی ازدواجی زندگی کا لٹکا انجام سے دوچار ہونا تمہارا اس سے ملنا اس سے متاثر ہونا۔۔۔۔۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ میں اک ذرا کوشش سے تم دونوں کے راستے آگے جا کر مل سکتے ہیں۔“

سراج الدین بڑی دیر آنکھیں بند کر کے خاموش بیٹھا رہا۔ ہزاروں اندیشوں میں ایک بے رنگ زندگی میں اس بچہ جیلہ جیسی گلاب رنگ خاتون کی قربت کے دلوں لگی تھی۔ شریف صاحب کی محفل سے اٹھ کر گھر آتے ہوئے دماغ نے احتجاج کیا۔ ”سراج میاں! تم کیا چاہتے ہو؟ چار بچوں اور بیوی کی موجودگی میں ایک جوان عورت کے خواب دیکھنے لگے ہو۔ ایسا دیوانہ کیسی شیک نہیں، باز آ جاؤ۔“

دل سے وقافی آواز بلند ہوئی۔ ”مذہب اور اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی کو شریک حیات بنانا کس قانون کے تحت جرم ہے؟ ویسے بھی میں نے ابھی شادی کا فیصلہ تو نہیں کیا ہے۔ ایسا ہوا بھی تو اپنی بیوی اور بچوں سے بھرپور انصاف کروں گا۔“

عجیب بات ہے۔ عورت جتنی بھی حسین ہو، بہت کم مرد ایسے ہوں گے جو ایک ہی عورت کے کھونٹے سے بندھے رہ سکیں۔ ری تروانے کی ہمت یا یونٹ نہ بھی آئے تب بھی دوسری عورت کی خواہش دل میں مچھلی رہتی ہے۔

گزر اسکول کی بچہ جیلہ کو دیکھنے اور پھر اس کے حالات زندگی جاننے کے بعد سراج الدین بھی اب تنجید خاتون کے کھونٹے سے آزاد ہونے کی تنجید نیت

بھی ہوئی۔ ”مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے سراج صاحب! ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں مگر امتحانوں کے لیے اسے کم دن رہ گئے ہیں کہ محض کل کے لیے الگ سے کلاس لینے کی گنجائش نہیں۔ آپ گھر میں لگی کھانا پیخت کر دائیں۔“

آٹھویں کلاس کی بچی کو گھر پر اس کے سارے بچے ہمارکتے تھے مگر بات مکمل کی پڑھائی کی نہیں تھی، بس جیلہ

کر بیٹھے تھے۔

☆☆☆

سراج الدین کو بچہ جیلہ سے ملنے کا پھر موقع مل گیا۔ اسکول انتظامیہ نے امتحانوں سے قبل والدین سے ملنے کے لیے کال کیا تھا۔ سب بچوں کے گھروں میں جتنی بھی کمی۔ پہلے ہی ایسا ہوتا تو بڑے بچے کمال کو بھیج دیتا تھا۔ اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دس بجے آفس سے چھٹی کر کے وہ بیٹی کے اسکول پہنچ گئے۔ وہاں بڑے سے ہال میں مشہور والدین موجود تھے۔ وہ بھی سامنے کی قطار میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مکمل باپ کو دیکھ کر پاس آگئی۔

ایک آدھ بار وہ ٹیچر بھی بس ذرا سی دیر کے لیے نظر آئی تھی۔ سراج الدین کی نشست سامنے کی قطار میں کچھ آگے ڈاؤن پر تھی کہ وہ پورے ہال کو گھوم دیکھ سکتا تھا۔ خواہ مخواہ کی نشستیں علیحدہ تھیں۔ سرگھما کے اس طرف دیکھتے رہتا بھی معیوب بات تھی اس لیے وہ جی بھر کے دل کی تسکین سے غورم تھا۔ اسی وقت دل کی مراد جیسے پوری ہوئی۔ کوئی صورت نظر آنے کی امید برآئی۔ پر بھل صاحب نے بھی

چوڑی نظر کر کے بعد یہ اعلان کیا کہ والدین چاہیں تو بچوں کی مختلف تنجید سے ملاقات کر کے ان کی کسی کارکردگی کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

سراج الدین اندر سے لہر اٹھا۔ گل رنگ جذبات کی تابی میں بیٹی کی انگلی پکڑ کر بچہ جیلہ کے سامنے پہنچ گیا۔ پورے دو ہفتے بعد وہ سامنے آئی۔ آنکھوں میں شامسائی بھی تھی۔ چہرے پر نرمی بھی۔۔۔۔۔ اسے غم کے والد کے طور پر پہچان لیا تو سراج الدین کو لگا جیسے ست رنگی چوڑیاں سامتوں میں ٹھکنائی ہوں۔

اس نے ہنکھار کر گلا صاف کیا پھر کہا۔ ”مس جیلہ! میں مکمل کے حوالے سے بہت فکر مند ہوں۔ اس کے بہت سے اسباب ابھی رہتے ہیں۔ کیا یہ اچھے طریقے سے امتحان دے سکے گی؟“

وہ بولی۔ ”مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے سراج صاحب! ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں مگر امتحانوں کے لیے اسے کم دن رہ گئے ہیں کہ محض کل کے لیے الگ سے کلاس لینے کی گنجائش نہیں۔ آپ گھر میں لگی کھانا پیخت کر دائیں۔“

آٹھویں کلاس کی بچی کو گھر پر اس کے سارے بچے ہمارکتے تھے مگر بات مکمل کی پڑھائی کی نہیں تھی، بس جیلہ

دل کی دوس تہائی

تک رسائی کی بھی تھی۔ اس لیے کہا۔ ”میرے باپ نے ویسے تو اچھے پڑھے لکھے ہیں مگر کل گھر کے ماحول میں سبق سے نہیں پڑھتا۔ کوئی ٹیچر بھی اسے دھک سے پڑھاتا ہے۔ آپ کو بارہوا چند دن قبل آپ نے اسے اپنے گھر میں پڑھانے کی پیشکش کی تھی کیا اس پر عمل کیا ہے؟“

”میرے پاس گھر میں بہت سی لڑکیاں پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔ آپ کو لگتا ہے جاتے ہیں رضویا نہ تو مجھے بھی کوئی مجھرتی نہیں۔“

دل اندر دھماکا کرنے لگا۔ شوخ جذبے اچھل کود کر رہے تھے۔ انہوں نے کسی جان سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مس جیلہ نے اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ شام پانچ بجے مکمل کو ان کی ہدایت کی۔ دو جہان بندوں کی خوشی فضا میں بھینکائی گئی کوئے لکھ کر گیا۔

☆☆☆

مس جیلہ نے اپنے گھر کا جیسا لکھا تھا وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل آدھے گھنٹے سے کم دت لگ سکتا تھا مگر اس کی بیٹی ابھی ابھی محبت باب ہوئی تھی۔ اتنا قافلہ پیدل لے کر آنے سے اسے تکلیف ہو سکتی تھی اس لیے سراج الدین نے محلے کے ایک گھر والے سے تحریر وقت پر لانے لے جانے کی بات کی۔

عورت بڑی محاساں ہوتی ہے۔ شوہر کی فکر اور چہرے کے تیر میں بہت کچھ پڑھ سکتی ہے۔ تنجید خاتون بھی اپنے شوہر کو بڑے دنوں سے پڑھ رہی تھی۔

چھوٹی بیٹی مکمل نے جب بتایا کہ اسے مس جیلہ کے پاس بیٹھنے کی بات کی ہے تب تنجید خاتون نے گریڈ کرید کر مس جیلہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ مکمل نا بوجھ تھی۔ اسے ماں کی باتوں میں رقابت کا اور اک نہیں تھا۔ اس نے جی بھر کر مس جیلہ کی تعریف کی۔ وہ خوش محفل تھی، خوش لباس تھی، ابو سے اسکول میں کی دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اور ابو کے کہنے پر بیٹھ پڑھانے کے لیے بلایا تھا۔

اب شام کے وقت سراج الدین جیلہ دست کر کے بیٹی کو لے کر گھر سے روانہ ہونے لگا تو تنجید خاتون کلک گئی۔ بیار گزیہ دل و دماغ میں دوسوں کی آنکھیں چلنے لگیں۔ اس کے اندر کی عورت نے اک ذرا مزاحمت دکھائی۔

”بیٹے! آپ کمال یا جمال کے ساتھ کیوں نہیں بھیج دیتے؟ ابھی دفتر سے آئے ہیں، تھک گئے ہیں۔“

سراج الدین ٹھک گیا۔ دل میں چڑ تھا۔ چوری چوری بیوی کی طرف دیکھنے لگا سوچے لگا لیں اسے شک تو

نہیں ہو گیا؟ دوسرے نے اس خیال کو جھک دیا۔ رسالت سے کہا۔ ”جمل کی ٹیچر سے میں نے ہی بات کی تھی۔ آج پہلے دن خود جاؤں گا۔ نئی کو جو سے پڑھانے کی اس ٹیچر سے درخواست کروں گا۔ تم نہیں جانتی ہو کہ کل انہی ٹیچروں سے پاس ہوئے۔“

کہہ کر اس کا جواب سنے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ محلے کے اس عیسوی والے کے ساتھ نئی کو لے کر سب جیلہ کے گھر پہنچ گیا۔ مکان تلاش کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ بڑی سڑک سے اندر ایک کٹھاؤ کی میں اس کا مکان تھا۔ حوصلہ بچنے کے عام گھروں کی طرح وہ ایک منزلہ کا بڑا مکان تھا۔

ٹیچر نے سراج الدین اور محل کو دیکھ کر مسرت..... کا اظہار کیا۔ امیدوار دلا یا کہ نئی کو بھرپور توجہ سے امتحان کی تیاری کرائے گی۔ سراج الدین کے دل میں آیا کہہ دے۔ ”محض نئی کو نہیں، اسے بھی توجہ کی تمنا ہے۔“

گھر وہ ایسا سوچ ہی سا۔ زبان سے کہا۔ ”آپ نے مجھے بابوی سے نکالا ہے، اب میری نئی آپ کے سپرد ہے۔ حادثے سے اس کی تعلیم میں جو کمی رہی ہے اسے دور کرنا چاہیے گی۔“

وہ بولیں۔ ”مجھے خوشی ہے آپ اپنی نئی پر بھرپور توجہ دیتے ہیں ورنہ اس پورے علاقے میں اکثر لوگ لوگوں کی تعلیم کے لیے ہی فکرمند ہوتے ہیں، بیٹیوں کے لیے نہیں۔“

سراج الدین نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی طرح مہربان ٹیچر ہوں تو ان بچیوں کے لیے بھی آگے بڑھنے کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔“

وہ نئی کو وہاں چھوڑ کر شریف صاحب کے جزل اسٹور پر آیا۔ عیسوی والے کو مفردہ وقت پر نئی کو واپس لانے کی تاکید کر کے جزل اسٹور میں داخل ہوا۔ حسن اتفاق سے شریف صاحب اکیلے تھے۔ سراج الدین کے چہرے پر ملاقات کی مسرت ابھی تک گھٹی ہوئی تھی۔

شریف صاحب بولے۔ ”چہرے پر خوشیوں کا سلاب اٹھا ہوا ہے۔ لگتا ہے اس ٹیچر سے لڑ کر ہے ہو؟“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”یاد شریف! تم تو عزم راز ہو، حراج شناس بھی ہو۔ میں کئی برسوں سے محاذ کی میاں سے تڑپ رہا تھا۔ ٹیچر جیلہ نے تو یہ پیاس بجڑا دی ہے۔ اب تم ہی مجھے سمندر کا راستہ دکھائے ہو۔“

پلیز اچھے دوپٹے نہ دینا۔“

شریف صاحب اس کی بات سن کر کچھ لمحے خاموش ہوئے مگر کئی سوچی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے رہے مگر کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ ٹیچر جیلہ کی شفقت اور قابلیت کی بڑی تعریفیں کرتی۔ سراج الدین دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی تعریفیں سن کر اسے پانے کی تمنا میں بے قرار ہوتا رہتا۔

☆☆☆

سالانہ امتحان شروع ہونے والے تھے۔ رگڑ ہائی اسکول میں اب پڑھائی بند ہو چکی تھی۔ امتحان کی تیاری کے لیے لوگوں کو چھٹی دی گئی تھی۔ محل اور چوری پڑھائی مکمل کرنے کے لیے ٹیچر جیلہ کے پاس جاتی تھی۔ امتحانوں سے دو دن پہلے سراج الدین کے دل نے ٹیچر جیلہ سے ملنے کا حوصلہ کیا۔ اندر سے اٹھنے والی خوشی آوازوں کو دبا دیا۔

مداخلت کسی کو ہو نہ ہو، اس کی بیوی کو خشک ہوسکا تھا اس لیے عیسوی والے کو فون کر کے اسے بھجایا کہ وہ شریف صاحب کے جزل اسٹور میں انتظار کرے گا۔ ٹیچر سے نئی کو لے کر وہاں آئے۔ اسے بھی ساتھ لے جائے۔ شریف صاحب سے مشورہ کر کے اس نے بازار سے مٹھائی کا بڑا سا ڈبا بھی لے لیا۔

ٹیچر جیلہ کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سنجیدہ سی مسکراہٹ اور انیت تھی۔ مٹھائی انہیں دیتے ہوئے بولا۔ ”میں جیلہ! کچھ دن پہلے تک میں سخت فکرمند تھا۔ میری بیٹی انگلش اور حساب میں بہت کمزور تھی۔ جب سے آپ کے پاس ٹیوشن پڑھ رہی ہے، ان دونوں مضامین میں بہت بہتری پیدا ہوئی ہے۔ یہ مٹھائی آپ کے خلوص اور محنت کا ایک عاجزانہ صلہ ہے۔“

وہ خوش دلی سے بولیں۔ ”آپ شرمندہ کر رہے ہیں سراج صاحب! آپ کی بیٹی بہت ذہین اور متحرک ہے۔ اسے سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی۔ ان شاء اللہ امتحانوں میں اس کی کارکردگی بہتر ہوگی۔“

ابھی ایسا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا کہ دل پر دستک دینے والی کوئی نرم گرم گفتگو کر لیتا۔ وقت اور مقام بھی مناسب نہیں تھا۔ گلی میں گھڑے کھڑے اس کے ٹیوشن سینٹر کے باہر وہ اس وقت بات کر رہا تھا اس لیے محض انسانی گفتگو ہی ممکن تھی۔ جذباتی گفتگو کے لیے مٹھائی کے ڈبے کوڑنے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

فہر موجودگی میں پڑھائی کے بہانے جیلہ کے بارے میں بھی پوچھ لیتا۔ وہ کیسا پڑھائی ہے، اس کا حراج کیا ہے، کتنی کو باں کی رقابت کی طرح باپ کی محبت کا بھی مل نہیں تھا۔ وہ ٹیچر جیلہ کی شفقت اور قابلیت کی بڑی تعریفیں کرتی۔ سراج الدین دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی تعریفیں سن کر اسے پانے کی تمنا میں بے قرار ہوتا رہتا۔

☆☆☆

سالانہ امتحان شروع ہونے والے تھے۔ رگڑ ہائی اسکول میں اب پڑھائی بند ہو چکی تھی۔ امتحان کی تیاری کے لیے لوگوں کو چھٹی دی گئی تھی۔ محل اور چوری پڑھائی مکمل کرنے کے لیے ٹیچر جیلہ کے پاس جاتی تھی۔ امتحانوں سے دو دن پہلے سراج الدین کے دل نے ٹیچر جیلہ سے ملنے کا حوصلہ کیا۔ اندر سے اٹھنے والی خوشی آوازوں کو دبا دیا۔

مداخلت کسی کو ہو نہ ہو، اس کی بیوی کو خشک ہوسکا تھا اس لیے عیسوی والے کو فون کر کے اسے بھجایا کہ وہ شریف صاحب کے جزل اسٹور میں انتظار کرے گا۔ ٹیچر سے نئی کو لے کر وہاں آئے۔ اسے بھی ساتھ لے جائے۔ شریف صاحب سے مشورہ کر کے اس نے بازار سے مٹھائی کا بڑا سا ڈبا بھی لے لیا۔

ٹیچر جیلہ کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سنجیدہ سی مسکراہٹ اور انیت تھی۔ مٹھائی انہیں دیتے ہوئے بولا۔ ”میں جیلہ! کچھ دن پہلے تک میں سخت فکرمند تھا۔ میری بیٹی انگلش اور حساب میں بہت کمزور تھی۔ جب سے آپ کے پاس ٹیوشن پڑھ رہی ہے، ان دونوں مضامین میں بہت بہتری پیدا ہوئی ہے۔ یہ مٹھائی آپ کے خلوص اور محنت کا ایک عاجزانہ صلہ ہے۔“

وہ خوش دلی سے بولیں۔ ”آپ شرمندہ کر رہے ہیں سراج صاحب! آپ کی بیٹی بہت ذہین اور متحرک ہے۔ اسے سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی۔ ان شاء اللہ امتحانوں میں اس کی کارکردگی بہتر ہوگی۔“

ابھی ایسا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا کہ دل پر دستک دینے والی کوئی نرم گرم گفتگو کر لیتا۔ وقت اور مقام بھی مناسب نہیں تھا۔ گلی میں گھڑے کھڑے اس کے ٹیوشن سینٹر کے باہر وہ اس وقت بات کر رہا تھا اس لیے محض انسانی گفتگو ہی ممکن تھی۔ جذباتی گفتگو کے لیے مٹھائی کے ڈبے کوڑنے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

سنجیدہ مٹیوں سے دیکھ رہی تھی، اس کا شوہر بہت بدل گیا تھا۔ اپنے لباس اور طے پر خوب خوب توجہ دیتے تھے۔ خوراک بھی بدل گئی تھی۔ پہلے گھر والوں کے ساتھ ہی کھاتا پڑتا تھا اب اپنے لیے خصوصی اجناس سے کھانا پکاتا۔ اچھا لباس اور خدائیت سے مبرور رکھانے لگا کہ کچھ ہی عرصے میں وہ اپنی عمر سے دس سال کم لگنے لگا تھا۔ اس پر مستزاد خوش شکل بھی تھا۔ آگ ذرا علیہ دست کر کے، عمدہ لباس پہن کر گلی سے گزرتا تھا تو کسی ایک جہان رنگ سے اسے دیکھتے رہ جاتے۔ متحدہ نسوانی آنکھیں اس کی طرف اٹھنے لگ جاتیں۔

سنجیدہ شوہر کی اس بہت کڑائی پر خوش کیا ہوئی، انکا اس کا دل ہول کھا رہا تھا۔ اپنے تیار جسم کی بیوی کا احساس اسے اندر سے کچھ کے لگا رہا تھا۔ بہت دن ہوئے تھے، شوہر پاس بھی نہیں آتا تھا۔ آغوش سے آنے کے بعد کمرے سے نکل جاتا اور رات گئے لوٹتا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں ہی بیٹیاں کھانا پکھا دیتیں۔ کھانا کھا کر لی دی دیکھ کر یا بھرگوئی کتاب پڑھ کر سو جاتا۔ سنجیدہ دوسرے کمرے میں بیٹیوں کے ساتھ سو جاتی۔ آگ الگ کمرے میں سوتے ہوئے توجہ ہوتی تھی مگر پچھلے چند مہینوں سے اس کا رویہ بھی بہت بدل گیا تھا۔ آنکھوں میں بے مہربانی باتوں میں بے توقیرگی تھی اور حراج میں بے اعتنائی صاف دکھائی دیتی تھی۔ پہلے تو کسی کی ریت اس کے پاس بیٹھ کر دو چار باتیں بھی کر لیتا تھا۔ اب کئی کئی دنوں تک سیدھے منہ بات کرنے سے بھی گھبراتا تھا۔

اکا دوران مکمل ٹیوشن پڑھنے جانے لگی پھر اس کی زبانی جو سنا، اس نے بھی بدگمانیوں کی آغوش تیز کر دی۔ معدے کی تکلیف کی وجہ سے نکلنے والی ہانپنے والے میں اب دل کے روگ سے نکلنے والی عسٹری گھٹی آج بھی شامل ہو گئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ بیمار اور کمزور نظر آنے لگی۔

دوسری طرف سراج الدین کی آنکھوں میں اب دکھ خواب اتر آئے تھے۔ پرکھ موموں کی سمور کن ہوا میں چلنے لگی تھیں۔ ایسے میں سنجیدہ سے فاصلے مزید بڑھنے لگے۔

☆☆☆

اسکول میں سالانہ امتحان شروع ہوئے۔ جیلہ نے سب بچیوں کو ٹیوشن سے بھی فارغ کر دیا۔ انہیں ہدایت کی کہ اب امتحانات کی ڈیٹ شیٹ کے مطابق خود ہی تیاری کر لیں پھر کسی کسی مضمون میں دشواری محسوس ہو تو آجائیں۔ مکمل بہت ذہین تھی۔ چرٹ کی وجہ سے پڑھائی میں

جور کاوت پیدا ہوئی تھی اسے اپنی موت اور جیل کی توجہ سے دور کیا تھا۔ وہ استھان میں خود ہی پڑھ کر پڑھ کر سیکھتی تھی لیکن سراج الدین کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ تو یوں کاراست پکڑ کے دل کی منزل تک پہنچا جاتا تھا اسے ایک بہانہ سوچا۔ رات کو بیٹا سے رپاشی کے کچھ سوال پوچھے۔ کتاب کی مشقوں میں سے کچھ مل کر کے دکھانے کو کہا۔ بیٹے نے ایک آدھ سوال قلم لکھا۔ بس پھر کیا تھا، انہوں نے ایک دم فیصلہ سنا دیا۔

”ابھی تم حساب کے معنوں میں کمزور ہو۔ پرسوں اس کا پرچہ ہے۔ اس سے پہلے کل مس جیلہ کے پاس جا کر یہ کمزوری دور کروالو۔“

بڑی بے خبر بولی۔ ”ابوایہ بہت آسان مشقیں ہیں۔ میں بھی سمجھا سکتی ہوں۔ وقت میں آپ کو تکلف ہوگی۔“ ان کے پاس گھڑا گھڑا جواب تیار تھا۔ ”تمہارے پاس وقت کہاں ہے؟ اپنی کتابیں پڑھنے کا موقع نہیں، کالج سے آکر کمرے کا کام کاج میں لگ جاتی ہو۔ تمہاری ماں تو بس بستر پر ہی پڑی رہتی ہے۔“

سجدہ کے تن بدن میں آگ سی لگی تھی۔ بھرائے ہوئے بچے میں بولی۔ ”میرا بستر پر پڑے رہتا آپ کو بُرا لگتا ہے۔ خود ساز ہر لادیں۔ کھا کر مر جاؤں گی تو سب کی جان چھوٹے گی۔“

وہ کیلے بچے میں بولا۔ ”بس بس، زیادہ موت کا وظیفہ مت پوچھو۔ میں نے بستر پر پڑے رہنے کی بات کی ہے۔ کیا ظلم لکھا ہے؟ کچھ مگرے بارے میں لکھو۔ اک ذرا جہاں قادی کرو۔ ہاتھ کی مشین کو ٹھوڑی حرکت دو، لباس اور طے پر توجہ دو۔ خود کو آئیے میں دیکھوں، اپنی بیٹیوں کی دادی لگتی ہو۔“

وہ ایک دم پش پش کر کے رونے لگی۔ ”اس سوئی پیاری نے میرا حال کر دیا ہے۔ کچھ کھاتی ہوں تو معدہ پکڑ کر پھینک جاتی ہوں۔ دو قدم زیادہ چلتی ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ٹانگیں کا پٹنے لگتی ہیں۔ اس پر آپ کی مٹی کی باتیں اور طے رہی سہی کسر نکال دیتے ہیں۔ خود تو صحت مند ہیں۔ جوانوں کی طرح بن سمن کے رہتے ہیں۔ اب مجھ سے جی بھر گیا ہے اس لیے دادی اماں لگتی ہوں۔ شاید کھانیم کو تلاش کر رہے ہیں۔“

سجدہ خاتون کے دکھنے طویل تھے۔ پرسوں نے وہ یہ رونا دہائی دہی تھی۔ اس کے بچے اور سراج الدین بھی ایک بائوں کے عادی تھے اس لیے مسکرا کر ٹال جاتے تھے۔ اس وقت بھی بیٹیاں ہنس پڑی تھیں مگر سراج الدین کا

دل دھک سے رو گیا۔ دل بے ایمان ہوا تھا اس لیے یہ عام سی بات بھی شدت سے لگی تھی۔ کیا اس نے جان لیا ہے شہر کی آنکھوں میں کوئی اور صورت جسم صورت بنی سوچو؟ اس کے دل میں زندگی سے بھرپور کوئی صورت اتر آئی ہے؟ اس نے دو دیرہ نظروں سے دیکھا۔ سجدہ چادر کے پلو میں منہ چھپائے آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ سراج الدین کے دل نے کہا۔ ”چھپا ہے سجدہ خاتون جان لے۔ آج نہیں تو کل اسے معلوم ہونے والا ہے۔“

اسی وقت دباؤ نے ٹوکا۔ ”بیوی بچاری کمزور ہے، بے بس ہے۔ تمہارے دباؤ میں اسکتی ہے۔ تمہارے بیٹے جو ان ہیں۔ بڑی بیٹی بھی شادی کے قابل ہوئی ہے کیا انہیں قبول ہوگا؟“

ہمت کے پر ٹوٹ سے گئے۔ وہ اک ذرا گڑبڑا گیا پھر دل نے لہرا کر اپنی بات کی۔ ”اپنی بھرپور جوانی کے بچیں سالوں کو ان کے لیے قربان کیا ہے۔ انہیں اچھا کھلایا ہے، اچھا پہنایا ہے۔ اس پاس کے اکثر گھروں کے لڑکے لڑکیوں سے ان کا طرز زندگی بہتر ہے۔ آئندہ بھی انہیں کسی بھڑکی کا سامنا نہیں ہونے دوں گا۔ ایسے میں میرے جذبات کی کوئی قدر نہیں ہے کیا؟ میری زندگی میں ایک بھر رورورت کی کمی رہی ہے۔ اب اسے دور کرنے کی خواہش جاگی ہے تو اس کی کچھ اہمیت نہیں ہے؟“

اس وقت جذبات حاوی تھے۔ دماغ کے ہر دار کا جواب موجود تھا مگر طبیعت مکدر ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر پوئل قدموں سے اپنی خواب گاہ میں آگیا۔ دل و دماغ کی جنگ ایسی تھی کہ بیڈ پر ہم دروازہ ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ بڑی بیٹی شرمندہ گرم کر کے لے آئی۔ وہ ہر رات گائے کے شم گرم دودھ میں شہد ڈال کر پیتا تھا۔ گرم دودھ پی کر جب جذبات دہی آگ میں سٹکے گئے تو وہ اٹھ بیٹھ۔ سائڈ ٹیبل پر ٹوٹ پینڈ پڑا ہوا تھا۔ قلم لے کر بہت سوچ سوچ کر اس پر لکھنے لگا۔

”جیلہ صاحبہ! میں نہیں جانتا یہ سطور پڑھ کر آپ میرے بارے میں کیا سوچیں گی لیکن ایک بات جانتا ہوں۔ آپ کو بہت اہمیت دے کر یہ سب لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے میری باتیں آپ کو پسند نہ آئیں۔ بس ایک اچھا ہے، اس بنیاد پر آپ مجھے ادبش اور بد فطرت نہ سمجھیں۔“ جیلہ صاحبہ! آپ قسمت پر یقین رکھتی ہیں؟ میں بھی رکھتا ہوں۔ میں پچیس سال ایک بیاری بیوی کی زنجیر سے بندھا رہا ہوں۔ ایک بے کیف اور بے رنگ زندگی۔ اسے قسمت

کا لکھا ہے کہ برداشت کرتا رہا ہوں۔ پھر آپ سے ملاقات ہوئی۔ پائی، دوسری۔ پھر کئی بار۔ جب جب آپ سے ملا اور آپ کی زندگی میں قسمت کے پھیر کا نام ہوا، میری بچیوں سالہ ازدواجی زنجیر کی زاریاں کمزور پڑنے لگیں۔

”میں آپ کے بارے میں تصور سا جانتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم آپ جیسے بیٹا خاتون کی ازدواجی زندگی اس طرح متاثر کیوں ہوئی ہے؟ اسے کسی قسمت کے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی سے مجھے اپنی قسمت آزمانے کی ہمت ہوئی ہے۔ ہم دونوں کئی بار ملے ہیں۔ میں کسی خوش فہمی کے بغیر کہتا ہوں۔ یار دوست مجھے اب بھی جوان سمجھتے ہیں۔ میں نہیں جانتا آپ مجھے کیسا سمجھتی ہیں؟ شاید آپ نے مجھے بھی ایسی نظروں سے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ اسکی نیت سے میرے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا مگر آج میری یہ جنابت مان لیں گی؟ میری یہ تحریر پڑھ کر میرے بارے میں سوچ لیں گی؟ ایک پچاس سالہ شادی شدہ مرد کے جذبات کی یہ سستا فنی اک ذرا محفل سے سیس کی؟

”آج بیٹی کو حساب کے پرچے کی تیاری کے بہانے سے آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ اصل مقصد یہ تحریر آپ تک پہنچانا تھی۔ آج کے بعد شاید ملاقات کا موقع بدل سکے اس لیے آج یہ جرات اظہار کی ہے۔ میرے ان محسوسات کو پڑھ کر اگر آپ کو مجھ سے نفرت نہ ہوئی تب میرے موبائل نمبر پر بس ایک پیغام بھیج دیں۔ ایک پیغام تک آپ کا پیغام نہ ملا تو مجھ جاؤں گا آپ نے میرے نمبر کی طرح مجھے بھی زندگی کی ڈائری سے ڈیلیٹ کر دیا ہے۔“

سراج الدین نے تحریر کے آخر میں اپنا موبائل نمبر لکھا۔ اسے ایک بار پھر پڑھا اور پھر اسے ٹوٹ پیٹ سے جاز کر کے کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ لائٹ بند کر کے خوش کن ساعتوں اور خوشبودار محبتوں کے تصور میں بھینکا بڑی دیر بعد سو گیا۔

اگلے دن شام کے وقت بیٹی کو ساتھ لے کر پھر جیلہ کے گھر پہنچی گیا اور اس سے درخواست کی۔ ”کل کو حساب کی کچھ مشقیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ کل امتحانی پرچے سے پہلے ان کی تیاری کرادیں۔“

مس جیلہ نے خوش دلی سے مان لیا۔ سراج الدین نے ہمت سے کام لیا۔ جتنے دن ٹیوٹن پڑھا لی تھی اس کی فہم اور رات کو سٹکے اربانوں کی جو کچھ لکھی تھی اسے بھی ایک لٹا نے میں ڈال کر پھر جیلہ کو پیش کیا۔ پھر جیلہ سب سے ٹیوٹن فہم لیتی تھی اس لیے یہ کوئی

محبوبیات نہیں تھی۔ اصل بات فہم کے ساتھ لپیٹ کر چمکا کر کی۔ لٹا نے میں ہے ہوں گے جیلہ سمجھ گئی تھی۔ دل کے کھٹے ہوں گے، یہ بات لٹا کر کھولنے کے بعد ہی جان سکتی تھی۔

سراج الدین کی ہمت نہیں ہو رہی تھی زیادہ دیر وہاں کھڑا رہے۔ اندر کی آگ لٹا نے میں چل کی تھی۔ کھولنے پر بھوک بھوک مٹی مٹی تھی۔ وہ اس کی پیشکش محسوس کرنے سے گل ہی کھٹکنا چاہتا تھا۔

اس نے پھر جیلہ کا گھر یہ ادا کیا۔ بس ایک راحت کے لیے نظر پھر کر اسے دیکھا۔ وہاں سے جیسی میں بچہ کر سیدھے شریف صاحب کی محبت گل رنگ میں آگیا۔ آج اس کے پاس کہنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔

رات کی ٹوٹے دل کی طرح افسردہ تھی، دیران جنگلوں کی کھیل کی طرح خاموش تھی۔ آسانی بستیوں کی محبت کے دامن میں نہ چھپا کر سوتی پڑی تھی۔ بڑی ہڑک پر سے کوئی گاڑی تیزی سے گزر جاتی تو یہ خاموشی اک ذرا ٹوٹ جاتی۔ ایسے میں اس بستی کی بڑی ہڑک کے اندر گلی میں ایک کمرے میں ابھی رات جاگ رہی تھی۔

مس جیلہ رات کے ایسے وقت کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی ستاروں کی خاموش رو گزر میں اپنی قسمت تلاش کرتے ہوئے بے گل ہو رہی تھی۔ وہ تو مٹی نہیں تھی۔ ابھی پڑھی لکھی اور پختہ فکر عورت تھی پختہ ازدواجی زندگی میں بڑے دکھ اٹھائے تھے پھر بھی حوصلے اور خوشدلی سے زندگی جی رہی تھی۔

جوانی میں شاگ نہ رہے تو زندگی جہنم کی آگ بن جاتی ہے۔ لوگوں کے طرز اور طے پھر اس کی شدت بڑھا دیتے ہیں۔ پچھلے دو سالوں سے وہ بھی اس قیامت کو محبتی رہی تھی۔ گزرا کھول میں لڑکیوں کے ساتھ مصروف ہو کر مگر رفتہ رفتہ کھ بھولتی جا رہی تھی۔ وہ اس پر ہنس لگتی تھی، اپنی انسانی ذمے داریاں بھی اس کی ڈوبتی کا حصہ تھیں۔ ان میں ایسی الجھ جاتی تھی کہ زندگی کی ڈور کھانے کی لگ رہی نہیں رہی تھی۔ مگر آج دل کے چرسکون سہنہ میں جوار بھانا اٹھا تھا۔ جذبات کی شانت جھیل پر کسی نے نگر چیک دیا تھا۔ اس کی شدت اتنی محسوس ہو رہی تھی کہ اتنی رات گئے بھی وہ کاتب رہی تھی۔ دل اٹھتے زوروں سے دھڑکا تھا کہ ایک تک دھڑکنیں باپ رہی تھیں۔ سراج الدین کے خط کا لفظ لفظ اس کی ٹیس میں جگا رہا تھا۔ زندگی کی وہ گاڑی جو درہم برہم پہلے

مجلس نین سال کی سافت طے کر کے چار ماہ میں رک گئی تھی۔ اب اس پر کوئی اور سوار ہونا چاہتا تھا۔ اسے منزل آشنا کرانے کے خواب دکھانا تھا۔

وہ شہر سے خوابوں کی اسیر لڑکی تھی۔ اس کے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ اس پر بھی قد میں نہیں مٹھ کر اس کا خواب تھا پڑھنے کا۔ وہ غم غم کر میدان میں اتری۔ میزک کے بعد اسکول تک پڑھا پڑھا کر آیا۔ جس اتفاق سے سرکاری اسکول میں گرہ سولہ کی پھر گئی مرنے ہوئی۔ یہ سارے خواب دیکھ کر ان کی تصویر پانا اس اکیلی کے بس میں نہیں تھا۔ اصل میں اس کی پشت پر اس کا بڑا بھائی تھا۔ ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے بہن کا شوق دیکھا تو تعلیم سے لے کر ملازمت تک، ہر مرحلے پر اس کی اخلاقی اور مالی مدد کی۔

بچپن سال کی عمر میں وہ منچر گئی۔ اسکول میں ملازمت ملنے ہی رشتوں کی قطار لگ گئی۔ وہ متوسط طبقے والوں کے لیے ایک طرح سے اے ٹی ایم کا ڈھنگی۔ ہر مہینے چالیس ہزار سے زیادہ کمانے والی ”سکاؤٹ بولٹ“ تھی۔ ایسے میں رشتے داری جگا جگا کر رشتہ والوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ اٹھابیس سال کی تھی جب اس کی شادی ہوئی۔ ابھی تک بہت سے رشتوں سے انکار کر چکی تھی۔ بھائی کی اعانت سے اپنی بات منوانے میں کامیاب بھی ہوئی تھی مگر پھولی نے سب کچھ ٹھنک کر دیا۔

انہوں نے جیلہ کے والدین سے برکت اللہ کے آگے اپنی چادر ڈال دی۔ اپنے بیٹے اکرام کے لیے رشتہ پکا کرنے یا چہرہ بہن کے رشتے کو پیشہ کے لیے توڑ دینے کی دو ٹوک بات کی۔ بیچ صاحب کی یہ بڑی بہن بڑی گرم حراج خاتون تھیں۔ ہائی بلڈ پریشر کی مرید تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آسان سر پر افٹا نہیں تھیں۔ بیچ برکت اللہ بڑی بہن سے ہمیشہ رہتے رہتے جیلہ کے رونے دھونے کے باوجود انکار نہ کر سکے۔ بات یہی ہوئی اور جیلہ رخصت ہو کر پھولی کے گھر میں آ گئی۔

اپنے شوہر اکرام کو بچپن سے جانتی تھی۔ اس سے تین چار سال بڑا تھا۔ عام سی شکل و صورت اور جسامت کا مالک تھا۔ تعلیم بس واسجی تھی۔ جیلہ بھی پڑکھش اور تعلیم یافتہ لڑکی کا کسی بھی لحاظ سے آئیٹل بل نہیں بن سکتا تھا مگر بڑوں نے رشتہ باندھا تھا، اس کی لانگ رن تھی اس لیے اس نے دل و جان سے اسے اپنا شوہر مان لیا۔ اس نے شادی سے

پہلے بس یہی خواہش کی کہ اس کی بچنگ پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

اکرام اللہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اس لیے کسی بھی نوکری کا اہل بھی نہیں تھا۔ چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا لیکن بڑا غیر مستقل مزاج بندہ تھا۔ کوئی بھی ڈھنگ کا کام جم کر نہیں کرتا تھا۔ ایک کام سے بچھا چھڑا کر پھر کسی اور کاروبار پر قسمت آزماتا۔ بھی خود را بہت کماتا۔ اکثر کھانے میں پڑ جاتا تھا۔

اس کا قلفہ تھا کہ ایمانداری، محنت اور مہارت سے زیادہ جیلہ بازی، خوشامد اور شارت کٹ سے کامیابی ملتی ہے۔ اس فلسفے پر عمل کرتا تھا اور بیٹا کا کام دیکھتا تھا مگر کامیابی کے اپنے خود ساختہ اصولوں سے باز نہیں آتا تھا۔ ایسے میں بیوی گھر آگئی۔ ساتھ ہی چالیس ہزار کی اضافی آمدنی بھی گوا چھپر بھاڑ کر اتری۔ تب اس کی کامل اور بیکاری کچھ اور بڑھ گئی۔

چھ مہینے گزر گئے۔ ساس، دو مندریں اور شوہر اس کی تنخواہ میں سے کھاتے بھی رہے، پیٹھ پیچھے اسے برا بھی کہتے رہے۔ جیلہ بہت اعلیٰ ظرف اور اصل مزاج تھی۔ ایک ایسے اسکول کی قبول منچر تھی۔ بہت سے لوگ اس کی قابلیت اور طبیعت کی تعریف کرتے تھے مگر سسرال میں وہ محض بیوی تھی، بھولی اور بھائی تھی جس کا کام کھانا پکانا، برتن دھونا اور سب کی خدمت کرنا تھا۔

اکرام اللہ جب بے نیاز شوہر تھا۔ بیوی سے بھی بوجھا تک نہیں تھا کہ کھانے یا پہننے کے لیے کچھ لے آؤں؟ بھی جیلہ اپنی طرف سے کسی چیز کی فرمائش کرتی تو اسامہ بنا کر کہتا۔ ”دیکھو جیلہ! امیر سے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے میرا کام سچ نہیں چل رہا۔ تمہارے پاس تنخواہ کے پیسے ہوں گے۔ مجھے دے دو، تمہاری چیزیں لے آؤں گا۔“

وہ کٹ سی گئی۔ دکھ سے بولی۔ ”میں اتنا سارا نوکمر کے لیے خرچ کرتی ہوں پھر پھولی اور تمہاری دونوں بہنوں کو بھی اکثر پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مہینہ ختم ہونے تک دو چار ہزار روپے بھی پس انداز نہیں کر سکتی۔“

اکرام اللہ کی غیرت جاگ اٹھی۔ وہ گھور کر بولا۔ ”میری امی اور بہنوں کو بھی ہزار پانچ سو دے کر جٹکانے کی ضرورت نہیں۔ تم خود کو شاہ خرچیاں کرتی ہو، کیا مجھے خبر نہیں ہے۔“

وہ دکھ چھپا کر رومان سے بولی۔ ”میں ایک بڑے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ اچھے خاندانوں کی بیچر اور

اسٹوڈنٹس وہاں پر ہیں۔ اکثر تقریبات ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے میں کسی دوسرے تیسرے سنبھلنے کوئی دبا سوٹ بھونکتی ہوں۔ وہ بھی چار پانچ ہزار سے زیادہ کما لیں ہوتا۔ ہائی ایسے کون سے فنون شوق ہیں میرے؟“

اکرام اللہ جھجھکا کر بولا۔ ”بس بس..... کتنی دفعہ کہو گی ہم پر خرچ کرتی ہو گی مگر تمہارا نہیں ہے؟ تم میری بیوی بن کر اس گھر میں آئی ہو۔ کیا تمہاری آمدنی میں میرا یا میرے گھر والوں کا حق نہیں ہے؟“

وہ بحث سے بچنے کے لیے بولی۔ ”آپ سب کو اپنا سچھ کر ہی تو ایسا کرتی ہوں مگر میری تنخواہ کوئی لاکھوں میں تو نہیں ہے۔ کٹ کٹا کر تیس ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔ جب مہینہ ختم ہوتا ہے، پانچ ہزار روپے کسی مشکل وقت کے لیے بچا نہیں پاتی پھر بھی بدگمانی کی بدگمانی ہے۔“

گم دہش ایسا بائیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ اکرام اللہ بس واجبی سی عقل کا آدمی تھا۔ جیلہ کے پاس آکر چھپے کر دے بادام چائے ہوں، اس طرح منہ بناتے ہوئے گفتیش کرنے لگ جاتا۔ جیلہ بڑی مشکل سے اپنی قربت اور بصیرت سے شوہر کا مزاج معتدل کر دیتی تھی۔

جیلہ کے سسرانیت میاں کافی عمر رسیدہ تھے۔ اچھے مزاج کے انسان تھے۔

شادی کو ایک سال ہو گیا۔ اس اثنا میں دو واقعات رونما ہوئے۔ سسرانیت میاں، اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ بڑی تند جھیرا کی منتفی ہو گئی۔ وہ بی بی اے کے امتحانات دے رہی تھی۔ تیسرے واسطے کاسب کو انتظار تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ کسی خوشخبری کا سب کو انتظار تھا مگر ایک سال کی دہن کو بھی دس سال کی بے اولاد بیوی کی طرح جان بکان کر دیتے ہیں۔

جیلہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلا سال گزر گیا۔ ساس صاحبہ کو ایک نیا محاذ کھولنے کا بہانہ مل گیا۔

یہ خوب تھا کہ اکرام اللہ کو بچوں کے خزانے سے ماں جیسی گھر نہیں تھی۔ ماں کی جلی کٹی باتیں سن کر وہ اکثر بے بازی ظاہر کرتا۔ بچوں کے جھجھٹ سے فی الحال بچے رہنے پر سرت کا اظہار کرتا۔

شادی کا دوسرا سال شروع ہوئے دو مہینے گزر گئے۔ بڑی تند جھیرا کی شادی ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اکرام اللہ نے اچانک یہ فیصلہ سنا دیا کہ وہ متحدہ عرب امارات کی ریاست دبی جانا چاہتا ہے۔ وہاں اس کے دوست ہیں۔ انہوں نے ایک بڑی چینی میں اس کے لیے اچھی ملازمت کا

کلی کو وہی نہ پائی۔

موتن لکھتا ہے۔

گھر میں اور کوئی سر نہیں تھا۔ ماں تھی، ایک بہن تھی سوار ہو چکی تھی کہ وہ سب گھر دتا، بے یار و مددگار چھوڑ کر ایک دن دبی چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

جیلہ اس کے جانے کے بہت دن ہو چکے تھے کی ہی حالت میں رہی۔ اسے چین نہیں ہوا تھا کہ اکرام ایسا دولت پرست اور بے مہر ہوگا۔ دولت ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ رشتوں کی قدر ہی نہ ہے۔

جیلہ اکثر خاموش رہنے لگی تھی۔ اسکول سے واپس آکر گھر کے اپنے حصے کا کام کر کے کھانے میں بندھ جاتی۔ ساس اور چھوٹی تنہا رہتے۔ سس رات کے کھانے پر سامنا کرتی۔

لوہہ کو بھائی نے دینی سے بڑا سو پائل بھیجا تھا۔ وہ ہر وقت اس میں معروف دینی یا پھر لی دی دیکھتی رہتی۔

جیلہ پوچھ پچھل کی اپنے کمرے میں آ جاتی۔ اگلے دن بچوں کو پڑھانے جانے والے اسباب کو کچھ وقت دیتی۔

تھوڑی دیر لی دی دیکھنے میں معروف دینی۔ ایک اداس اور تھکے تھکے سے اعجاز میں نیک کی بستیوں میں بیٹھ جاتی۔ بھی رات رات بھر سرتوں سے لپٹ کر جاتی رہتی۔

پتے میں ایک دو دن کے لیے بیٹھ چلی جاتی تھی۔ ایسی اعلیٰ ظرف تھی کہ سسرال کے دکھائی یا بہنوں میں سے کسی کو بھی نہیں بتاتے۔

مگر بیچ برکت اللہ کو اب اسوں ہو رہا تھا۔ بڑی بہن کے دباؤ میں آکر ہر رشتہ طے کرنے کا طلال رہنے لگا تھا۔ وہ سب اکرام کو قصور وار ٹھہراتے۔ زیادہ دولت کمانے کے لالچ میں عورتوں کو تنہا چھوڑ دینے پر غم غصے کا اظہار کرتے۔

شادی کا دوسرا سال بھی گزر گیا۔ اکرام دو دفعہ کی چھٹی پر آیا۔ اپنے ساتھ دولت کو کچھ نہیں لایا مگر بڑے بڑے خواب لے کر آیا تھا جن کی تعبیر کی تنائیں چھری دن بعد واپس چلا گیا۔

اس دوسرے سال کے اختتام پر بھی جیلہ کی گودہری بھری نہ ہوئی۔ اب تو اوندہ باہر سے لڑکی لیکر باتوں کی کاٹ کچھ زیادہ ہی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ خود بھی اب گھر مند ہی سے اپنی خالی گود کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

اسکول کی ایک ساتھی منچر اس کی بے تکلف دوست تھی۔ اس کا نام عابدہ تھا۔ وہ بھی شادی شدہ تھی۔ اکثر جیلہ

اے وہ سکے اسے سنائی رہتی تھی۔ اس ساتھی بچے کے کہنے پر ایک مشہور گانا کا لوجسٹ ڈانکر سے ملاقات کی۔ ڈانکر نے فیصلہ کیا اور مختلف ٹیسٹ وغیرہ کے بعد کہا کہ بچے کی کوئی بات نہیں۔ فکری دروازے مسئلہ دور ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے شوہر کی موجودگی لازم ہے اس کے بغیر دوا کار نہیں ہو سکتی۔

دو مہینے میں دو ایک بار اکرام سے فون پر بات کرتی تھی۔ اب کی بار اس نے ڈانکر سے ملاقات اور اس کی ہدایات کے بارے میں بتادیا۔

اکرام بڑی بے نیازی سے بولا۔ ”کبھی میں میری ذمہ داریاں زیادہ لیں۔ ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے ہیں وہاں سے آئے ہوئے۔ مجھے بار بار چھٹی نہیں مل سکتی۔“

اکرام کے دماغ پر درود مصدق کا بھوت سوار تھا۔ جیل کے دورہ وہاں اور بہن کی پریشانیوں کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ چوٹی کو بیٹے کی محسوس ہوتی ہوئی مگر اس امید میں دن کی کسی نہ سال کے آخر تک اکرام انہیں دینی بلانے والا ہے مگر یہ سارے دلدرد ہو جائیں گے۔

اور اسی بات سے جیل کے دل میں ہول اٹھتے تھے۔ وہ کیسے ہمیشہ کے لیے ان سب سے ناپا تو ذکر جا سکتی ہے؟ عورت ذات کے لیے سرکاری نوکری آسانی سے نہیں ملتی۔ شوہر کے مزاج کو وہ سمجھتی تھی۔ اس کی باتوں میں آکر ایسی نفرت کوکھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا سکون لب کیا تھا۔ اکثر راتوں کو جاگتے اور پریشان رہنے سے اس کی صحت گر گئی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔

☆☆☆

اکرام کا دینی میں ایک سال پورا ہو گیا۔ وہوں اور دھوں کے مطابق وہ دینی میں اپنا کاروبار شروع نہیں کر سکا۔ جس کہی میں کام کرتا تھا اس میں تنخواہ تو معقول تھی، پانچویں زیادہ تھی۔ سال ختم ہونے پر وہ بیس دنوں کی چھٹی پر آیا۔ بہت جلد سب گھر والوں کو دینی لے جانے کا عندیہ دے کر لوٹ گیا۔

چھ مہینے اور گزر گئے۔ وعدے کے مطابق انہیں دینی بلانے کے بجائے ایک دن سب کا دل دہلا دیا۔ اس نے جیل کو نوں کر کے بتایا کہ تین اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہ ایک ریٹائرمنٹ سکول رہا ہے۔ اس ریٹائرمنٹ کا مالک ایک ہندوستانی تاجر ہے۔ اب وہ سب کچھ لپیٹ کر ہندوستان واپس جا رہا ہے۔ اس کی لاگت دو کروڑ پاکستانی روپیوں کے برابر تھی۔ چار ساتھیوں میں یہ لاگت برابر تقسیم کی گئی تھی۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی مگر اگلی بات نے جیل کے دل دہلا دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ بڑا منافع بخش منصوبہ ہے۔ دولت سنبھالنے میں سہیلے کی۔ اس مقصد کے لیے وہ آخری حد تک جانے کو تیار ہے۔ اس لیے اس نے گھر بیٹے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے سنبھل کر کچھ بولنے تک اکرام نے فون بند کر دیا۔

بچاس لاکھ روپے اکرام جیسے اوسط روپے کی خوبیوں والے شخص کے لیے نہایت بڑی رقم تھی۔ کہنی میں بچاس ہزار سے زیادہ اس کی تنخواہ نہیں تھی۔ ہمیشہ ہی حیثیت سے بڑھ کر اپنے اپنے خواب دیکھتا رہا تھا اور ہر بار شوگر کی بی کمالی تھی۔ یہ بات اس نے اپنی امی اور بہن کو بھی بتادی تھی۔ وہ بھی شکر نظر آ رہی تھی جس پر ایک دن وہ اچانک مگر آگیا۔ جھٹ پٹ پر اپنی ڈیلروں سے بات کی۔ چالیس لاکھ میں گھر کا سودا لے کر لیا۔

ماں اور بہن کو دینی کی چمک دمک، وہاں کی رونقیں اور راحتیں نظر آ رہی تھیں اس لیے مکان بیچے جانے کا زیادہ دھک نہیں تھا۔

اکرام اللہ فیصلہ کر چکا تھا۔ جیل کے کاروبار کو دھونا اور احتجاج اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور نہ کر سکا۔ انہاں نے مطالبہ داغ دیا۔ ”پس لاکھ روپے ابھی کم پڑتے ہیں۔ ان میں سے آدھی رقم کا بندوبست تم کرو۔ زرگروں کی بیٹی ہو۔ اپنے داماد کے اچھے مستقبل کے لیے پانچ لاکھ روپے نہیں دے سکتے کیا وہ؟“

جیل کے بات گھر والوں کے سامنے رکھی مگر مگر والوں نے شدید غصہ اور ناراضگی کا اظہار کیا۔

☆☆☆

جیل عجب دور اپنے پرکھتی تھی۔ دونوں راستوں پر اپنی تباہی صاف نظر آ رہی تھی۔ شوہر کی بات مان لینی تو ایک اچھی نوکری سے محرومی اور بہت سے رشتے داروں سے دوری کے دکھ اٹھانے پڑتے۔ شوہر کی بات نہ ماننے پر ازدواجی زندگی عذاب بن جاتی۔ باپ اور بھائیوں نے پانچ لاکھ دینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اکرام اس کا جینا دو بھر کر دیتا۔

شدید پریشانیوں کی وجہ سے اس نے اسکول سے بھی چھٹی لے لی تھی۔ میکے میں ایک کمرے میں پڑی رہتی۔ ایک مہینے بعد شوہر نے فون کیا۔

”میں آخری دفعہ تم سے بات کر رہا ہوں۔ امی اور

دو روپہ کا پاسپورٹ بن گیا ہے۔ مکان فروخت کے آخری مراحل میں ہے۔ میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے پانچ لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔ انہیں لے کر آ جاؤ۔ تمہارا بھی پاسپورٹ آرجنٹ تیار کروادوں گا مگر یہاں کی ساری عورتوں جیسا کہ خرابیوں کے دہس میں چلے جائیں گے۔“

جیل نے اس سے پہلے بہت سوچا تھا۔ باپ اور بھائیوں کے فیصلے پر بھی خوب غور کیا تھا۔ اس نے ہمت کر کے شوہر کو بتا دیا کہ بھائی اور باپ پیسے دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ خود بھی ابھی فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔ اسے سوچنے کے لیے مزید وقت دے دیں۔

اس کا جواب سن کر اکرام نے اسے بہت سخت کہا۔ شوہر سے بات ختم کر کے وہ جہان میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈھائی سالہ ازدواجی زندگی ویسے تو سرتوں سے بھر پور بھی نہیں رہی تھی مگر آج تو اس کی بنیادیں ہی ٹل گئیں۔ دو مہینے بعد جیل نے سنا اکرام سب کچھ بیچ باج کر ماں اور بہن کو ساتھ لے کر دینی روانہ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کائناتوں کی تاج بن گئی۔ یہ غیبت تھا کہ وہ اسکول جاتی تھی۔ چھ مہینے گزر گئے۔ اسے اپنے شوہر اور ان کی ماں بہن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہاں جا کر ان کے

رابطہ نہیں ہو سکی تھی۔ یہی اکرام نے پلٹ کر خبر بھی نہیں لی۔ مگر ایک دن اس نے فون کیا۔ وہ بڑا جھک رہا تھا۔ کاروبار میں اپنی کامیابی پر خوب اترا رہا تھا۔ دینی کی رونقوں، رنگینوں اور عیشیوں کے قہقہے سن رہا تھا مگر آخر میں کہا۔

”جیل! تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتی تھیں، مجھے کھانا اور ناکام محسوس بھی تھا۔ آج تم اپنا ہر بات میں چھوٹی ہو کیونکہ تم محسوس کرتی کیڑا دہی ہو چکے ہیں اپنے تجربے، قابلیت اور حکمت عملی کے باعث ایک کامیاب بزنس میں بن گیا ہوں۔ تمہارے بھائیوں نے مجھے پانچ لاکھ نہیں دیے، آج میں پانچ لاکھ ہر مہینے کا سکھتا ہوں۔ تم ہمیشہ کے لیے اسٹیبل بین کر سکتی ہو کی زندگی میں ہی کتنی روٹی جگہ فری ماں اور بہن اس وقت دینی کی رونقوں میں شائستہ خات بات کے ساتھ زندگی گزار رہی ہیں۔ اب سب سوچوں کا محور کی کی کیسے دور کرتی ہے اور جب تم حریہ دور ہوتی جاؤ گی۔“

اکرام کی باتیں بڑی کاٹ دار اور دل شکن تھیں۔ جیلہ رات بھر سوچتی رہی۔ جوں جوں اپنے حالات اور مستقبل کے امکانات پر غور کرتی تھی، اپنی ضد اور اتنا ترک کر کے شوہر کی بات مان لینے کا خیال غالب آتا گیا۔ اگلے



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

جنگل کا تانوں نافذ کرنے والے انسانی تذلیل کے مرتکب درندوں سے ٹکرا جانے والوں کی خوبی داستان

جنگل

امجد جاوید کے قلم سے

دن اس نے چپکے چپکے پکارا۔ اسکول سے گھوڑے کے بغیر ایک سال کی چوٹی کی اجازت مل سکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں پکارا اور دیکھا کہ اکرام سے بات کرے گی۔ اس کی بات ماننے کی کیا ہوا ایک سال اس کی بات مان کر پڑیس کی زندگی بھی گزار کر دیکھے۔ اگر حالات موافق نہ ہوئے تو دو دو کمرسال کے بعد واپس آسکتی ہے۔ اسکول کی ملازمت بھی ملازمت رہے گی۔ اس نے اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی حتمی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ انجی سوچوں کے ساتھ اپنی ہمت جمع کر رہی تھی کہ اس سے پہلے ہی بڑا دھماکا ہو گیا جس سے اس کی دنیا ورہم برہم ہو گئی۔ اکرام کے فون کے دس دن بعد پوری برادری میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ اس نے دعویٰ میں ایک پاکستانی خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ یہ خبر جیل کے کالوں تک بھی پہنچی۔ اس کی شدت ایسی اصحاب حق کی تھی کہ وہ اندر سے لرز اٹھی۔ تین سالہ ازاد دینی زندگی دیکھ تو کسی بھی لحاظ سے مثالی نہیں تھی پھر شوہر کی بات نہ مان کر اعتبار کی دیوار بھی خود اس نے گرائی تھی مگر کسی عورت کے لیے اس سے بولناک خبر کوئی اور نہیں ہوتی کہ اس کا شوہر قید ہو جائے۔

اس کے گھر والوں کے لیے یہ خبر بلی جلی کیفیت کی حامل تھی۔ ماں اور بہنیں دکھ سے رو رہی تھیں۔ باپ نے محتات سے برداشت کیا۔ بڑے بھائی جج عیادت اللہ نے خوب گھر بھر پکایا۔ اس نے اکرام کو فون کیا۔ بڑی رنج اور کانٹے دار باتوں کا چٹاؤ ہوا۔ اکرام نے صاف بتا دیا کہ شادی اس کی ضرورت تھی۔ تم نے اپنی بہن کو روک کر رکھا۔ میں اپنے جذبات کی تیز آندھی کو روک نہیں سکتا تھا۔ گناہ سے بچنے کے لیے جائز راستہ اختیار کیا ہے۔ شرعی اور اخلاقی لحاظ سے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔

اس کے جواب کے رد میں جج عیادت اللہ نے حتیٰ فیصلہ سنایا کہ میری بہن اب تمہاری زندگی میں مزید نہیں رہ سکتی۔ اسے طلاق دے دو۔ اکرام نے انکار کیا مگر جج عیادت اللہ نے پچھا نہیں چھوڑا۔ خاندان کے بڑوں کو جمع کیا۔ ان کے ذریعے اکرام پر دباؤ ڈالا گیا پھر بڑی کوششوں کے بعد وہ جیل کو طلاق دینے پر راضی ہوا۔ یوں تین برس تک شروع ہونے والا یہ ازدواجی سفر بڑے شیب و فراز کے بعد ایک دردناک انجام سے دو چار ہو گیا۔

☆☆☆

جیل خراب صورت اور جوان تھی۔ ایک باوقار

ملازمت بھی تھی۔ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی۔ طلاق کے کچھ مہینے بعد ہی رشتوں کی دیکھیں سنا کی دیکھیں مگر کمر کی ایسا نہ تھا جس پر دل خوشی سے راضی ہو جاتا۔

یوں ماہ و سال کی گردشوں کی فضا میں آکر بڑے ہوئے دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان دو سالوں کے دوران اس نے ساکھ اکرام سے جو رشتہ ورثہ کھولا تھا اب وہ بند ہو گیا تھا۔ چاروں پارٹنرز میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے رشتہ وران نہیں چل سکا۔ بہن نوہرہ کی شادی اپنے ایک بھائی دوست کے بھائی سے کرانی تھی۔ وہ دعویٰ میں ہی رہتے تھے۔ اکرام اپنی بیوی اور ماں کے ساتھ کرائے کے فلیٹ میں بھی ایک جگہ جی دوسری جگہ شکانے بدلتا رہتا تھا۔ وہ اکرام کو جتنا جانتی تھی اس کے مطابق یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ چلو چھا ہوا، وہ یہ سب چھوڑ کر نہ گئی ورنہ ان کی طرح درد بردی اور پریشان حالی اس کا بھی شیب ہوتی۔ ان دو سالوں میں جیل اسکول اور گھر کے سچ ایک لگی بندھی زندگی گزارتی آئی تھی۔ اس نے اپنے جذبات، خواہشات کو کھینک کھینک کر سلا دیا تھا۔ وہ اپنی ہی مصروفیات میں سرست محسوس کرتی تھی۔

مگر..... مدتوں بعد پھر دل کے خاموش سمندر میں جوار بھاتا اٹھا تھا جس کے تلاطم نے پورے وجود کے جزیرے ڈبو دیے تھے۔ اور اب رات کے ایسے پہرہ وہ ان ڈوبے جزیروں کے نشان پھر سے تلاش کرنے لگی تھی۔ یہ جزیرے ویران سمندروں میں زندگی کی نوید تھے مگر جیل اس کی خوش تھی کے سراب میں بھٹکتا نہیں جاتی تھی۔

طلاق کے بعد جتنے بھی رشتے آئے تھے، اس کی جذباتی کیفیت ایسی نہیں ہوئی تھی جس طرح کی سراج الدین کا خط پڑھ کر ہوئی۔ یہ نہ جانے اس کی تحریر میں موجود غلوں اور بے ساختگی تھی یا پھر سراج الدین کی پُرکشش شخصیت کا اثر تھا کہ کئی گھنٹوں سے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رات کے اس پہر کی خاموشی میں سراج الدین کی تحریر کا لفظ لفظ اس سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کی جاذب نظر شخصیت کا عکس اس اندر سے کمرے میں اپنی جھک دکھلا رہا تھا۔ اسکول میں ہوئی ملاقاتیں کسی فلم کی طرح دماغ کی اسکرین پر نظر آرہی تھیں۔ اس کے اندر ایک حیا آلود جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔

پھر یکایک ایک چمکا ہوا۔ احساس اور جذبے کا آئینہ جیسے کچھ کچھ ہو کر بکھر گیا۔ سراج الدین کے بیوی

فل کی وہی کہانی

جیسے کسی تھکاوٹ سے کی طرح دل و دماغ سے ہٹ گئے۔ سراج الدین نے اپنے انجیٹار لکھ کر ایک ہفتے تک جواب دینے کی التجا کی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی، خط کو تکیا پھر اسے ایک موٹی سی کتاب میں رکھ کر الماری میں سب سے نیچے کے خانے میں ڈال دیا۔ اپنے دل میں ابھرنے والی مرثیہ لہروں کو بے رحمی سے دبا دیا۔ کرسی سے اٹھ کر کمر کیائیں بند کر کے بیڈ پر آ گئی۔

☆☆☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ سراج الدین دن گنتے ہی رہ گیا۔ موبائل کی بجٹے والی ہر گھنٹی سے مایوس ہی ہوتا گیا۔ وہ جیسے جیسے ہونے سے پر چلنے والے بازو تھک کر طرح ہو گیا تھا۔ آفس ہو یا گھر، ہر جگہ اس کا دھیان موبائل کی طرف جاتا۔ رات سوئے میں بھی اچانک چونک کر اٹھ بیٹھا۔ بے تابی سے لپک کر موبائل اٹھاتا، اس کی اسکرین میں کسی نامعلوم نمبر کا فون نام تلاش کرتا مگر ہر بار مایوس ہوتا اور ہرگز رات دن کے ساتھ یہ مایوسی دکھ کے کمر میں لپٹ کر نہایت پوجمل سا اضطراب پیدا کر لیتی۔

اسی اضطراب مسلسل کے ساتھ پیام و وفا کا معینہ وقت بھی ختم ہوا۔ شریف صاحب اس کی بے قراری سے بے نیاز نہیں تھے۔ اسے تسلی دلا سادے کمرے بند حاتے۔ ایک دن سراج الدین دکھ سے بولا۔ ”یار شریف! خط لکھ کر میں نے برا تو نہیں کیا؟ اس عمر میں نوجوانوں جیسے چونچلے معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ کہیں اس نے بھی تو برا نہیں منایا؟“ شریف صاحب نے کہا۔ ”تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ ایک مہذب طریقے سے اپنے جذبات اس تک پہنچائے ہیں۔ اس کا جواب نہ دینے کی وجہ تمہارا خط بالکل نہیں ہے۔ خود اس کا اپنا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔“

”مگر مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ اس نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟ کیا اس نے میری التجا مسترد کی ہے..... کیا اس کے بارے میں اب سوچنا ہی ترک کر دوں..... کیا ایسا کرنا میرے لیے آسان ہوگا؟“

شریف صاحب کچھ سوچے ہوئے تھے۔ ”آج کل ان کے اسکول میں سالانہ امتحانات ہو رہے ہیں۔ کیا بتا اسے موبائل نہیں ملا۔ وہ میں اپنی بہن شہلا کی مصروفیات سے واقف ہوں۔ اسکول سے آتے ہوئے احتمال پرچوں کا ہڈل ساتھ لے آتی ہے۔ رات کے انہیں چیک کر کے نشانات لگاتی رہتی ہے۔ میں جیل بھی مصروفیت کی وجہ سے تمہارا خط نہیں پڑھ سکتی ہوگی۔“

سراج الدین کی ایک ذرا امید جاگ ا۔ وہ بے تابی سے بولا۔ ”اپنی بہن کی بات کر کے خوب یاد دلایا کیا اپنا گھر ہے کہ تم اس کے ذریعے میرے خط کی حقیقت معلوم کر دو؟“ ایک ہی اسکول کی پیچھے دو کمر ایک دوسرے سے راز و نیاز کی باتیں کرتی ہیں۔ تمہاری بہن اک ذرا صبر اور بصیرت سے معلوم کر سکتی ہے۔“

شریف صاحب کچھ زرا غور و فکر کر رہے تھے پھر بولے۔ ”پہلے یہاں جب تمہارے کپنے پر بہن شہلا سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں تب اس نے وجہ پوچھی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ تم اس میں دھکیل رہے ہو۔ یہ بات فی الحال میری بہن تک محدود ہے۔ اس کے بعد بار بار اسکول کے حالات پر بات کرتے ہوئے اس نے جیل کے بارے میں بھی ایک آدھ بات بتائی تھی۔ شہلا کے مطابق وہ دونوں ایک اسکول کی کالینڈری حد تک ملتے رہتے ہیں، اس سے زیادہ تعلق نہیں مگر میں شہلا سے بات کرتا ہوں۔ جیل سے تعلقات بڑھانے کا مشورہ دیتا ہوں۔“

سراج الدین کے پاس شریف صاحب کی بہن شہلا کی صورت میں ایک آخری امید تھی۔

☆☆☆

گورنمنٹ سٹی گرلز ہائی اسکول میں امتحانات ختم ہوئے۔ ساری ہی پیچڑ پرچوں کی چینگ کر کے تیار تھیں۔ شریف صاحب نے صرف تھیں۔ جیل داس پر ہل ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ مصروف رہتی تھی۔ اپنی کلاس کے رزلٹ کے علاوہ پورے اسکول کے نتائج کا رزلٹ اعلان کرانے کے لیے جمن کر رہی تھی۔ اسکول کی طرف سے والدین کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آخری پرچے کے ایک ہفتے بعد نتیجہ کا اعلان کیا جائے گا۔

جیل اپنے اسکول میں بہت مقبول تھی۔ اس کی طبیعت اور پیشہ ورانہ قابلیت سب کا دل و دماغ تھی مگر سب سے زیادہ پھر عابدہ اس کے قریب تھی۔ وہ اکثر اپنے ذاتی معاملات اس ساتھی پیچڑ کو بتاتی رہتی تھیں اور اس سے مشورہ بھی

کرتی تھی لیکن سراج الدین کے محل کا معاملہ ابھی اس نے
جہاں تھا۔ دل سے ابھرنے والے جذبات کی شدت سے
چٹا چٹا کر کے الماری میں سوئی سی کتاب کے سیکڑوں صفحات
کی دیواروں کے اندر دبا دیا تھا۔ اسکول میں بے انتہا
مصرف رہنے کے بعد وہ گمراہی تو رات کی بے رحم تھائیوں
میں بھی سمجھتا تھا کہ اس کی تقریریں الماری سے چپک جائیں۔

☆☆☆

سالانہ ختمے سے ایک دن پہلے ہی اسکول کی ساری
مچرنے اپنی اپنی کلاس کا نتیجہ ترتیب دے کر مکمل کر لیا تھا۔
پرنسپل سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب کل
والدین کی موجودگی میں بچوں کے امتحانی ختمے کا اعلان
کرنے کے لیے وہ سب تیار تھے۔ جیلہ بھی خود کو ہلکا ہلکا
عموس کر رہی تھی۔ وہ اسٹاف روم میں بھی اخبار پڑھ رہی
تھی۔ اس کی ساتھی ٹیچر عابدہ اس کے پاس آئی اور دیر سے

سے بولی۔
”تم فارغ ہو تو کسٹین چلے چلے ہیں۔ چائے میں
گھول کر کچھ باتیں کرتے ہیں۔“
”کوئی خاص بات ہے کیا؟ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے تو
چائے پیا کرتے تھے؟“

عابدہ نے کہا۔ ”باہر کارڈزور میں شہلا باجی تھیں۔
آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ کچھ مجھے بتایا تو
ہے۔ اپنی باتیں آپ کی موجودگی میں کرنا چاہتی ہیں۔“
جیلہ کو خیال آیا لیکن ہے اپنی کلاس کے رزلٹ سے
معلق کوئی بات کرنا چاہتی ہوگی۔ وہ عابدہ کے ساتھ اسٹاف
روم سے باہر آئی۔ کسٹین توڑے سے قافلے پر کورڈزور کے
آخر میں موجود تھی۔ دو دو لوگوں کسٹین میں آگئیں۔ شہلا وہاں
پہلے سے ہی موجود تھی۔ شریف صاحب کی بہن ان دونوں
سے عمر میں دو چار سال بڑی تھی۔ بہت بھلا اور باوقار
خاتون تھی۔ جیلہ اس کی بڑی عزت کرتی تھی مگر اسکول کے
معاملات کے علاوہ کسی کوئی ذاتی گفتگو نہیں کی تھی۔

وہ تینوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئیں۔ دسی گفتگو
ہوئی۔ اچانک شہلا، جیلہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

”عورت تہا ہو تو بہت سے لوگ باتیں بناتے ہیں۔
حقیقت جیسی بھی ہو، بہت سے افسانے بناتے ہیں۔ آپ
کے ساتھ مجھ کی ایسا ہوتا ہوگا۔ آپ یہ سب کیسے سمجھتی ہیں؟“
جیلہ نے چپک کر اس کی طرف دیکھا پھر ایک ہلکی
سکراہٹ لہڑی پر سہا کر بولی۔ ”جیسے جیتا آجائے وہ ایسی
کڑوی باتیں جھیلنا بھی سیکھ جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں میری

پیشہ پیچھے بہت سی سرگوشیاں ابھرتی ہیں۔ میری ازدواجی
زندگی کی ناکامی کے کڑی بڑی کوسٹیاں کی جالی لپٹ کر میں
پردہ انہیں کرتی۔“

شہلا نے کہا۔ ”آپ جوان ہیں، خوش حال اتنی ہیں
کہ ہم سب رشک کرتے ہیں۔ اچھی بات ہے کہ آپ لوگوں
کی باتوں کی پروا انہیں کر تھیں مگر ایسی بے پروائی خوب تو نہیں
کہ جوانی تیزی سے ڈھل رہی ہے اور آپ کو گھر نہیں۔“

ٹیچر عابدہ بولی۔ ”شہلا باجی! میں اسے سو بار کہہ چکی
ہوں۔ ایسی پہاڑی زندگی اکیلے گزارنے کے گزارے نفسیاتی
مریض بن جاؤ گی۔ بھائی اور بہنیں ایک حد تک تمہاری
تہائی اور اداسی دور کر سکتے ہیں۔ تمہاری ذاتی اور جذباتی
زندگی کی کمی ایک جیون ساسھی سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔“

وہ سر جھکائے گہری اداس نظروں سے چائے کی پیالی
سے اٹھی بھاپ پر نظریں جما کر بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ
ایک ایسے نارمل زندگی گزار رہی ہوں۔ میں نے بھی ایک
بھرے پڑے گھر کا خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب ایک
ادھوری تعبیر دکھا کر اڑ گیا اور میں..... ایک مطلقہ، ایک
اجڑی ہوئی عورت..... اب مزید خواب بسانے ہوئے
ڈرتی ہوں۔“

”آپ کوئی نادان اور جذباتی لڑکی نہیں۔ ایک سنجیدہ
اور پختہ فکر خاتون ہیں۔ آپ کی قابلیت اور کچھ داری کی
مثالیں دی جاتی ہیں مگر اپنے بارے میں آپ سنجیدگی سے
نہیں سوچیں۔ اب یہ وقت خواب دیکھنے کا نہیں، ہوش مندی
سے آنے والی زندگی کو صواب بننے سے بچانے کا ہے۔“

عابدہ بولی۔ ”تمہاری عمر اس وقت تین سال سے
زیادہ ہے۔ تم جانتی ہو زیادہ عمر کی عورت بچے پیدا کرنے کی
صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اب مزید چند برس بعد تم
عمر کی اس حد میں داخل ہو جاؤ گی جس کے بعد بچے جنم دینے
کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ پلیز! تم سنجیدگی سے غور کرو۔ کیا
ایسی نعمت سے محروم رہنا چاہتی ہو؟“

وہ گہرے کرب سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔
”پانچ سال قبل شادی کر کے میری کوکھ بچوں سے محروم رہی
ہے۔ اب آئندہ کیا امید رکھوں گی؟“

عابدہ جلدی سے بولی۔ ”ایسی مایوسی کی بات مت
کرو۔ یہ حقیقت ہے پہلی شادی کے دوران تمہارے ساتھی
شوہر کی غیر سنجیدگی اور عدم موجودگی کی وجہ سے سنجیدگی پیدا
ہوئی تھی۔“

وہ جیسے ہوئے بولی۔ ”اللہ خیر کرے۔ آپ دونوں

مل کر بانٹ کر رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کسی کے لیے مجھے
آباد کرنا چاہتی ہوں؟“

ان دونوں نے چپک کر ایک دوسرے کی طرف
دیکھا۔ جیلہ کے قیامے کو دل ہی دل میں سراہا پھر شہلا
تخیل کر بولی۔ ”میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ آپ
کی زندگی میں آنے والے تقریرات سے آشا ہوں مگر یہی مکمل
کر اس موضوع پر آپ سے گفتگو نہیں کی تھی۔ آج ایسا
کر رہی ہوں تو اس کے پیچھے بس یہ احساس ہے کہ جیلہ جیسی
شاید عورت کی زندگی کا کتنے دارنہ بنی رہے۔“

عابدہ نے کہا۔ ”تم کئی سالوں سے میرے قریب
ہو۔ مجھ سے بہت سی ذاتی اور جذباتی باتیں کرتی ہو لیکن
شادی کے سلسلے میں میری بات نہیں سنتی ہو۔ آج شہلا باجی
نے مجھ سے تمہارے بارے میں گفتگو کی۔ یہ بھی میری طرح
تمہاری بھلائی کا سوچتی ہیں۔ جب ہم نے فیصلہ کیا کہ دونوں
مل کر تمہاری بچکوں کے کمانی نا وسائل تک پہنچانے میں مدد
کریں گے۔“

جیلہ کچھ نہ بولی۔ بڑی دیر سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔
بڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جیلہ ایک گہری
سانس لے کر بولی۔ ”ان دو سالوں میں متعدد رشتے آئے
تھے۔ کچھ کو بھائی نے اور اکثر کو میں نے مسترد کیا تھا۔ میں
کسی آئیڈیلٹ لڑکی کی طرح نہیں سوچتی مگر ایسا بھی ممکن
نہیں کہ آنکھیں بند کر کے کسی دلدل میں اتر جاؤں۔“

شہلا بولی۔ ”جیلہ میری بہن! ضروری نہیں ہر بار
آپ کے ساتھ برا ہو۔ اللہ پاک بڑے رحم ہیں۔ مسبب
الاسباب ہیں۔ آپ مایوسی اور خوف کے غول سے نکل
آئیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

عابدہ شوشی سے بولی۔ ”آج سے میں اور شہلا باجی
تمہارے لیے مشاطہ گیری کا کام کریں گی۔ افسوس میرا کوئی
بھائی نہیں ورنہ فخر سے اس کی تمہارے ساتھ شادی
کر ادیتی۔ قسمت والے کو تمہاری جیسی خوب صورت اور خوب
سیرت عورت ملے گی۔“

شہلا بولی۔ ”جیلہ! آپ اسکول میں میری سینیئر ہیں مگر
عمر میں، میں آپ سے بڑی ہوں۔ میری ایک بات یاد
رہیں۔ جب تک اپنا گھر نہ ہو جس میں شوہر ہو، بچے ہوں،
عورت کی تخیل نہیں ہوتی۔ ہم آپ کو اس ادھورے پن سے
ٹھاننا چاہتے ہیں۔ کسی رشتے کو قبول کرنے کے لیے دباؤ نہیں
ڈالیں گے۔ فیصلہ آپ کریں، راستے ہمارے ہم کریں گے۔“

اسی وقت اسکول کی ایک گریڈ دن خاتون انہیں

دل کی وہی تنہائی

دعوتی ہوئی ادھر آئی۔ جیلہ کو پہل کا پیغام پہنچا کر وہ
ان سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ تینوں کرسیوں سے اٹھ کر اس کی
طرف جانے لگیں۔

شہلا نے شریف صاحب کے مشورے پر ٹیچر عابدہ
کے ذریعے جیلہ سے راہ دوم بڑھالے تھے۔ عابدہ خود بھی
چاہتی تھی کہ جیلہ کو سہاگ کا سامنا نصیب ہو۔ شہلا نے
اسے سراج الدین کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں۔
ابھی بہت کچھ بتانا باقی تھا۔ وہ چاہتی تھی جیلہ کچھ مکمل
جائے، اس کے جذبات پر بھی برف ٹھوڑی پھیل جائے اس
کے بعد سراج الدین کو خود بنا کر اس سے بات کی جا سکتی
تھی۔ آج کی گفتگو سے وہ بڑی پر امید تھی۔ جیلہ کی مایوسی
اور خوف کی قدر چٹ گیا تھا۔

☆☆☆

سٹی گزٹ اسکول میں آج ختمے کا دن تھا۔ طالبات کے
والدین کثیر تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ ایک بڑے سے
بال میں جیلہ افتتاحی تقریب مستعد ہوئی۔ ہر کلاس کی پہلی
تین پوزیشن لینے والی طالبات کا نام پکارا گیا۔ انہیں
انعامات اور میڈلز سے نوازا گیا۔

سراج الدین بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ اس کی
پہلی نے اپنی کلاس میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔
بچی کا جب نام پکارا گیا، وہ اٹھ کر آگے پر گئی۔ پہل کے
باتھوں اپنا انعام اور میڈل وصول کیا۔ وائس پرنسپل جیلہ بھی
آگے پر موجود تھی۔ اپنی پرنسپل کی معاونت کر کے بچوں کو
انعامات دلوا رہی تھی۔ سراج الدین نے بچے بال کی کرسیوں پر
دوسری قطار میں بیٹھا تھا۔ اپنی پوری حسیات سمیت کر
آنکھوں میں ہنسنے لگا تھا۔

وہ بہت قریب تھی۔ ایک ہی صحت کے بچے موجود تھی
مگر بے انت مسافروں کی دوسری صف میں جاگ لگی۔ وہ جانے
کی طرح تھی جسے دیکھ سکتا تھا، اپنی روح کی گہرائی تک
جس کی روشنی محسوس کر سکتا تھا لیکن اسے ہاتھ نہیں مل سکتا تھا۔

انعامات کے اس مرحلے کے بعد اعلان ہوا کہ سب
لڑکیوں کو رزلٹ کارڈ ان کی متعلقہ ٹیچر کلاس روم میں دیں
گی۔ سراج الدین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس قافلہ جاں
سے اب سامنا ہونے والا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس سے
ملنے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اب نہ جانے اس کا رویہ
کیسا ہوگا؟

پھر دل کو شریف صاحب کی باتیں حوصلہ دینے لگیں۔
اس کا جواب نہ دینے کی کوئی دوسری وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

اب اس کے سامنے جانا چاہیے۔ یہ ایک اچھا موقع ہے اس کے تاثرات جاننے کا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ بہت سی سوچوں کے جھوم میں بیٹھی کی انکی پڑھ کر اس کی کلاں میں آگیا۔ آٹھویں کلاس کی بہت سی لڑکیاں اور ان کے والدین رزلٹ کارڈ لینے کے لیے موجود تھے۔ سراج الدین کو اس جگہ پر بڑی مشکل سے جیل نظر آئی۔ وہ بڑی سی پڑھنے والی تھی۔ سراج الدین کی طرف سے جیل پر توجہ داری رزلٹ کارڈ لینے کی بجائے تھی۔ کسی کی طرف سے توجہ داری تھی۔ کسی کے لیے مزید محنت کی تھی۔

سراج الدین اس کی نظروں کے سامنے سے ڈرا ہٹ کر گزرا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی بیٹی کا نام پکارنے تک مجھے چھٹ مٹی تھی۔ پانچ چھ لوگ وہ تھے۔ جب اس نے محل کا نام پکارا تو سراج الدین بھاری بھاری قدموں سے محل کو لے کر اس کے سامنے چلا گیا۔ جیل نے سراج الدین کو دیکھا۔ جیل نے ہونے والی ایک واقعہ کو اس کے سامنے چھڑے پر نمودار ہوئی۔ سراج الدین کو اس کی آنکھوں میں لرزے ہوئے دل کا ارتعاش بہت صاف محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے بے جاڑ بھی گئیں۔

سراج الدین نے اسے سلام کیا۔ بڑی ہی سنجیدگی سے کہا۔ ”جیل صاحبہ! میری بیٹی نے اپنی کلاں میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کا گریڈ آپ کو دیتا ہوں۔“

دوسرے جگہ اس نے نظریں چماتے ہوئے بولی۔ ”مگر یہ سراج صاحب! ویسے میں نے وہی کیا ہے جو بیٹیت استاد میری ذمہ داری ہے۔ باقی سب کچھ آپ کی توجہ اور محنت کی بدولت ہے۔“

وہ دیکھ کر رہی تھی۔ سراج الدین کو ان کی اور نسائی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ٹنگر پھینکا۔ ”محل کی محنت اپنی جگہ لیکن آپ کی محنت اور شفقت کا اثر زیادہ رہا ہے۔ خاص کر آپ کے تھریٹیشن پڑھنا اس کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ امتیازی نمبروں سے یہ کامیابی اسی نمونہ کے سبب لی ہے۔“

نیشن کی بات پر جیل کے چہرے پر مزید رنگ بکھر گئے۔ سراج الدین کے خط کے الفاظ، کمرے کی الماری میں کسی کتاب کی قید سے اڑ کر ایک دم سامنے آ گئے۔ مادی شکل میں نرم زخم لگیدوں سے اسے گدگدانا لگے تھے۔ وہ نظریں چماتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کی اعلیٰ قدرتی

ہے کہ مجھے اس قابل سمجھ رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی بیٹی پر توجہ دیں گے۔“

مزید بات کا موقع نہیں تھا۔ دوسری لڑکیوں کے والدین سامنے ہی اپنی باری کے منتظر تھے۔ سراج الدین نے محل کا کارڈ وصول کیا، اس کا شکر یہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

وہ جیل کی آنکھوں میں خط کا جواب ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا مگر اتنا سمجھ گیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں پابندی کی یا ناگواری نہیں تھی۔ ان میں شرم تھی، مگر اہٹ تھی اور ان سب میں سراج الدین کے لیے خوش گمانی تھی۔

وہ بیٹی کا رزلٹ کارڈ لے کر بہت آہستہ قدموں سے چلا ہوا باہر نکلا۔ اسکول کے چھاگ تک پہنچا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا نام لے کر آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ شہلا تھی، شریف صاحب کی بہن۔ سراج الدین اس سے شریف صاحب کے گھر پہلے ہی مل چکا تھا۔

وہ پاس آ کر سلام کرتے ہوئے بولی۔ ”سراج صاحب! میں آپ کو بڑی دیر سے ڈھونڈ رہی تھی۔ آپ کو ہال کی تقریب میں دیکھا تھا پھر اپنی اسٹوڈنٹس کورڈز کارڈ دینے میں ابھی مصروف ہوئی کہ آپ سے مل نہ سکی۔“

سراج الدین نے کہا۔ ”محل کا رزلٹ کارڈ لینے گیا تھا۔ میں جیل سے کارڈ لے کر آ رہا ہوں۔“

شہلا نے بیٹی کا کامیابی پر اسے مبارکباد دی، محل کو شاباش دی پھر اپنے پرے سے سو روپے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”مینی محل! تم کیشین سے اپنے لیے چاکلیٹ لے کر آ جاؤ۔ ہم تب تک یہاں کھڑے ہیں۔“

محل نے پیسے لے کر خوش خوش کیشین کی طرف چلی گئی۔

شہلا ممتی خیر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”بیٹی کا رزلٹ کارڈ لے کر تو آگے گئے مگر بتائیے کچھ احوال دل بھی جان سکے ہیں؟“

سراج الدین کن آنکھیں سے اپنی بیٹی کو جانتے ہوئے دیکھتے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ”کچھ لوگ بڑے کمرے سے ہوتے ہیں۔ آسانی سے سمجھ نہیں آتے۔ اسی لیے تو آپ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔“

وہ جیتے ہوئے بولی۔ ”ہماری میڈم جیل اتنی سستی نہیں، بہت خاص ہیں۔ بڑے پابندی والے ہوں گے ابھی۔“

اس نے کہا۔ ”شہلا میری بہن! تمہارا اس اسکول میں ہونا میرے لیے نہایت حوصلہ بخش ہے۔ پلیز! یہ جاننے کی کوشش کرو کہ وہ میرے بارے میں کس طرح سوچتی ہے؟“

وہ بولی۔ ”اسکول کے معاملات سے بہت کراہے۔“

محل ایک بار کچھ دلی تنگ ہوئی ہے۔ میں اس کے قریب ہونے کی کوشش کر رہی ہوں مگر آج سے اسکول دو ہفتوں کے لیے بند ہے۔ پھر یہاں چھ سال شروع ہوگا۔ آپ امید رکھیں اچھا ہوگا۔“

سراج الدین جو کہتے ہوئے بولے۔ ”دو ہفتے کا وقفہ زیادہ نہیں؟ آپ اس دوران کی اور جگہ ملاقات نہیں کر سکتیں؟“

شہلا کچھ سوچے ہوئے بولی۔ ”ویسے تو میں اس کے گھر بھی جا سکتی ہوں لیکن ایک عجیب ہے۔ آپ مٹھائی کا ایک ڈبا لے کر اس کے گھر جا سکتے ہیں۔ محل کی امتیازی نمبروں سے کامیابی کی خوشی میں مٹھائی پیش کرنے کا بہانہ بنا سکتے ہیں۔“

شہلا نے کہا۔ ”مٹھائی کا ڈبا آپ کے اسی اثنا میں محل کیشین سے جھڑپ لے کر واپس آگئی۔ سراج الدین نے شہلا کو خدا حافظ کہا۔ امیدوار باپوسی کے تصادم سے لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے ہوئے گھر آ گیا۔

شریف صاحب کی بہن شہلا نے اسے مزید پیشرفت کا راستہ بتا دیا تھا۔ اب اس پر قدم بڑھانے کی بہت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے اس کے پاس جاتے ہوئے یہ خوف ہوتا تھا کہ لوگ باتیں بنا سکیں گے۔ خط کے ذریعے اظہارِ جتنا کے بعد اب خود اسی سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ محل کا رزلٹ کارڈ لینے ہوئے اگرچہ جیل کے تیر اور گفتگو سے ایسے کسی رزلٹ کا احتمال نہیں رہا تھا لیکن سراج الدین کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ وہ اسے ٹھکرانہ دے، اس کی تنہا کا گلا گھونٹ نہ دے۔

اس نے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا۔ اس کی بھیدوں بھری خاموشی میں بھی ایک رومانس تھا۔ ساتھ ساتھ بے یقین رزلٹوں کی دل شکن سوچیں بھی تھیں۔

اس نے شریف صاحب کے آگے ساری تکلیف بیان کر دی۔ جیل سے ہوئی ملاقات اور اس کی بہن شہلا کی تجویز بھی رکھ دی۔

شریف صاحب بڑی دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ”سراج بھائی! تم باپوسی مت ہو۔ جیل تم سے ناراض نہیں۔ رزلٹ کے دن وہ اس طرح پیش نہ آئی۔ شہلا کی بات درست ہے۔ تم مٹھائی کا ڈبا لے کر اس کے گھر جاؤ۔ بیٹی کی کامیابی میں اس کا کردار رہا ہے۔ اس بہانے سے جاؤ کہ تو وہ بھی نہیں کر سکتی۔ اس کے دل کی بات جاننے کا یہ ایک اچھا موقع ہے۔“

”تم شہلا! میں سے کہہ دو۔ اس سے ذرا مکمل کر سکی جگہ ملاقات کا موقع تلاش کرے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ اسکول میں جانے سے یا مٹھائی کا ڈبا لے کر گھر جانے سے بات نہیں بن رہی ہے۔“

شریف صاحب بولے۔ ”پارا اتنی بھی بے قراری ہوئی نہیں۔ شہلا اس کے قریب ہونے لگی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں تم دونوں کیشین امتحان سے چند کراہیں مگر میری مانو، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ مٹھائی دینے کا ذوق بہت سے کام لو۔ اسے جاننے اور اپنے بارے میں اس کے محسوسات پر کئی کوشش کرو۔“

سراج الدین جس جذباتی کیفیت میں جلا تھا، شریف صاحب کی بات اسے بہت دلچسپی تھی۔ کچھ دیر کے چال سے اس کے دل تک پہنچنے کے عمل سے وہ خود بھی غالاں تھا۔ مگر کی پڑاؤوں پر خاموشی گہری برف پڑ چکی تھی۔ کیشین ایسا نہ ہو، طرف برف کی سفیدی پھیل جائے پھر اس کی زندگی میں بھاری کیشین آسکے گی۔

☆☆☆

اس رات عجیب واقعہ ہوا۔ سراج الدین غنیمت تھا۔ اچانک کسی شور سے جھجک کر بیدار ہو گیا۔ اس کے کمرے کے ساتھ منجیدہ خاتون اور دونوں بیٹیوں کا کمرہ تھا۔ رات کے ایسے پہر ان کے کمرے سے تھوڑے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لفظ واضح نہیں ہو رہے تھے، بس منجیدہ خاتون کی آواز زیادہ بلند اور تیز سنائی دے رہی تھی۔

سراج الدین چند لمحوں تک ناگواری سے سنا رہا تھا۔ جلا کر اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ سامنے ہی راہداری کی دوسری سمت کمرے کے کچلے دروازے سے اندر کا خطر دکھائی دے رہا تھا۔ منجیدہ اپنے بیڈ پر غصے سے بال بکھرائے بیٹھی تھی۔ وہ بلند آواز سے روتے ہوئے چلا رہی تھی۔ ”میں اس کا خون پی جاؤں گی۔ اپنی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی۔“

سراج الدین اپنے کمرے کے دروازے سے ہی غصے سے بکا کر بولا۔ ”تم بیٹی! کیا بات ہے، تمہاری ماں اتنی رات مجھے کس کا خون پینا چاہتی ہے؟“

بیٹی رو رہی ہو کر بولی۔ ”اوپر! آپ پریشان نہ ہوں۔ اسی نے کوئی ڈراما خواب دیکھا ہے۔ ہم انہیں منجیل لیں گے۔“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ کسی معصوم بچی کی طرح ڈرنے کا ڈراما کر رہی ہے۔ اوری ٹیک بخت! کچھ تو شرم کرو۔ جوان بچوں کی ماں ہوں۔ ایسی حرکتیں

نہیں دیکھتا۔“
 سچوہ ہر پائی انداز سے روئے ہوئے بولی۔
 ”میرے خدا میں کدھر جاؤں؟ میرا سینہ پھٹ رہا ہے،
 میرا دماغ گھوم رہا ہے۔ تم مجھے عالم لوگ ہو۔ میری حالت
 پر جس کمانے کے بجائے میرا خدا ان ازار ہے ہو۔ مجھے
 موت آجائے بس۔“
 سراج الدین اس کے حراج سے واقف تھا۔ نرم لہجے
 میں بولا۔ ”دوسروں پر غصہ ہونے سے موت نہیں آتی مکمل
 کی ماں! خود پر آفت آتی ہے۔ اب اس آفت میں باقی
 سب لوگوں کو گھسیٹیں ہو۔ آرام سے سو جاؤ۔“
 سچوہ بجائے خاموش ہونے کے مزید ہائے دانے
 کرنے لگی۔ سراج الدین اتنی رات کے کوئی سخت بات کہہ
 کر اس کا حراج مزید بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ غصہ برداشت
 کرتے ہوئے پلٹ کر کمرے میں آیا اور دروازے دروازہ
 بند کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔
 دماغ نے سوال کیا۔ ”سچوہ نے خواب میں ایسا کیا
 دیکھا تھا جس سے اس کی زندگی برباد ہو رہی تھی اور وہ کس کا
 خون چٹا رہا تھا؟“
 دل نے دھک دھک جواب دیا۔ ”کہیں میرے
 خیالات اور جذبات کی اسے جھک تو نہیں پڑ گئی ہے؟ کہیں
 جیل کا خون پینے کی بات تو نہیں کر رہی تھی؟“
 پھر اس نے خود کو سمجھایا۔ ابھی۔ بات شریف صاحب
 اور اس کی بہن کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں۔ بیکم اپنی باری
 اور کروڑوں کے باعث کسی خود ساختہ وہم کے زیر اثر ایسی
 بات کر رہی ہوگی۔ ویسے اسے شک بھی ہو جائے تو کچھ برا
 نہیں۔ کل اس حقیقت کا سامنا تو کرنا ہے۔ اس سے پہلے ہی
 ایسا داخل بن گیا تو برداشت کرنا آجائے گا۔
 دوسری طرف کمرے میں سچوہ ابھی تک سنبھلی نہیں
 تھی۔ اس کی بیٹیاں باپ کی باکرہ سر اور شائے دبا کر اس کی طبی
 حالت معمول پر لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سچوہ خاتون
 کا سارا بدن پیسے سے شرابور تھا۔ وہ ہلکے ہلکے کانپ رہی
 تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لڑتے ہوؤں سے بار بار
 ایک ہی بات کل رہی تھی۔
 ”وہ میرا گھر اجاڑ دے گی۔ تمہارے ابو مجھے چھوڑ
 دیں گے۔ میں اس چوہل کو نہیں چھوڑوں گی۔“
 بڑی بیٹی اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔ ”ای! ام
 سب اس کا خاتمہ کریں گے مگر پتا تو چلے وہ کون ہے؟“
 دوا کے پیچھے ڈوٹی، لڑتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بیٹی!

مجھے لگتا ہے تمہارے ابو کسی اور عورت کے چکر میں لگا۔ میں
 نے خواب میں دیکھا ایک عورت ان کے کمرے میں تھی۔
 میں کمرے میں گئی تو تمہارے ابو مجھے گالیاں دیتے لگے۔
 اس عورت کو اپنی بیوی کہہ کر پکارنے لگے۔ میں غصے سے اس
 عورت کو مارنے لگی تھی ہوں، اسی وقت آنکھ مکمل جاتی ہے۔“
 دونوں بہنوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک
 دوسرے کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ بیماری اور کمزوری کی وجہ
 سے اسی کے اعصاب منتشر ہو گئے ہیں۔ ابو اچھی صحت اور
 طبع کے ساتھ اسی سے جوان لگتے ہیں ان لیے احساس کمتری
 سے وہ ایسے دوسرے میں جھلا ہو گئی ہیں۔ جمال اور کمال بھی
 بیدار ہو کر اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔ وہ بھی اپنی ماں
 کے حراج اور کمزور اعصاب سے واقف تھے۔
 انہوں نے بڑی کوشش سے اسی کو تسلی دلاسا دے کر
 بیڈ پر لیٹا دیا۔ نیند کی ایک گولی لا کر پانی کے ساتھ گلائی۔ کچھ
 دیر بعد ماں سو گئی۔
 کہتے ہیں مرد اپنی عورت کا لباس ہوتا ہے۔ اس کی
 عزت۔۔۔۔۔۔ کا محافظ ہوتا ہے۔ فطری بات ہے اس لباس
 پر داغ گلت جائے یا پھر پھٹ جائے تو بدن کو ہی سب سے
 پہلے اندازہ ہوتا ہے۔ سچوہ خاتون کو بھی شوہر کے دل کے
 داغوں اور اس کے ٹوٹنے پھوٹنے کا درست درست اندازہ
 ہو گیا تھا۔
 ☆☆☆☆
 اگلے دن سراج الدین نے صبح کی شریف صاحب
 اور اس کی بہن کے مشورے کے مطابق اچھی سی مٹھائی لی۔
 اس کا ڈبا بڑے خوشنما کاغذ کی غلاف سے سجا کر صبح کے دل
 کے ساتھ جس جیلہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے جب بھی
 اس کے گھر گیا تھا، بیٹی کو ٹیوشن والے کمرے میں چھوڑ کر جیلہ
 سے سر راہ دو چار باتیں کر کے لوٹ آتا تھا۔ آج ٹیوشن کا کمرہ
 بند تھا۔ اس نے گھر کے بڑے دروازے کی کھٹی بھائی۔ ذرا
 ہی دیر بعد لٹلی دروازہ مکمل کیا۔ ایک صحت مند سفید ریش
 بزرگ نمودار ہوئے۔ سراج الدین نے قیافے سے سمجھ لیا کہ
 وہ جیلہ کے ابا کی برکت اللہ ہوں گے۔ اس نے بڑے
 تشنگین انداز میں انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب
 دے کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سراج الدین
 نے ٹھکانا کر گھاساف کیا پھر کہا۔
 ”محترم! میری بیٹی میں جیلہ کی اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ
 امتحانوں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئی ہے۔ میں
 سمجھتا ہوں اس کا مالیاتی کے پیچھے جس جیلہ کی کوششیں شامل

ہیں۔ یہ حقیر سی مٹھائی ان کی محنت اور شفقت کا ایک
 مازاج ملے ہے۔“
 بزرگ خوشدلی سے بولے۔ ”شکر! چاہ! آپ
 بڑے اچھے انسان لگتے ہیں۔ درنہ اس دور میں بیکم کی عزت
 اور اس کا احسان ماننے والے لوگ کہاں رہے ہیں۔ بچوں
 کی ناکامی تو بیکم کے سر پر صوب دیتے ہیں، آپ کی طرح
 کامیابی کا سہرا اس کے سر پر نہیں سجاتے ہیں۔“
 سراج الدین کا دل شرمندگی سے کٹ سا گیا۔ اب
 ان بزرگ کو کیا معلوم میں بحیثیت استانی یہ سب نہیں کر رہا
 ہوں۔ یہ تو دل کی کارستانی ہے۔ محض ایک بہانہ ہے۔ اصل
 بات ان کی بیٹی کے دل میں ٹھکانا بیٹا ہے۔
 اس نے زبان سے کہا۔ ”بس اپنی اپنی کھج کی بات
 ہے محترم! ایک بچہ کو عزت دیں گے، اس کی قدردانی کریں
 گے جس کی علم کی قدر پیدا ہوگی۔ استاد کو صرف تنخواہ دار ملازم
 جیسا مقام دیں گے تو وہ استاد بھی بس تنخواہ حلال کرانے کی
 حد تک ڈیوٹی دے گا۔“
 وہ سفید ریش بزرگ اس کے ہاتھ سے مٹھائی لینے
 ہوئے بولے۔ ”میاں! آپ کے خیالات بڑے اچھے ہیں۔
 آپ سے بات کر کے خوشی ہوئی۔ میں جیلہ کا والد ہوں۔
 میری بیٹی اس وقت گھر پر موجود نہیں۔ اپنے بڑے بھائی کی
 طرف گئی ہے۔ آپ کی مٹھائی اس تک پہنچ جائے گی۔“
 سراج الدین اس کی عدم موجودگی کا سن کر باپوس سا
 ہو گیا۔ دل اس جتنا میں اچھل کود کر رہا تھا کراسے ایک نظر نہ
 لے۔ اس کے منہ چرے کی دھوپ چھاؤں میں لئے قرار کی
 بازیافت کر لے۔ اب وہ گھر پر نہیں تھی مگر یہ احساس بھی بڑا
 شاندار تھا کہ اس کے دروازے پر کھڑا ہے، اس کے والد
 سے بات کر رہا ہے، اس کے لیے تحفہ لے کر آیا ہے۔
 اس نے دل میں کہا۔ ”میرے اظہار تمنا سے وہ
 انجان بنی ہوئی ہے۔ کم از کم اس مٹھائی کی صورت اسے
 اپنے جذبات تو پہنچا دیے کہ تم جتنا بھی تجاہل عارفانہ سے کام
 لو، میں یہ انداز عاشقانہ محبت نہیں ہاروں گا۔“
 جیلہ کے والد شیخ برکت اللہ نے بہت اصرار کیا کہ وہ
 گھر میں آئے۔ چائے پی کر جائے۔ سراج الدین نے
 بادل ناخواستہ ان کا شکریہ ادا کیا۔ دل میں ملاقات کی
 حرمت لیے لوٹ آیا۔
 جیلہ رات دیر گئے بھائی کے کمرے واپس آئی۔
 اپنے کمرے کی طرف جاری تھی تو ماں بولی۔
 ”جیلہ! تمہارے لیے مٹھائی آئی ہے۔ شام کے

دلت کی وہی تمنا! وقت کوئی دے کر گیا ہے۔“
 اس کا دل دھک سے دھک گیا۔ خیال کے پتھر سے
 ایک دم بڑھ چڑھتا ہوا ہونے اور تک گئے۔ وہ بھاہرے
 لپاڑی سے بولی۔ ”نہیں تمہاری؟ کیا میرا ہی نام لے کر نہ
 گیا ہے؟“
 ”تمہاری کسی طالبہ کا والد تھا۔ اس کی بیٹی نے شاید
 کلاس میں پڑھائی ہے۔ تمہارے اباس کی بڑی تحریکیں
 کر رہے تھے۔ دیکھو تو لاڈ کی الماری میں رکھی ہوگی۔
 اچھی کی گئی ہوگی۔“
 وہ بولی۔ ”ای! میرا انتظار کیوں کیا؟ مٹھائی سب
 مٹھیاں بانٹ دیتیں۔ میرے لیے مخصوص تو نہیں تھا؟“
 ماں نے کہا۔ ”تمہارے ابا نے منی کیا تھا۔ اب تم
 آئی ہو خود ہی منی کر دو۔“
 جیلہ نے خاموشی سے مٹھائی کا ڈبا اٹھایا۔ بڑے خوش
 طعریے سے اس کی بیٹنگ کی تھی۔ اس کے ایک کونے
 میں خوبصورت روشائی میں لکھا ہوا تھا۔ ”مکمل کی طرف
 سے۔۔۔۔۔۔ اپنی پسندیدہ کھج کے لیے۔“
 وہ ڈبے کا غلاف اٹارنے کی جی جی کی تھی کہ یکدم جی میں کچھ
 نامفہمی سا خیال آیا۔ کیا پتا اب صرف مٹھائی ہی ہو، ویسے
 والے کے چور جذبات کی انگریزی بھی ہو۔ یہ خیال آیا تو
 اسے لے کر اپنے کمرے میں آئی۔ ایک پیکی پیکی احساس
 کے ساتھ اسے کھولا۔ باہر کے دیدہ زیب کاغذی غلاف کے
 اندر ڈبے پر ایک طرف چلنے کے لئے کی تصویر بنی ہوئی
 تھی۔ اس میں سے تیرے نشان کی چوٹی چوٹی کیسر کی
 نکل کر دوسرے کونے میں بنے ایک موبائل کی تصویر میں
 داخل ہو رہی تھیں۔
 لٹافہ اور موبائل کے اس خانے کے علاوہ اس پر کچھ
 لکھا نہیں تھا مگر یہ خاک ایک پورا واقعہ بیان کر رہا تھا۔ جیلہ
 چوہا ہے اس خانے پر نظر میں جا کر بھی رہی پھر بے اختیار
 اس کی نظریں اٹھ کر اس الماری سے چپک گئیں جس کے
 ایک خانے میں بڑے لٹافے میں مقید لفظ باہر نکل کر اپنی
 پوری معنوی تاثیر کے ساتھ اس کے گرد و نواح کی طرح اثر
 رہے تھے۔
 اس نے یکدم سر جھک دیا۔ مٹھائی کے ڈبے کے
 اوپر بنے اس لٹافے اور موبائل کے بین السطور پیغام کو دل
 و دماغ سے باہر نکال دیا۔ ڈبا کھول کر دیکھے بنا ہی باہر نکلے
 گئی۔ ای! کوئی ہے ہونے بولی۔
 ”ای! اسے سب میں تقسیم کریں۔ بچ جائے تو بیٹا

بہت سے دن گزر گئے۔ اس نے جو رسائی دی تھی، وہ بھی دل تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ جیلہ نے کھانا کی طرح اس کے حوالے سے بھی مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اب تو کوئی بہاد بھی نہیں تھا اس کے گھر جانے کا۔ شریف صاحب کی بہن بھی چٹوڑیوں میں دوسرے شہر اپنے سرسراہٹ چلی گئی تھی۔

پھر اس کے بعد شریف صاحب، ان کی بہن شہلا اور جیل کی دہشت گردانہ فیلڈ کے لیے اس دہشت گردانہ فیلڈ کا اہتمام کیا تھا۔ اسل میں یہ دہشت گردانہ فیلڈ ایک برآمدہ کی۔

☆ ☆ ☆
سراج الدین کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ شریف صاحب اتنی بڑی خبر سن کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ اسے مذاق سے دیکھ رہا تھا۔ سراج الدین صاحب دابوں ڈرائنگ روم میں آئے۔ اسی وقت کھانا ہوا۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا مگر جسے سنا کر وہ گیا۔ پلیٹیں جھینکے گا، کبھی یہ خواب تو نہیں ڈرائنگ روم کے دروازے سے شہلا کے پیچھے چلے گا اور جیل داخل ہو رہی ہیں۔ پھر وہ سلام کرتی ہوئی سامنے صوفی پر بیٹھ گئیں۔ جیل کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑی تھی، اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک شریف صاحب کا قہقارہ تھا۔ شریف صاحب نے کمرے سے لوگ آئے ہیں۔

سراج الدین بنوینت ہماری نظروں سے شریف صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے دوئی کا ادا کر دیا تھا۔ عابدہ نے دیر سے سے کہا۔ "شریف صاحب! میں جانتی ہوں جیل کے پچھلے پانچ سال ازادانی لحاظ سے بڑے فسوس کا گزندہ ہیں۔ کسی بھی کھمدار انسان کی طرح ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ آئندہ اس کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ رونما ہو۔ ہم سراج صاحب کو بہت کم جانتے ہیں۔ ان کا بھراؤ ہمیں اندیشوں میں جھٹکا کر دیتا ہے۔"

سراج الدین جانتا تھا یہ سوال اس سے پوچھا جائے گا۔ اس پہلو پر اس نے بہت سوچا تھا۔ اگرچہ مشکلات بے شمار ہیں، مگر اس لیے حساب نہیں۔ بیوی اور جوان اولاد کی

میں ایک آگ کا دریا تھا جسے پار کرنا تھا مگر جیل کی محبت اب جوں آہیں ہو گئی تھی جس سے سرفروشی کی تمنا بھی جرات آمیز نہیں تھی۔

اس نے کھنگھار کر گلا صاف کیا پھر صاف سے کہا۔ "میری بیوی اور بچے ایک اہل حقیقت ہیں۔ میری ازادانی زندگی بے شک مشکل اور بے رنگ رہی ہے مگر اولاد کی صورت میں مجھ پر خاص کرم ہوا ہے۔ میں بڑا دعویٰ نہیں کروں گا لیکن اتنا بھروسہ ہے اپنے بچوں پر کہ وہ ایک حد سے آگے مخالفت نہیں کریں گے۔ میں دوسری صورت کے لیے بھی تیار ہوں۔ یعنی اپنے بچوں اور بیوی کی مخالفت مول لے کر بھی یہ فیصلہ کر سکتا ہوں۔ بے شک یہ فیصلہ کتنا ہی کڑا کیوں نہ ہو۔"

شریف صاحب بولے۔ "میں جانتا ہوں سراج بہائی کے لیے اپنی بیوی اور بچوں کو منانے کا خطر بڑا محسن ہے۔ ویسے بھی اس طرح کے معاملات میں اس طرح تو ہوتا ہے اب ظاہر بات ہے سراج بہائی یہ مرحلہ طے کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے یہ اپنے گھر والوں کو قائل کر لیں گے۔ اگر اس کے برعکس بھی کوئی بات ہو تو جیل کو الگ گھر میں رکھیں گے۔"

عابدہ نے کہا۔ "ایک عورت تو جیل کے آسمان کے نیچے نہیں تو ایک صحت کے نیچے کم از کم اپنے شوہر کو بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ سراج صاحب کی بیگم جیل کو قبول کر لے گی۔ وہیں اور جسے وہی طور پر خاموش کر سکتے ہیں، ہمیشہ کے لیے ممکن نہیں۔ اس صورت میں سراج صاحب کو الگ مکان کا ہی بندوبست کرنا پڑے گا۔"

سراج الدین مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں اس کے لیے بھی راضی ہوں۔ میری مالی حالت ایسی کمزور نہیں مگر مجھے امید ہے اپنے گھر والوں کو سمجھاؤں گا۔ نہ مانتے کی صورت میں الگ مکان کا فیصلہ بھی قابل قبول ہے۔"

جیل کچھ نہیں بول رہی تھی۔ بس سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹا رہی تھی۔ عابدہ اس کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اس نے سراج الدین کو بہت دھم دیکھا تھا۔ اس کی شائستگی اور شخصیت کی تابندگی سے متاثر ہو رہی تھی۔ اس نے خط میں کل کر اپنی عمر بھی بتا دی تھی۔ یہ الگ بات ہے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگ رہا تھا۔ سب کچھ اچھا تھا۔ بس بیوی بچوں والی بات حلق میں چانس کی طرح ایک رک رہی تھی۔

دوسری طرف سراج الدین کا مضبوط اور پُر اعتماد دل دیکھ کر اسے امید دلار ہا تھا۔ بیوی اور بچوں کی مخالفت کے باوجود اس کا ہاتھ تمام کر پھر نہ چھوڑنے کا یقین دلار ہا تھا۔ یہ

احساس بھی جیل کے لیے شاندار تھا کہ وہ مجھے دل سے چاہتا ہے۔ میری حوصلہ افزائی نہ کرنے کے باوجود میری طلب سے باز نہیں آیا ہے۔ آئندہ بھی مجھے سچے راستے میں چلنا نہیں چھوڑے گا۔

یہ ساری باتیں اس کے دل و دماغ میں سرسرا رہیں۔ بہت سی باتیں سوال بن کر یوں تک آتی رہیں مگر حیا کے نعل اتنے ہماری تھے کہ وہ لب بستہ رہی۔

اس دوران دوسرے کمرے میں کھانا لگ گیا۔ وہ سب کھانے کے کمرے میں آئے۔ جیل اور دیگر خواتین ایک طرف کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شریف صاحب اور سراج الدین نے دوسری طرف کی کرسیاں سجائیں۔ اتفاق سے سراج الدین کی کرسی کے بالکل سامنے ہی میری دوسری جانب جیل کی کرسی تھی۔ شریف صاحب کی بیگم بھی کھانے میں شریک تھیں۔ ان کی بچیاں کھانا لائے کرسی پر سجائی گئیں۔

دوب کھاتے بیٹے اور عمو کی گفتگو کرتے رہے۔

سراج الدین کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ جیل کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہے۔ پچھلے چند ہفتوں سے وہ جذباتی لحاظ سے بہت مضطرب اور منتشر تھا۔ اس کی سوچوں اور جذبات کا محور جیل تھی۔ اسے پانے کی خواہش ہر چیز پر غالب تھی۔ آج وہی خود غرضانہ پیش نگاہ تھی۔ ایسے میں لوہے اس کے حلق میں جھنس رہے تھے۔ کھونٹ کھونٹ پانی کے ساتھ وہ انہیں نگل رہا تھا۔ بھی کھانا اچھٹی سی اک نظر جیل کے چہرے پر ڈالتا تھا۔

وہ بھی سر جھکائے آہستہ آہستہ لوہے چار رہی تھی۔ ایک آدھ بار ان کی نظریں ساتھ ہی آگئی تھیں۔ ایک لمحے تک الجھ گئیں پھر بے اختیار جھک گئیں۔

کھانے کے دوران شریف صاحب کی بچیاں بھی موجود تھیں اس لیے اصل موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ کھانے کے بعد بچیاں اور بیگم برتن سمیت کمرے گئیں تو شریف صاحب بولے۔

"میں جانتا ہوں زندگی کے فیصلے کرنے کے لیے ایسی مختصری ملاقات کافی نہیں مگر مجھے امید ہے اس موضوع پر ایک دوسرے سے بات کرنے کا آپ دونوں کو حوصلہ ملا ہوگا۔ جیل صاحب! آپ اچھی طرح غور کر لیں۔ آپ کا ہر فیصلہ قبول ہوگا مگر ایک بات یاد رکھیں۔ سراج بہائی کو جتنا میں جانتا ہوں، یہ ایک شاندار انسان ہیں۔ انہیں محض بیوی بچوں کی وجہ سے ٹھکرانا نا پسند نہیں ہوگی۔"

وہ پہلی دفعہ بولی۔ "آپ بہت ہمدرد انسان ہیں۔"

شہلا باہمی ایک ٹکس ماسی تھیں۔ آپ جیتا میرے بارے میں اچھا سوچ کر یہ سب کمرے لیا۔ میں جو بھی فیصلہ کروں ایک بات کچ ہے، میں خود مختار نہیں۔ میرے والدین لیتا میرے بھائی نہیں لیتا۔ ان کی رائے اور فیصلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔"

شریف صاحب نے کہا۔ "میری بہن! ہم بھی نہیں چاہیں گے کہ آپ اس کیلئے میں فیصلہ کر لیں۔ آپ کے والدین اور آپ کے بھائی بہن بھی جیتا اس فیصلے میں شامل ہوں گے مگر یہ بعد کی بات ہے۔ آپ پہلے خود کو راضی کر لیں۔ دل و دماغ کے دروازے ہمارے اس دوست کے لیے کھول دیں۔ آپ کے کمرے کے دروازے پر دھک دے کر سب کو مٹانے کی کوشش میں بھی کروں گا۔"

☆ ☆ ☆
اس رات سراج الدین بڑی دیر تک جاگ رہا۔ جاگتی آنکھوں سے ایک رنگ دروب سے ہماری زندگی کے خواب دیکھتا رہا۔ جیل کا ہاتھ تمام کر لائے ازادوں میں پھرتا رہا۔ اس ملاقات نے اس کی جذباتی کیفیت کو مزید جوں آمیز کر دیا تھا۔

پانچ دن گزر گئے۔ شریف صاحب کے کمرے میں دعوت کے بعد جیل کی طرف سے خاموشی چھا گئی تھی۔ سوچے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے پانچ دن زیادہ ہوتے ہیں۔ کوئی جواب نہ ملا تو سراج الدین کے دل میں بڑے ہی محوش خیالات پیدا ہونے لگے۔ اتنے دنوں تک تو اسے جواب دے دینا چاہیے تھا۔ کیوں میری بے قراری کا امتحان لے رہی ہے؟ ان پانچ دنوں میں کوئی دن بار اس نے شریف صاحب سے پوچھا تھا کہ شہلا نے کچھ بتایا ہے؟

جیل کی طرف سے کوئی عندیہ ملا ہے؟

پانچویں دن کی شام شریف صاحب نے کہا۔ "میری شہلا سے بات ہوئی ہے۔ ابھی جیل کی طرف سے کوئی پیغام نہیں ملا ہے۔ اس نے اسکول سے ایک پیغ کی رخصت بھی لے لی ہے۔ عابدہ کو بھی جیل کے کسی فیصلے کا علم نہیں۔"

سراج الدین نے مایوسی کے لہجے سے شک آواز میں کہا۔ "یار شریف! یہ جیل اتنی پاس آ کر اتنی دور کیوں ہو جاتی ہے؟ اس کی طویل خاموشی میرا دل دہلا رہی ہے۔ کہیں اس نے میرا پیغام ستر ڈھکیں کر دیا ہے؟"

شریف صاحب بولے۔ "میں خود ہی پریشان ہوں۔ شہلا کے مطابق اس کا ہوش بالکل بند ہے۔ اسکول بھی نہیں جا رہا ہے۔ اب اس کے کمرے سے ہی معلوم کیا جاسکتا ہے۔"

خلاف مگر کی طرف سے تہا کہ قسم کا توں مل بٹا ہر کھائی نہیں دے رہا تھا یا مجھ کو اس ذمہ میں جتا تھا کہ اس کے کھروالے اس کے لیے کھانے کے خلاف روئے دھوئے اور کچھ دن کے لیے خانا ہونے سے زیادہ ہنگامہ آرائی نہیں کریں گے۔

خانا ہونے سے فون پر بات کرنے کے دوران بعد اس کے مجھے ایک شادی تھی۔ اسی دن سب گھر والے شادی پر تھے۔ سراج الدین بھی اُس سے چھٹی نظر کر بھانجے کی شادی میں شریک ہوا تھا۔ رات کے وقت وہ سنجیدہ خاتون کو لے کر گھر واپس آیا۔ اس کے بچے شادی والے گھر میں ٹھہر گئے تھے۔ اگلے دن ولیدہ تھا۔ گھر آکر واپس جانے کے بجائے چاروں بچے پھر بی بی کے گھر رک گئے تھے۔ گھر آکر سراج الدین اپنے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر بی بی دیکھتا رہا۔ وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بی بی کو بلایا۔ پھر ایک کتاب اٹھا کر پڑھنا شروع کی۔ چہرے پر کچھ کرے دلی سے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ اس وقت بی بی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ بچے موجود نہیں تھے۔ اب کس کو آواز دیتا۔ سنجیدہ تو ہوسکتی پر بڑی ہوئی۔ اسے کہنا فضل تھا۔ سوچ کر کمرے سے باہر نکلا۔ مادیاری کے آخر میں چکن کے باہر فرخ موجود تھا۔ اس طرف جاتے ہوئے اس نے بیگم کے کمرے کی جانب دیکھا۔ کھلے دروازے سے اندر سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ بیگم کی طرح بند پر لٹنی ہوئی تھی۔ سراج الدین کے دل میں چھتا سے بچہ ٹوٹ گیا۔ اپنے کمرے کی خیمائی اور بیوی کی فنت کڈائی سے دل میں دھواں سا بھر گیا۔ ایک دم خیال جیل کی طرف گیا۔ اس کی خوب صورتی اور جسمانی رعتائی سے دھتک رنگ سا پھیل گیا۔ کئی مہینے آیا یہ موقع ہے، بچے بھی موجود نہیں۔ آج بیگم سے دل کی بات کہہ دینی چاہیے۔ وہ دوتے دوتے صبح تک سنبھل جائے گی۔ کل تک میری بات کی شدت بھی کم ہو جائے گی۔ وہ پوچھ پوچھ قدموں سے فرخ کے پاس جا کر بی بی کی بول نکال کر واپس آیا۔ بیوی کے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس کے کمرے کی آواز کاٹوں میں بڑی۔ اس نے ناول ناخواستہ جہا تک کر دیکھا۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ بیگم کے تختے سے ایک لگے اپنا سیدہ باری تھی۔

”کیا ہوا، کوئی تکلیف ہے؟“ اس نے ناگوار سے پوچھا۔

”میرا سیدہ بڑا ہے۔ دم ٹھٹھ رہا ہے۔ میں مر رہی ہوں۔“

سراج الدین سمجھ گیا بیگم کی شیب پھر جمل بڑی ہے۔ اب بیگم کی طرح اک ذرا مہلے کی تکلیف بڑھ گئی ہے اور اسے سوچنے کا بہانہ مل گیا ہے۔

یہ المیہ تھا۔ سنجیدہ خاتون کی یہ حالت اسے طویل عرصے سے تھی کہ سراج الدین اب زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اسے یہ بھی چڑا رہے تھے کہ بیگم کے ”شیر آبا“ کے ڈاکٹروں سے علاج معالجے کے بعد بھی اس کی باتے دوائے میں کی نہیں آتی تھی۔

اس نے بیزاری سے کہا۔ ”شادی میں کچھ زیادہ ہی کھایا ہوگا۔ اب دوا دیا جا رہی ہو۔“

سنجیدہ جبکہ کر رو دی۔ ”اف اللہ! میں کدھر جاؤں؟ کسی کے گھر سے اچھا نہیں سنا۔ ان طعنوں سے بہتر ہے کچھ لادیں۔ کھا کر مر جاؤں گی۔ سب کچھ کا سانس لیں گے۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”کیوں مریں چاہتی ہو بیگم! کیا برا کیا ہے تمہارے ساتھ؟ کون سے ڈاکٹر کو نہیں دیکھا یا؟؟ بداحتیائی خود کر رہی ہو۔ ڈاکٹروں نے کچھ چلنے پھرنے کو کہا ہے۔ لیکن روئے دھوئے کاتھیں کہا ہے۔ صبح سے رات گئے تک اسی بستر پر لیٹی رہتی ہو۔ اس پر کوئی بات کریں تو کاتھ کھانے کو دوڑتی ہو۔“

غم اور غصے سے سنجیدہ کا زرد چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ وہ اپنی بیوی بولی۔ ”بس یہ ڈاکٹروں کا قطعہ نہ کیا تھا۔ اسے بھی پتھر کی طرح دے مارا۔ امت لائیں دو امیر سے لیے۔ اسی طرح پاؤں رکھتی دینا سے اٹھ جاؤں گی۔ آپ کی بھی جان چھوٹے گی۔ کسی جوان عورت کے ساتھ عیاشیاں کریں گے۔“

سراج الدین کا دماغ گھوم گیا۔ ویسے بھی جیلے جب سے دل کی مہمان بنی تھی، سنجیدہ خاتون دل بدر ہو گئی تھی۔ بس ایک دفعہ قدیمی تھا۔ اب تو دماغ میں بھی جیلے ہی سی تھی۔ اس کو شریک حیات بنانے کی پس پردہ منصوبہ بندی تھی۔ اس لیے دفعہ کہنے کے شیشے میں بھی بال آ گیا تھا۔

اس نے ترخ کر کہا۔ ”یہ مجھے بار بار دوسری شادی کا الزام مت دو۔ میں نے ایسا کیا بھی تو برائی کیا ہے؟ خود سوچو، کتنے عرصے سے تم مجھ سے دور ہو؟ میرے جذبات بھرتے ہیں۔ ایسے میں کسی دوسری عورت کی بات کروں بھی تو عجب کی کیا بات ہے؟“

سنجیدہ خاتون نے دکھ اور افسوس سے شوہر کی طرف دیکھا۔ غصہ، بے بسی اور نفرت کے آنسوؤں سے لبریز ہمارے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اس گھر کو بنایا، بچوں کو کھانا پڑھایا۔ اپنی بیماری کے باوجود ان کی سچ تربیت کی۔ آپ تو دفتر اور اپنے دوستوں کی دنیا میں کمر رہے۔ میں نے ہی دن رات ایک کر کے انہیں

پالا ہوا۔ اب آپ ہیں کہ اپنے جذبات کا لحاظ دراپید کر دوسری شادی کی بات کرتے ہیں۔ خوشی سے کہیے۔ میں بھی دیکھتی ہوں ایسی کون عورت پر ہی آتی ہے آپ کی بنادلی جوانی۔“

”دو چش پش کر کے روئے گی۔“

سراج الدین ہنسنے لگا۔ ”ادبی کمزور ایسے گھر، یہ بچے میرے بھی ہیں۔ میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق ان پر توجہ دی ہے۔ میں مرد ہوں۔ کیا کر لانا ہوں۔ کبھی تم نے گھر اور ان بچوں کی ضروریات پوری کی ہیں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔ اس میں حرج کیا ہے؟ تمہاری کڑوی سبکی باتوں سے غرار ہونے کے لیے تو میں باہر نکل جاتا ہوں۔ یہاں بیٹھ کر تمہاری باتے دوائے سن کر تمہاری طرح نفسیاتی مریض بن جاتا کیا؟ مجھے طعنہ مت دو کہ میری جوانی بنادلی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو، کوئی عورت مجھ سے شادی نہیں کرے گی؟ ایسی بات ہے تو سن لو، میں جلد ہی دوسری شادی کرنے والا ہوں۔“

سنجیدہ یہ سن کر سانس ہی تو رہ گئی۔ وہ تو اس نے غصے میں شوہر سے دوسری شادی کی بات کہہ دی تھی۔ اسے کمان ہی نہیں تھا سراج الدین یوں بے دھوک ایسا طعنے باز دے گا۔ دو بھتی اور بے بسی سے شوہر کو کھینچ رہی تھی۔

سراج الدین سنجیدگی سے بولا۔ ”میں تم سے یہ بات کہنے ہی والا تھا۔ چلو مت سے بات نکل ہی گئی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں دوسری شادی کا ارادہ کر چکا ہوں۔ بہت جلد اس کا نام بھی بتا دوں گا۔ تم ذہنی اور دلی طور پر تیار ہو جاؤ۔“

اس نے یہ کہا، پلٹ کر دھماکے سے دروازہ بند کیا اور لیے لیے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ سنجیدہ شدید دکھ اور بے چارگی سے بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کی سانسیں جیسے پھانس بن کر اٹک گئیں۔ جسم کا روناں رڈواں جہنم کی آگ اگلنے لگا۔ اندر دھڑام دھڑام دیواریں زمین ہوسے ٹکیں پھر دماغ بڑے زور سے پھرایا اور وہ اپنے بستر پر بے جان ہی ہو کر ڈھسے گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح سراج الدین بیدار ہوا۔ بڑی بھٹی شمس اس کا ہاتھ بنا کر کمرے میں ہی لائی تھی۔ آج وہ شادی میں تھی۔ بیگم سے امید نہیں تھی۔ ویسے بھی رات کے واقعے کے بعد اس کا پارہ چڑھا ہو گا اس لیے سراج الدین تیار ہو کر اُٹھ جانے کے لیے باہر نکلا۔ بچے نہ ہونے کی وجہ سے خاموشی تھی۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کچھ کیا سنجیدہ ہوئی۔ ایک لمحے کو خیال آیا کہ اس کے لیے

عورت کیا ہے؟

یہ بات وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جن کے دماغ ہاتھ لپٹا۔ ذرا سوچو تو تمہارے وجود نے کہاں پرورش پالی کس نے فطرت کا دکھا کر زندگی بخشی۔ وہ عورت ہی تو ہے جو اگر ماں ہے تو پاؤں کے نیچے جت لیے ہوئے ہے، بہن ہے تو تمہارے لیے لے شاد دیا جانے لے ہوئے ہے، بیٹی ہے تو تمہاری آبرو بن کر چمکے والی اور اگر بیوی ہے تو تمہیں مجازی خدا کا رعبہ بنے والی ہے۔

عورت کے وجود اور چاندنی میں کوئی فرق نہیں۔ بکھر کر بھا جانے والی اور کائنات کو روشن کر دینے والی عظیم مہمانی عورت ہی ہے۔

(مرسلہ نمبر انور ذکیم۔ حوالہ لکھا، ادکارا)

نکاح پاب

☆ وہ عورتی خوش نصیب ہے جو صرف اپنے آپ سے محبت کرتا ہے کیونکہ اس کا کوئی رقیب نہیں ہوتا۔

☆ بیوی وہ ہوتی ہے جو شوہر کی ان تمام محبتوں میں اس کا ساتھ دیتی ہے جو بھی پیدا ہو جس اگر وہ اس سے شادی نہ کرتا۔

ہاتھ تو نہیں باری؟ ہر روز کی ایک بھری باغی۔ دوسرے لمحے اس پر جیلے کا فسوں چھا گیا۔ وہ آہستہ سے باہر کی طرف آیا پھر تیز تیز چلا گیت سے باہر نکل گیا۔ بازار آکر کسی ہوئی میں ہاتھ کیا، سیدھا آگس آیا۔ وہاں دفتری قانون اور افسروں کے ساتھ مصروف رہ کر رات کی بات بھول گیا۔

دوپہر سے ذرا پہلے آگس سے اٹھا۔ بھانجے کے لیے کا وقت ہوا تھا۔ ایک بیٹی میں بیٹھ کر ویسے کی دعوت میں آیا۔ بڑا بیٹا کمال نظر آیا تو سنجیدہ خاتون کے ہاتھ میں پوچھا۔

بٹھے بٹھے کہا۔ ”ایسا کون ہے؟“ اسی کو لے گیا تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ رو بھی رہی تھیں۔ میں نے بہت اصرار کیا مگر انہوں نے یہاں آنے سے منع کر دیا۔“

سراج الدین کو اندازہ تھا آج شکر شہیدہ منظر بن ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا وہ بیٹی کو بھی باپ کے اس فیصلے سے آگاہ کر دیتی۔ سراج الدین نے خود کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

اس نے بیٹے سے کہا۔ ”ویسے کے بعد تم اپنی بہن مرن کو لے جا کر ماں کے پاس چھوڑ دو پھر ادھر آ جاؤ۔“

ویسے کی دعوت کے بعد سراج الدین واپس گھر نہیں

www.parthlo.com

کہا۔ یہ صاحب کے حضور پہنچ گیا۔ اس نے رات کو تھکے ہوئے ساری بات ان کے گوش گزار کی۔

شرف صاحب بڑی دیر سوچے کے بعد بولے۔ ”سراج برائی اتم جس راتے پر چل پڑے تھے، یہ مرحلو تو آنے والا تھا۔ اچھا ہے نیلم کو اسے ارادے سے باخبر کر دیا۔ اب بچوں کے تڑپنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔“

سراج الدین ایک گھر کی سانس لے کر بولا۔ ”یار شریف اودھ شرف ایش ہے تاکہ ”اوکلی میں سر دے دیا ہے تو مولوں سے کیا ڈر“ میں بھی پریشان نہیں ہوں۔ دیکھ لے ایدے میرے بچے سر کی نہیں کریں گے۔“

شرف صاحب بولے۔ ”تمہارا بڑا بیٹا بھگوار لڑکا ہے مگر جوان ہے۔ گرم جوازی دکھانے لگا۔ میں بھی اسے سجدے کی کوشش کروں گا۔“

”سب تو وقت آنے پر دیکھیں گے۔ یہ بتائیے جیل کی طرف سے کچھ خبر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

ذات کا معاملہ ہے۔ اتنی جلدی جواب نہیں مل جاتا۔ ویسے بھی اس نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔ اب اپنے گھر والوں سے بات کرنے کے لیے وقت لگے گا۔ اس وقت اگر تمہارے پاس وقت ہے تو میرے ساتھ آ جاؤ۔ میرے گیسٹ ہاؤس چلے ہیں۔ نورست سیزن شروع ہونے والا ہے۔ کچھ ترمیم و آرائش کا کام کروا رہا ہوں۔ وہ دیکھ کر آتے ہیں۔“

شرف صاحب کا سر سے ہٹ کر پہاڑی کے دامن میں ایک بلندی وادی میں گیسٹ ہاؤس تھا۔ یہ ایک پہاڑی نالے کے ساتھ ہی واقع تھا۔ اس جگہ شرف صاحب کی بڑی برائی زمین تھی۔ اس پر انہوں نے یہ گیسٹ ہاؤس تعمیر کرایا تھا۔ انکور، شہوت، خوشبائی اور اخوت کے درختوں سے گھرایا علاقہ ایک دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں دور دور گرم علاقوں سے لوگ اصر آتے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے ساتھ کچھ اور ہوٹل بھی بنے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے چھ ماہات میں بڑی رونق لگ رہی تھی۔

سراج الدین پہلے ہی وہاں گیا تھا۔ اس وقت بھی فوراً تیار ہو گیا۔ ویسے بھی وہ اتنی جلدی گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ رات کی گھبراہٹ سے اندیشے چکادیتے تھے۔ نیلم اور بچوں کے سوچ روکنے کا سامنا کرنے کے لیے حوصلہ بن بھی رہا تھا۔ نوٹ بھی رہا تھا۔ شرف صاحب کے ساتھ شہر سے کوئی پھر وہیں کوئی دور ان کے گیسٹ ہاؤس چلا گیا۔

وہاں گیسٹ ہاؤس کی ترمیم و آرائش کے معاملات دیکھتے ہوئے رات کے کونج گئے۔ وہاں گھر چھپنے تک ایک گھنٹا اور گزر گیا۔

وہ گھر میں آیا تو بیرونی دروازہ لاک نہیں تھا۔ گھر میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ٹی وی لاؤنج بھی بند تھا۔ اب اتنی رات بھی نہیں ہوئی تھی کہ سب بچے سو گئے ہوں۔ وہ راہداری سے ہو کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ نیلم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس بند دروازے کے پیچھے سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ سراج الدین کے دل میں چور تھا۔ اس لیے خیالات شور مچانے لگے۔ بیوی اور بچے نکل کر اس کے خلاف کوئی حاد تو نہیں بنارہے ہیں؟ اس کی آرزوؤں کی عمارت مسمار کرنے کی تدبیر تو نہیں کر رہے ہیں؟

پھر اس کے دل نے سر اٹھا کے جنگ انداز میں کہا۔ ”وہ کچھ بھی کریں۔ مجھے اس ارادے سے روک نہیں سکتے۔ میری ایک حیثیت ہے۔ اس گھر کا مالک ہوں۔ وہ دودھو کر ناراضی ظاہر کر سکتے ہیں، بغاوت نہیں کر سکتے۔“

یہ خیال آتے ہی اس نے جھٹکے سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کھانا شرف صاحب کے ساتھ کھا کر آیا تھا۔ واش روم سے آکر کپڑے تبدیل کر کے ابھی ٹی وی کھولا ہی تھا کہ اس کا بڑا بیٹا کمال اندر آیا۔ سراج الدین کرسی پر بیٹھا تھا، بیٹا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا پھر بڑے ہی جارحانہ انداز میں بولا۔

”ابو! ہم یہ کیا بن رہے ہیں؟ ایسی باتیں تھیں آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں؟“

سراج الدین نے جوان بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں غصہ تھا، غم تھا، جوانی کی گرمی تھی۔ اس نے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں برائی کیا ہے؟ مذہب میں یا معاشرے میں ایسا کرنا ناجائز بات تو نہیں ہے؟“

بیٹے نے غصے سے کہا۔ ”یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ دنیا والے کیا نہیں گئے؟ جوان بچوں کی موجودگی میں عورتوں کے پیچھے چلے ہیں آپ۔“

وہ گرج کر بولا۔ ”منہ سنبھال کر بات کرو کمال، ایسی بازاری باتیں مجھے پسند نہیں۔“

بیٹا بھی چیخ کر بولا۔ ”میری بات آپ کو بازاری لگتی ہے ابو! مگر آپ کی بات سے ہماری کتنی دل آزاری ہوئی ہے، اس کا اندازہ ہے آپ کو؟ میں سچ کہتا ہوں۔ آپ کا یہ فیصلہ میں قبول نہیں۔“

سراج الدین نے غصے سے کہا۔ ”تم میرا باپ بننے کی کوشش مت کرو۔ اس انداز میں بات کرو گے تو بہت سختی سے جیش آؤں گا۔“

کمال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم نے پہلے کبھی آپ کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کی ہے ابو! لیکن آپ ہمیں سرکشی پر مجبور کر رہے ہیں۔ پہلے اس ارادے سے باز آ جائیں۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

سراج الدین نے بے پروائی سے کہا۔ ”مجھے مت سمجھاؤ۔ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ دنیا کچھ بھی کہے، میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

کمال غم اور غصے کی شدت سے یکپائی آواز میں بولا۔ ”سوچ لیں ابو! اس فیصلے کے بعد آپ کو ایک جوان عورت تو ملے گی، ایک بھرے پڑے خاندان کا بیٹا اور سکون نہیں ملے گا۔“

کمال یہ کہہ کر غصے سے پاؤں پٹتا، منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا، کمرے کے دروازے کو زور سے بند کرنا ہوا ہر چلا گیا۔

سراج الدین کے لیے مہینہ سوچنے کے لیے اب کچھ نہیں رہا تھا۔ جیلہ کے عشق کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا اس لیے دماغ میں بھی اس کے حسن اور جوانی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایسے میں بیٹے کی سرکشی سے یہ غلغل دماغ دور نہیں ہو سکتا تھا۔ جیلہ کی سون کاری کے مقابلے میں خاندان کے پیار اور سکون کی کچھ حیثیت ہی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد سراج الدین اور گھر والوں میں ایک سرد جنگ جاری رہی۔ اس کی اولاد جو اس پر جان چڑھتی تھی، کبھی اس کے حکم سے سرٹائی کی ہمت نہیں کرتی تھی، اب سر اپا احتجاج بنی ہوئی تھی۔ انہیں کسی صورت یہ قبول نہیں تھا کہ ماں کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت کو اس گھر کی ملکیت میں شریک بنائیں۔

سراج الدین رات دیر گئے آتا تھا تب تک سب گھر والے سو چکے ہوتے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتا، صبح اٹھ کر بغیر ناشائے کے دفتر چلا جاتا۔ بڑی بیٹی چیکے سے اس کے کپڑے استری کر کے کمرے میں رکھ دیتی تھی۔ کھانے کے وقت وہ گھر سے غائب رہتا تھا۔

اس دوران دوسرا کھانا بھی بڑا گرم تھا۔ جیلہ نے اپنی ماں اور بہنوں کو ساری بات بتادی تھی۔ ماں نے شوہر اور بیٹوں سے بات کی۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جیلہ

دل کی وہی تنہائی کے لیے کسی کنارے باغیر فیملی کے رشتے کا انتظار کرتے اس کی رہی تھی جوانی بھی بیت جائے گی۔

سراج الدین کے بارے میں انہوں نے جاننے والوں سے پوچھا۔ صبح برکت اللہ کو وہ شام بھی یاد آتی جب سراج الدین مٹاکی لے کر ان کے گھر آئے تھے۔ بڑے دروازے پر اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی گفتگو سے بڑے میاں اس وقت بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس نے بھی سراج الدین کے بارے میں اچھا تاثر پیدا ہو گیا۔ اس اثنا میں منیجر عابدہ اور شہلا کی کوششوں سے شرف صاحب کی جیلہ کے والد اور بھائیوں سے ملاقات ہو گئی۔ شرف صاحب علاقے کے مسٹر اور عزت دار انسان تھے۔ انہوں نے بھی سراج الدین کے بارے میں کئی کراوی۔ تب جا کر انہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

سراج الدین کی جذباتی کیفیت دیکھی کو چھوڑی تھی۔ جسے پہلی نظر دیکھ کر دل کی منڈیروں پر محبت کے چراغ جل اٹھے تھے اب اس کی قربت کے تصور سے وہ چراغ ہر سو چھا اٹھ کر رہے تھے۔

بات اب بھی بنی نہیں تھی۔ گھر کے عمار پر اب بھی جنگ جاری تھی۔ محبت کی آغ ہوئی تھی مگر اس نے قربت کے فاصلے ابھی دراز تھے۔ ان فاصلوں کو سینے کے لیے وہ ایسا بے قرار تھا کہ بیوی اور بیٹے دل دو مانے سے فرار ہو گئے تھے۔ ہر طرف جیلہ کی درباری کی پھوار پڑ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس رات سراج الدین نے گھر کے میدا میں فیصلہ کن داؤ آڑ لایا۔ اس نے ساری طاقت جمع کی اور صاف صاف بتا دیا کہ وہ جیلہ سے شادی کر رہا ہے۔

اس وقت بیوی بیٹے سب موجود تھے۔ اس کی بات سن کر سب کو جیسے جناب سو گھ گیا۔ غم اور غصے سے وہ جیسے ساکت رہ گئے پھر تجیدہ خاتون کے رونے کی آواز بلند ہوئی تو سب ہوش میں آ گئے۔ ماں کے ساتھ بیٹیاں بھی رونے لگیں۔

کمال نے سرکشی سے کہا۔ ”آپ ظلم کر رہے ہیں ابو! اس فیصلے سے باز آ جائیں۔ ہم اس چیل کو کسی اس گھر میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔“

سراج الدین دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”نیکلاس بند کرو۔“

گھر تمہارا نہیں۔ میں بڑی شرافت سے بتا رہا ہوں کہ میرے فیصلے کی مخالفت مت کرو ورنہ مجھے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

چھوٹا بیٹا جمال کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ بھی غصہ دکھاتے ہوئے بولا۔ ”جو برائی آپ کر رہے ہیں، اس سے

بڑی برائی اور کیا ہوگی؟ آپ ہمیں گھر سے بھی نکال دیں گے۔ یہی ہم اپنی ماں کی بے قدری اور بے بسی پر خاموشی نہیں رہیں گے۔ میں اس عورت کو جان سے مار ڈالوں گا جو میری ماں کی ہیکل بنے آئے گی۔

سراج الدین کا گھر گھوم گیا۔ پاؤں سے چٹل نکال کر جمال کو دے ماری بھر کر نکلا۔ ”سیری بات کان کھول کر سن لو۔ تم سب کو میرا فیصلہ ماننا ہوگا ورنہ کسی کو بھی اس گھر میں رہنے نہیں دوں گا۔ جو عمر مرئی آئے، وزخ دور ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ تیز چلا گیا۔

وہ دروازہ بند کر کے بیٹھ کر لپٹ گیا۔ دوسری طرف یہی بچے بڑی دیر اسی طرح غم دھنے کی آگ میں جھلتے رہے پھر کمال ماں سے بولا۔

”آپ مت روئیں امی! ابھی ہم مرے نہیں، زندہ ہیں۔ اس عالم فحش نے ہم سب کی حیات ٹھکرا کر اپنے جذبات کو ترجیح دی ہے۔ ہمیں بھی اس کی اور اس کے گھر کی ضرورت نہیں۔ ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ میری خواہ سے ایک کرائے کا مکان لے کر رہیں گے۔“

جمال نے کہا۔ ”تمہاری ٹھیک کہہ رہے ہیں امی! ہم روکی ہوئی کھائیں گے لیکن اس چڑیل کی وجہ سے اس گھر میں آپ کی بے قدری نہیں دیکھ سکیں گے۔“

بڑی بیٹیاں شرمیلی۔ ”اے اللہ! اولاد جو ان ہو تو ماں باپ ان کی شادی کی فکر کرتے ہیں مگر ہمارے ابو سے کیا تمنا کر رہے ہیں۔ میری سہیلیاں کتنا مذاق اڑا رہی ہیں؟“

سب سے چھوٹی کل بھکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

”ای امی! اب لو کہ بہت چاقی کی تھراب دل سے ان پر غصہ آ رہا ہے۔ سچر جیلہ کہت ہیں کہ کتنی ہی لیکن اب وہ نہ لگتی ہیں۔ میں اسے ماں کی شکل میں برداشت نہیں کر سکتی۔“

یہ وہی اولاد تھی جو کل تک سراج الدین کو لوٹ کر چاقی تھی۔ اس کے سامنے سیر سے سر جھکا کر بات کرتی تھی۔ اب سب کے لب و لہجہ میں نفرت اور بغاوت تھی۔ اب خدا جانے یہ کس بات کا پھل خند بننے والی تھی۔

☆☆☆

شریف صاحب اور ان کی بہن شہلا نے بہت خفایت دکھائی۔ سراج الدین گھر کی طرف سے تنہا ہو گیا تھا۔ بات بھیل گئی تو عزیز رہنے داروں نے بھی کشادہ طربی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پیٹے پیچھے خوب اس کے لئے لیتے تھے۔ طنز اور طعنون سے خود اپنی نا آلودہ خواہشات ظاہر کر دیتے تھے۔ سراج الدین کی ایک جوان عورت سے شادی خاندان کے

بہت سے مردوں کے لیے حسد کا باعث بن گئی تھی۔ ایسے میں شریف صاحب اور ان کی بہن نے سراج الدین کی طرف سے سارے معاملات اپنی ذمہ داری میں لے لیے۔ شادی کی تاریخ طے کرنا، حق مہر پر منتقل ہونا، نکاح، رجعتی اور ویسے کے سارے انتظامات کو جتنی شکل دینا۔ سب انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیے۔ جیلہ کے گھر والوں کی طرف سے سراج الدین کے مشترکہ خاندانی نظام پر خدشات ظاہر کیے گئے تو شریف صاحب نے انہیں اطمینان دلایا کہ اگر سراج الدین کے یہی بیٹے جیلہ کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تو اسے الگ مکان میں رکھ گئے۔

اس دوران شریف صاحب نے سراج الدین کے بیٹوں کمال اور جمال کو اپنے جزل استود میں بلایا، پیار اور نرمی سے انہیں حالات سے سمجھاتا کرنے کی تلقین کی۔ جیلہ کی ٹیک سیری اور شرافت کی تقریبات کیں۔ جمال اور کمال خاموشی سے ان کی بات سنتے رہے۔ انہوں نے بظاہر غصہ یا گرم مزاجی نہیں دکھائی مگر ان کے چہرے کے تاثرات دل کی ترجمانی کر رہے تھے اور دل میں ماں کی بے قدری کا احساس شعلوں کی طرح لپک رہا تھا۔

وہ خاموشی سے بیٹھ کر چپکے سے چلے گئے۔ پھر وہ دن بھی آگیا۔ سراج الدین کے ارمان پہاڑی پھولوں کی طرح کل اٹھے۔ پچیس سال بعد وہ پھر سے دلہا بن گیا۔ شریف صاحب نے شہر کے بڑے سیرج ہال میں شادی کی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے بعد شریف صاحب نے ان دونوں کی ازدواجی زندگی کی شروعات کے لیے پہاڑی کے دامن میں نالے کے ساتھ اپنے گیسٹ ہاؤس کا ایک بڑا کمر خصوصی طور پر سجایا تھا۔ تین دنوں کے لیے سراج الدین اور جیلہ کے لیے مخصوص کرایا تھا۔

نکاح والے دن آخر تک سراج الدین کی نگاہ دروازے پر لگی رہی۔ نہ جانے کیوں اسے امید تھی سنجیدہ بیگم نہ سہی، اس کے بیٹے نکاح کی تقریب میں شرکت کریں گے۔ وہ خود دونوں سے گھر نہیں گیا تھا۔ شریف صاحب کے گھر میں بیٹھ کر سارے معاملات طے کیے تھے۔ گھر سے نکلے ہوئے اس نے بڑی نرمی سے بچوں کو نکاح میں شریک ہونے کی تاکید کی تھی لیکن وہ نہیں آئے۔ سراج الدین کو ان کی عدم موجودگی آخر تک چھیتی رہی مگر اس کی شدت زیادہ نہیں تھی۔ جیلہ کو پانے کا احساس ایسا سر آگیا تھا کہ ہر فکر ہر پریشانی سے آزاد ہو گیا تھا۔

شریف صاحب کی قیادت میں سادہ سی برات کی شکل

دل کی وہی تہائی

میں سراج الدین اور جیلہ کو دارلی کے گیسٹ ہاؤس میں لے جایا گیا۔ چند عورتیں بھی ساتھ میں جن میں شہلا اور عابدہ خصوصی طور پر شریک تھیں۔ انہوں نے جیلہ کو سترے سے گھمراہ اسنواریا۔ اسے شب زفاف کے لیے تیار کر دیا۔ خوب صورتی سے سجے ہوئے فلفلہ عروسی کی دھیمی سی موسیقی کی روشنی میں جیلہ کو بٹھایا۔ تارہ پھولوں کی کھینچی ہوئی خوشبو سے معطر کمرے کی تختی میں اسے چھوڑ دیا پھر سراج الدین اس تختی میں بدن کا چور بن کر داخل ہو گیا۔

سب لوگ جو ساتھ آئے تھے اب تین دنوں کے لیے ان کی دنیا سے دور چلے گئے تھے۔ بس وہ وہی تھے۔ مجھیں بھی ان کی تحیں، شائیں بھی ان کی تحیں۔ راتوں کی محشر بردامانی بھی انہی کی تھی۔

☆☆☆

تین دن جیسے پلک جھپکے گزر گئے۔ برسوں سے وہ دونوں دل زار زار کا ماتم کرتے رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح کانٹے رہے تھے۔ لب دریا بھی وہ صحراؤں کی پیاس سے جھلکے رہے تھے۔ اب تو دامن دل پر خود مسترد آ رہا تھا۔ اس کے باوجود غٹائی کی کبھی گھونٹ گھونٹ پیاس اتر رہی تھی۔ اندر کی پیاس بجھنے کے لیے زمانے چاہیے تھے۔

سراج الدین نے بند موبائل آن کیا۔ شریف صاحب کو کچھ کہنا تھا۔ تین دن مزید گیسٹ ہاؤس میں رہنے کی اسے اطلاع دے دی۔ اس کے بعد موبائل بند کر کے ایک طرف ڈال دیا۔

گیسٹ ہاؤس اس وادی میں ڈراپلندی پر تھا۔ ایک جگہ سڑک نیچے آبادی سے مل کھاتی ہوئی اوپر آتی تھی۔ گیسٹ ہاؤس کے ساتھ ہی پہاڑی نالے کے پہلو بہ پہلو گتے پھڑوں کے سائے سائے آگے جاتی تھی۔ نالے کا پانی اوپر بلند پہاڑوں کے دامن سے پھوٹ کر تیزی سے نشیب میں بہتا تھا۔

ان کے لیے غصہ کا شاعرانہ ماحول تھا۔ دامن کہسار بھی تھا۔ ہیزے اور پھڑوں کی بھاری تھی۔ ایسے میں وہ دونوں ہر شام کمرے سے نکل کر گیسٹ ہاؤس کے طویل برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ جاتے۔ چائے پیتے اور دھیمی دھیمی باتیں کرتے۔ ان کی باتوں میں سکتے موسموں کا کرب بھی ہوتا، منزل کے دھوکے میں جھٹکنے نہ جانے کا نفوس بھی ہوتا۔ دونوں کے الگ الگ فسانے تھے۔ وہ دونوں محبت کے ترے ہوئے تھے۔ شریک حیات پاکر بھی تنہائی کے

لے ہوئے تھے۔

شادی کے ابتدائی دن بڑے دھم دھم اور سنگین ہوتے ہیں۔ ان باغی چھوڑوں میں سراج الدین اور جیلہ کی ایسی صورت حال سے دوچار تھے۔ بہت آبلہ پانی کے بعد پھولوں کی بیج اگیب ہوئی تھی۔ زندگی نے اتنا جھٹک دیا تھا کہ اب ایک دوسرے کی قربت میں ساری ٹکناں ملا رہے تھے۔ جذبات کی نرم گرم اگیب سے ایک دوسرے کو سہلا رہے تھے۔

سراج الدین کو زندگی کی مٹھان کا اب علم ہوا تھا۔ ایک بے ڈانڈہ شریک حیات نے اس کے پچیس سالوں کو پچیکا پچیکا بنا دیا تھا۔ جیلہ نے اس پچیسکی زندگی میں شہد آئیز ڈانڈہ بھر دیا تھا۔

جیلہ کو لگ رہا تھا جیسے دور کی تاریک کھپاؤں سے وہ نکل آئی ہے۔ ایک آواز اور خوش کن فضا میں وہ سانس لے رہی ہے۔ پہلی شادی کے بعد ان سات سالوں میں جتنے کانٹے بدن میں ترازد ہوئے تھے، ان چھوڑوں میں سراج الدین نے بڑی نرمی سے، بڑی گرمی سے ایک ایک کانٹا چن لیا تھا جس سے اس کی روح تک طمانیت سے سرشار ہو گئی تھی۔

گیسٹ ہاؤس کے چھ دن انہوں نے بلا شرکت غیرے ایک دوسرے کی نکت میں گزارے مگر ان کی اصل زندگی کے حقائق کچھ اور بھی تھے۔ انہیں پرانے رشتوں کا بھرم بھی رکھنا تھا۔ لوٹ کر اس زندگی اور ان رشتوں کے بیچ جا بجا میاں لے لے ساتویں دن وہ واپس پرانی زندگی میں آگئے۔

☆☆☆

سراج الدین نے شادی سے پہلے ہی اپنے کمرے کا فرنیچر تبدیل کر دیا تھا۔ نئے پردے لگا کر اور رنگ و روغن کر داکر یہ کمرہ کسی حد تک نئی دہکن کے شاپیان شان بنا دیا تھا۔ اس کا دروازہ لاک کر کے چابی اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا اس کے بیوی اور بچے کچھ عرصہ ناراضی ظاہر کر کے ایک دن مان جائیں گے۔ جیلہ کو اس کی بیوی کے رشتے سے قبول کر لیں گے۔ اسے ان چھ دنوں میں جیلہ کے مزاج سے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کل اور محبت سے ان کا دل جیت لے گی۔

شام سے ذرا پہلے وہ شہر پہنچ گئے۔ سراج الدین گاڑی سے اتر کر پُر اعتماد قدموں سے چلتا ہوا گھر کے دروازے پر آیا۔ بڑے دروازے پر فٹل لگا دیکھ کر وہ چونک گیا۔ کچھ تکلیف دہ سوجھن دل و دماغ پر پوش کرنے



تبت سینو

میری جلد نرم و ملائم
ریشم کی طرح



تبت سینو ایشیا کی مشہور ترین بیوٹے کریم

جرائی اور پریشانی تھی، بہت سے سوال بھی تھے۔ وہ شکر لہجے میں بولی۔ ”سینے! آپ کے پیڑی پتے کہاں ہیں؟ وہ کدھر چلے گئے؟ آپ نے تو ان کے بارے میں مجھے کچھ اور بتایا تھا؟“

سراج الدین نے خالی خالی نظروں سے جوان اور حسین ہوی کی طرف دیکھا پھر کھوکھلے سے انداز میں ہنسنے لگا۔ ”کھا... چلے گئے... سب چلے گئے۔ یہ مگر میرا ہے نا۔ میں نے کہہ دیا تھا میرا فیصلہ تسلیم نہیں کرو گے تو کدھر سے نکال دوں گا۔ میرے نکالنے سے پہلے خود چلے گئے۔ چلا چھا ہوا۔ اب ہمیں کوئی پریشان نہیں کرنے گا۔ ہم کسی کی بد اخلاقت کے بغیر ہی ایک حسین اور زمین زندگی گزاریں گے۔“

سراج الدین نے یہ کہہ کر پلٹ گیا۔ تیز تیز چلا ہوا ہے مگر بے کار دروازہ کھول کر اندر آیا پھر با تھروم میں داخل ہو کر ایک طرف کی دیوار کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دماغ میں کمال کی بات کو سمجھنے لگی۔ چند دن پہلے اس نے فحش سے کہہ دیا تھا کہ ایک جوان عورت تول جائے گی، ایک بھرے پڑے خاندان کی محبت نہیں ملے گی۔

اب اتنے بڑے مگر کسوتا سونا دیکھ کر اس کے اندر شدید اچھل پھل ہو رہی تھی۔ پرانے رشتوں کی دیواریں دھڑام دھڑام زمین یوں ہو رہی تھیں۔ ان کے نیچے آکر وہ کھلا جا رہا تھا۔

وہ اسی طرح با تھروم کی دیوار کے ساتھ لگاؤں کا غبار نکالتا رہا پھر لپٹا لپٹا چوکی اٹھا۔ جیلہ با تھروم کا دروازہ کھول کر اسے آواز دیں دے رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دواں بین میں منہ دھویا پھر با تھروم سے باہر آیا۔

”آپ نے اتنی دیر لگا دی اندر۔ میں تو ڈر رہی تھی۔“

جیلہ اس کے سینے پر اپنی پریشانی رگڑتے ہوئے بولی۔ سراج الدین نے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر زور سے جھپٹا۔ اپنے اندر کا کرب چھپانے کے لیے اس کے گہرے سیاہ بالوں میں منہ دے کر آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت سینے کے اندر، بہت ہی اندر جیسے کوئی چلا چلا کر کہنے لگا۔

”ایک جوان عورت کو پہلو میں لے کر سمجھتے ہو کہ تنہائی دور ہوگی۔ نہیں نہیں..... تمہارا دل تو اب پہلے سے زیادہ تنہا ہو گیا ہے۔ پہلے نا آسودہ جذبات کی آج سلاگنی تھی، اب انہوں کو کھودینے کی آگ میں ہمیشہ جلتے رہو گے۔“

دل کی وہی تنہائی اب بھی تجھے ڈستی رہے گی۔

تکلیں۔ اس نے سر جھک دیا۔ موبائل نکال کر بڑے بڑے کمال کو فون کیا۔ جیسے کاسو بائل بند تھا۔ اس نے جھلا کر چوٹے جیسے جمال کا ٹمبر لایا۔ دوسری طرف سے پھر وہی کپیر ٹراؤڈ جواب تھا۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔“ بڑی بیٹا ٹر کے پاس بھی موبائل تھا۔ ایک موبوم کی امید کے ساتھ اس کے نمبر پر کال کی۔ اس بار بھی دوسری طرف کا ممبر موبائل اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ ٹنگ سا گیا۔

خسے کی ایک شہید ہر رگوں میں دوڑنے لگی۔ گلی میں گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے شہادت سے کھلنے لگے تھے۔ ایک آدھ چہرہ تھیک اور ترم کا اشتہار بن کر نمودار ہوا تھا پھر ایک دم غائب ہو گیا تھا۔ بے توقیری کے شدید احساس سے سراج الدین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کسی بڑے پتھر کی ٹھانڈی میں راجہ آدھ دیکھا۔ ایک بڑا پتھر نظر آیا۔ اسے اٹھا کر گلی پر مارنے والا تھا کہ اسی وقت ہمسائے کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے قریبی عزیز بھی تھے۔

اس مگر کی عورت باہر آ کر بولی۔ ”سراج بھائی! اتالا مت توڑیں۔ اس کی چابی میرے پاس موجود ہے۔ آپ کے پیڑی بچوں نے نا توڑ دیا ہے، لہذا بہت ہے۔“

اس کے دل پر جیسے کسی نے زور سے گونسا مارا۔ اس نے کن آنکھوں سے جیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ شکر اور دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ سراج الدین نے خاموشی سے خاتون سے چابی لی، دروازہ کھول کر جیلہ کو لے کر اندر آیا۔ اسے اندر چھوڑ کر وہاں باہر نکلا۔ وہ خاتون ابھی تک گلی میں موجود تھی۔ قریب جا کر آہستہ سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جانی کب دی گئی؟“

وہ خاتون بولی۔ ”آپ کی شادی کے دوسرے ہی دن وہ یہ مگر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ سنا ہے کمال نے کسی دوسرے علاقے میں کرائے پر مکان لیا ہے۔ مجھے چابی دے کر سنجیدہ بہن نے روئے ہوئے کہا تھا۔ اب آئندہ اس مگر میں قدم نہیں رکھیں گے۔ آپ کا بڑا بیٹا کمال سخت خسے میں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ابو کو بتائیں، ہمیں ان کا گھر نہیں چاہیے۔ ہمیں اپنی اس کی محبت اور عزت عزیز ہے۔“

سراج الدین کا دل جیسے جچی کے دوپالوں کے بیچ دب گیا تھا۔ وہ شدید دکھ کے ساتھ منوں وزنی قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ جیلہ پر آمدے میں مگر سخت متوجس نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں